لسانیات اور زبان کی تشکیل

ڈاکٹر محمد اشرف کمال

لسانیات اور زبان کی تشکیل

ڈاکٹر محمد اشرف کمال

لسانیات اور زبان کی تشکیل

ڈاکٹر محمد اشرف کمال

پروفیسر ڈاکٹر فخر الحق نوری

کے

نام

ترتیب

حروفِ ابجد

ہر زبان اپنی اے بی سی یا الف بے پے سے شروع ہوتی ہے۔رسمی طور پر زبان انھیں حروفِ ابجد کے ذریعے سیکھی جاتی ہے۔ یہ حروف ابجد کیسے وجود میں آئے اس حوالے سے مختلف اور متضاد آرا موجود ہیں۔ ماہرینِ لسانیات اس بارے میں مختلف خیالات اور نظریات پیش کرتے رہے ہیں مگر ظاہر کہ یہ سب باتیں مفروضات پر قائم ہیں۔

ابنِ وصی کے بقول:

''ابجد موجودہ دور میں رائج زبانوں کی بنیاد ہے، یہ ابجد کس طرح بن گئے اس کے جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ قدرت نے انسان کو دنیا میں پیدا کرتے وقت ابجد کا سرمایہ بھی ساتھ ہی عطا فرمادیا چنانچہ ہر ننّھے بچے کی زبان خواہ وہ کسی ملک کا بھی ہو آں، لوں، با، تا، دا، شاں، شوں، غاں، غوں، فاں، ماں، ناں، وا وغیرہ کی آوازیں خود بخود نکلتی ہیں اور انسان نے انھیں آوازوں سے ابجد کی بنیاد ڈالی۔''(۱)

انھیں حروفِ ابجد سے آگے چل کر انسان نے حلق سے نکلنے والی مختلف آوازوں کا سائنسی انداز میں مختلف نام دیے۔ یہ الفاظ کا ذخیرہ جمع ہوتا گیا اور زبان وجود میں آتی گئی۔اگر چہ حروفِ تہجّی کی تعداد مختلف زبانوں میں مختلف ہے مگر ان سب کا ماخذ ایک ہی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سب

حروفِ تہجّی ایک ہی ماخذ سے نکلے ہیں۔ ان حروفِ تہجّی میں اختلاف اس لیے پیدا ہوا کہ بعض قوموں نے آواز کے باریک سے باریک پہلو مدنظر رکھے اور زیادہ حروف بنالیے۔ آثارِ قدیمہ اور لسانیات کے ماہرین کے مطابق وہ پہلی زبان جس نے اولین ابجدی حروف وضع کیے پروٹو سیمیٹک (Proto-Semitic) ہے۔ اسے ماہرین لسانیات اور آثار قدیمہ کے ماہر پروٹو سینائی اور پروٹو کنعانی کا نام بھی دیتے ہیں۔ یہ حقیقتاً ابجد زبانوں کی ماں ہے یعنی آج ہم جو بھی حروف پڑھتے ہیں چاہے وہ اب پ ت ٹ ث ہوں یا ABCD یا ایلفا بیٹا گیما وغیرہ یہ تمام حروف اسی زبان سے اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ زبان سامی النسل اقوام کی اولین زبان تھی۔ یہ زبان آج سے چھ سے آٹھ ہزار سال قبل مغربی ایشیا میں رائج تھی اور اس سے دیگر جو زبانیں وجود میں آئیں ان میں منچی، پیکانی، عکادی، کنعانی، فونیقی، آرامی، عبرانی، سریانی، عربی، یونانی، لاطینی، اہرامک، گیز (ایتھوپیائی)، سبائی، ثمودی، بربر، آرمینی، پہلوی، برہمی سائرلک اور انگریزی وغیرہ شامل ہیں۔(۲)

یہاں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ یہ زبان پہلی زبان تھی بلکہ اس سے پہلے بھی زبانیں رائج تھیں مگر اُن زبانوں میں حروفِ ابجد اس طرح ترتیب نہیں دیے گئے تھے۔ بلکہ زیادہ تر تصویری زبان اور اشاراتی وعلامتی اشیاء سے زبان کا کام لیا جاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ تصاویر اور علامات حروف میں بدلتی گئیں۔

ض	ص	ش	س	ز	ر	ذ	د	خ	ح	ج	ث	ت	ب	ا
Dhaad	Szaad	Sheen	Seen	Zaa	Raa	Thal	Dal	Khaa	Haa	Jeem	Thet	Teth	Bet	Alef
DH	SZ	SH	S	Z	R	TH	D	KH	Hh	J	Th	t	B	A

ء	ي	و	ه	ن	م	ل	ك	ق	ف	غ	ع	ظ	ط
Hamzo	Yod	Wau	He	Noon	Meem	Lam	Kaf	Qu'	Fa'	Ghan	'Ayn	Thud	Tud
	Y/EE	W	HH	N	M	L	K	Q/G/CH	F	Gh	'Ah	Dth	Tt

Nabatean	Name	Arabic Alphabet	Syriac Alphabet	Nabatean	Name	Arabic Alphabet	Syriac Alphabet
	Alaph	ا	ܐ		Lamadh	ل	ܠ
	Beth	ب	ܒ		Meem	م	ܡ
	Gamal	ج	ܓ		Noon	ن	ܢ
	Dalath	د	ܕ		Simkath	س	ܣ
	Heh	ہ	ܗ		'E	ع	ܥ
	Waw	و	ܘ		Peh	ف	ܦ
	Zain	ز	ܙ		Sad'e	ص	ܨ
	Heth	ح	ܚ		Qoph	ق	ܩ
	Teth	ط	ܛ		Resh	ر	ܪ
	Yodh	ی	ܝ		Sheen	ش	ܫ
	Kaph	ک	ܟ		Taw	ت	ܬ

حروفِ ابجد کے بارے میں شان الحق حقی لکھتے ہیں:

''کسی زبان یا رسم الخط کے مفرد حروف، حروف تہجّی، اصلاً فینیقی رسم الخط ہجائی کے پہلے چار حروف اب ج د''(۳)

حروفِ تہجّی کی وہ ترتیب جس میں حساب جمل کے لیے حروف کے اعداد مقرر ہیں۔

جدائی اک الف کی دال ہے وحدت پہ شاہد

ملا معشوق سے اپنے مثال حرف ابجد ہے (واجد علی شاہ)(۴)

مٹانا لوح دل سے نقش ناموس اب وجد کا

دبستان محبّت میں سبق تھا مجھ کو ابجد کا (۵)

تاریخ میں ابجد کی دو اقسام ملتی ہیں: ابجد آدم، ابجد نوحی۔ ابجد آدم غیر مستعمل اور غیر مقبول ہے۔ ابجد نوحی ۲۲ حروف پر مشتمل چھ الفاظ ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص اور قرشت سریانی زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بعد میں عبرانی اور عربی زبان میں استعمال ہونے لگے۔ اہلِ عرب ان سے واقف

تھے انھوں نے ان میں دو الفاظ یعنی ثخذ اور ضظغ کا اضافہ کر کے انھیں آٹھ کر دیا، چونکہ ان کلمات کا پہلا لفظ ابجد ہے اس لیے عربی کے حروفِ تہجّی کو دوسرے لفظوں میں ابجد سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور چونکہ بعض علوم وفنون میں ان سے حساب واعداد کا بھی کام لیا جاتا ہے اس لیے حروفِ جمل بھی کہلاتے ہیں۔[۶] حروفِ ابجد اور ان کی متعیّن قیمتیں:

ابجد (شروع کیا)	ا ب ج د	۱، ۲، ۳، ۴
ہوز (ملحق ہوگیا)	ہ و ز	۵، ۶، ۷
حطی (جلد سیکھا)	ح ط ی	۸، ۹، ۱۰
کلمن (یاد ہوگیا)	ک ل م ن	۲۰، ۳۰، ۴۰، ۵۰
سعفص (اس سے سیکھا)	س ع ف ص	۶۰، ۷۰، ۸۰، ۹۰
قرشت (ترتیب دیا)	ق ر ش ت	۱۰۰، ۲۰۰، ۳۰۰، ۴۰۰
ثخذ (محفوظ رکھا)	ث خ ذ	۵۰۰، ۶۰۰، ۷۰۰
ضظغ (تمام کیا)	ض ظ غ	۸۰۰، ۹۰۰، ۱۰۰۰

مخزن الفوائد میں ان کے معانی درج ذیل دیے گئے ہیں:

ابجد	آغاز کرد
ہوز	در پیوست
حطی	واقف
کلمن	سخن گوشد
سعفص	زود بیاموخت
قرشت	ترتیب کرد
ثخذ	در دل گرفت
ضظغ	تمام کرد[۷]

فرہنگِ آصفیہ میں ان کے معانی درج ذیل بتائے گئے:

ابجد: میرا باپ جو آدم تھا گنہگار پایا گیا، یعنی اس سے گناہ صادر ہوا

ہوز: اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کی

حطی: اس کے گناہ اس کی توبہ واستغفار سے دھو دیے گئے۔

کلمن: کلام کیا اور رحمت طلب کی، خدا نے توبہ قبول کی اور احسان کیا

سعفص: دنیا اس کے اوپر تنگ ہو گئی بس بہا دی گئی

قرشت: اپنے گناہوں کا اقرار کیا جس سے کرامت کا شرف حاصل ہوا

ثخذ: خدا تعالیٰ نے اسے قوت دی

ضظغ: شیطان کا جھگڑا کلمہ حق و توحید کی برکت سے مٹ گیا(۸)

اہلِ فارس نے جب عربی حروف کو اپنی زبان کے لیے اختیار کیا تو اپنی خاص آوازوں کے لیے عربی کے حرفوں پر نقطے لگا کر نئے حروف بنا لئے۔ مثلاً 'ب' پر دو نقطے بڑھا کر پ، 'ج' پر دو نقطے بڑھا کر 'چ' اور 'ز' پر تین نقطے بڑھا کر 'ژ' بنائے گئے۔ فن تاریخ گوئی میں اسی لیے ب پ، ج چ، د ڈ، ر ڑ، ز ژ، ک گ کے اعداد ایک ہی ہیں۔(۹) ابجد کے حوالے سے نیاز فتح پوری لکھتے ہیں

''حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے حروف ہجا، عبرانی اور آرامی زبان سے حاصل کیے اور چونکہ وہاں یہی ترتیب تھی جو ابجد، ہوز۔ وغیرہ میں پائی جاتی ہے اس لیے عربوں نے بھی اسے بجنسہٖ لے لیا۔ بعد کو البتہ اس ترتیب میں بلحاظ اسلوب تحریر مخارج میں کچھ فرق آ گیا۔''(۱۰)

عربی رسم الخط عبرانی رسم الخط سے بنا عبرانی حروف کی ترتیب یہ تھی: ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، اور ث خ، ذ، ض، ظ، غ کا اضافہ بعد میں ہوا۔

قرآن خوانی کے لیے عبدالملک بن مروان نے حجاج بن یوسف، گورنر عراق کو ۶۵ ہجری میں حکم دیا کہ خط کی اصلاح کی جائے۔ نصر بن عاصم نے حجاج بن یوسف کی منشا کے مطابق نقطے وضع کیے۔ پہلے عربی میں حروف کی تعداد ۲۲ تھی ث خ ذ ض ظ غ سے چھ حروف کا اضافہ ہوا۔

حروفِ تہجّی کی موجودہ ترتیب (اب ۔۔۔ ی) بچوں کی سہولت کے لیے ابنِ مقلہ نے ۳۲۸ ہجری میں قائم کی۔ جب ایران فتح ہوا تو تین حروف نقطوں کے اضافوں سے وجود میں آئے۔ پ چ، گ جو کہ ب ج ک پر نقطوں کے اضافے سے بنے۔

ہندوستان میں ہندی زبان تھی۔ کچھ لفظ مثلاً ٹ، ڈ اور مرکب حروف بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، کھ، گھ، وغیرہ بنے۔ ٹ، ڈ انگریزی۔ ابتدا میں یعنی ۱۸۵۷ء سے پہلے ٹ، ڈ کو (تؕ، دؕ)

اُوپر چار نقطوں سے لکھا جاتا تھا۔ باغ و بہار کی لکھائی میں اس طرح کے حروف استعمال ہوئے ہیں[11]۔

جیسے عربی میں الف ب ج وغیرہ آغاز کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی طرح ہمارے ہاں اردو شاعری اور نثر میں عموماً الف بے تے استعمال کیا جاتا ہے۔ اکبرالٰہ آبادی کا شعر ہے:

الف بے تے ہی کو پڑھ کر میں سمجھا

الف اللہ کا اور ما سوا بُت

اُردو کے حسب ذیل حروف عربی میں نہیں ہیں۔ ان کے لیے عربی کے قریب ترین حرف کی قیمت مقرر کر لی گئی ہے:۔

پ:۴۰۰ چ:۳ ڈ:۴ ڑ:۲۰۰ گ:۲۰

دوچشمی ھ کے لیے بھی چھوٹی ہ کے اعداد (۵) مقرر ہیں۔ ہمزہ چونکہ عربی میں کسی حرف کا نام نہیں ہے اس لیے قاعدۂ ابجد میں اس کا کوئی عدد مقرر نہیں۔ اردو میں البتہ ہمزہ کے لیے بعض لوگوں نے کچھ قیمت (مثلاً ایک یا دس) مقرر کی ہے، لیکن کچھ لوگ اس رائے کے ہیں کہ اردو میں بھی ہمزہ کا کوئی عدد نہیں۔ جس ترتیب سے حروف کو نظام ابجد میں مجتمع کیا گیا ہے، یہ عبرانی حروفِ تہجّی کی ترتیب ہے لہٰذا ان کی قیمتیں بھی عبرانی سے آئی ہوں گی۔ الفاظ ابجد کا تلفّظ بھی ہر جگہ ایک نہیں ہے۔ خود اردو میں یہ الفاظ بعض لوگوں کی زبان پر کچھ فرق کے ساتھ سنائی دیتے ہیں مثلاً بعض لوگ کلمن میں دوم فتح بولتے ہیں۔ قرشت میں بھی بعض لوگ دوم مفتوح بولتے ہیں اور ثخذ، ضظغ کئی علاقوں میں بلا تشدید بھی بولے جاتے ہیں[12]۔

حروفِ ابجد کسی بھی زبان میں بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیونکہ کوئی بھی زبان سیکھنے والا انھیں حروف سے زبان کا آغاز کرتا ہے۔ پہلے حرفی اشارات اور علامات کو سیکھتا پھر ان سے الفاظ بنانا اور پھر لفظوں سے جملے بنانے کے عمل کو سیکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ابن وصی، الف سے @ تک، مشمولہ روحانی ڈائجسٹ دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۵

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۳۔ اُردو لغت تاریخی اصول پر جلد اول، کراچی، ترقی اردو بورڈ ص ۱۶

۴۔ واجد علی شاہ، کلیات اختر، ص ۶۵۴ بحوالہ اردو لغت تاریخی اصول پر جلد اول، کراچی، ترقی اردو بورڈ کراچی، ص ۱۷

۵۔ کلیاتِ نعت محسن، ص ۲۸

۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۸

۷۔ مہدی حسین ناصری، مخزن الفوائد، الہ آباد، مشن پریس، ۱۹۲۲ء، ص ۳

۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی، لغات روزمرہ، کراچی، آج، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۹، ۱۷۰

۹۔ شرف الدین اصلاحی، اردو سندھی کے لسانی روابط، لاہور، نیشنل بک فاؤنڈیشن، بار دوم، ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۳، ۱۱۴

۱۰۔ نیاز فتح پوری، نگار (لکھنؤ) معلومات نمبر، جنوری فروری ۱۹۵۸ء، ص ۱۰۴

۱۱۔ منصف خان سحاب، نگارستان، لاہور، مکتبہ جمال، ۲۰۱۰ء، ص ۳۱۱، ۳۱۲

۱۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، لغات روزمرہ، کراچی، آج، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۹، ۱۷۰، ص ۱۶۸، ۱۶۹

الفاظ — لفظیات

جب انسان نے کالونیوں کی شکل میں اکٹھے رہنے کی ابتدا کی تو انسان شروع میں مختلف اشیاء کے ذریعے اظہار خیال کرتا تھا یا اشاروں کی مدد سے اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا کام کرتا تھا۔ آنکھوں کے اشارے یا منہ سے مختلف قسم کی آوازیں نکال کر بھی اپنی بات دوسروں کو بتانے کی کوشش کرتا تھا۔ جیسے چلانا، چیخنا، قہقہے لگانا، درد کی حالت میں کراہنا وغیرہ۔ یا ساز، سیٹی، بانسری، ڈھول، بین، کسی چیز کی کھڑکھڑاہٹ وغیرہ کی آوازوں سے بھی اظہارِ خیال کرتا تھا۔ بعض جذبات اور خیالات واحساسات کا اظہار مختلف چیزوں کی مدد سے کیا جاتا تھا۔ مثلاً گھاس پھونس کے تنکے کی مدد سے لاغری اور ضعیفی کو ظاہر کیا جاتا تھا۔ اسی طرح پھول اور خوبصورت رنگوں کے ذریعے دل کے اچھے جذبات دوسروں تک پہنچائے جاتے ہوں گے جو کہ آج بھی رائج ہے۔

"علم الانسان کی کتابوں اور سفرناموں سے پتہ چلتا ہے کہ نیم مہذب اقوام میں اشیاء کے ذریعہ خیالات کا اظہار بہت عام تھا۔" (۱)

اسی طرح رنگوں سے بھی کئی قسم کے جذبات اور معلومات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ آج کل بھی سیاہ رنگ سوگ، موت اور غم کی علامت ہے، سفید امن کی اور سبز سکون کی اور سرخ خطرے کی علامت کے طور پر لیے جاتے ہیں۔ مگر بعض اوقات یہ رنگ ایک قوم میں کسی اور چیز کی علامت ہوتے ہیں اور

دوسری قوم میں متضاد چیز کی علامت۔ مگر یہ سب تصویریں، اشیاء، اور رنگ ہر کسی کو فوری طور پر کسی کے جذبات کی ترسیل میں اس طرح کامیاب نہیں رہتے جیسا کہ انسان چاہتا ہے۔ خیالات واحساست کی بہتر ترسیل کے لیے حروف اور الفاظ ایجاد کیے گئے۔ الفاظ ایک دلچسپ عمل سے گزرنے کے بعد اپنی موجودہ شکل کو پہنچے ہیں۔ بقول شکیل الرحمٰن:

''الفاظ کے ہر ٹکڑے میں انسانی ذہن کے ہنگاموں کی کوئی نہ کوئی تصویر مل جاتی ہے۔''(۲)

الفاظ انسان کے خارجی اور داخلی جذبات کی عکاسی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ انسان جس قسم کے لفظ بولتا ہے وہ اس کی ذہنیت اور مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ الفاظ زبان کو اور انسانی آوازوں کو تحریری شکل میں دستاویز کی حیثیت سے محفوظ رکھتے ہیں اور محض اشارے ہیں۔

سمیریوں کے الفاظ تصویریں ہوا کرتی تھیں۔ وہ تصویروں کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان تصویروں میں ہاتھ، گھر، مچھلی، سانپ، جنگلہ، کھڑکی، انسان کی مختلف انداز کی تصویریں، بیل کے سر کی تصویر، مثلث، مستطیل وغیرہ جیسی تصاویر کے حرفی نشانات پائے جاتے تھے۔ سمیریوں نے وقت گزرنے کے ساتھ ان تصویروں کو آسان بنانے کا عمل جاری رکھا۔ سمیریوں کی زبان قدیم ترین ہے۔ ۳ ہزار قبل مسیح ان کا زمانہ ہے۔ وہ ایشیا کے رہنے والے تھے بعض کہتے ہیں کہ عراق سے ان کا تعلق تھا۔ بہت سے کتبوں سے پتہ چلا ہے کہ بعد میں دوسری زبانیں بھی ان میں شامل ہوگئی تھیں جن میں عربی شامی اور کوہستانی لوگوں کے ملنے سے اور سارگوں کی منظوم زبان کے نمونے بھی ملے ہیں۔ مصر کے لوگ بھی تصویروں کے ذریعے آپس میں بات کیا کرتے تھے۔ دریائے نیل کی مٹی کی تختیوں پر تصویری زبان میں لکھا جاتا تھا۔

ایک خاص پودے سے تیار کیے ہوئے کاغذ ''پیپرس'' پر روشنائی سے لکھا جاتا تھا۔ قدیم مصری تہذیب کی تاریخ تین ہزار سال تک پھیلی ہوئی ہے۔(۳)

مصری رسم الخط کی جھلکیاں اہرام مصر میں لکھے گئے حروف سے سامنے آئی ہیں۔ مصری لوگ اپنے گھر سے محبت کرتے تھے۔ ان کی تصویری زبان میں گھر کو بہت اہمیت حاصل رہی۔ مصریوں نے بعد میں بہت سے یونانی الفاظ اپنی زبان میں شامل کیے۔ مصریوں پر ہندوستانی تہذیب اور سنسکرت کے اثرات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مصری عوام کی بدولت روشنائی، قلم اور تختیوں کا تصور پیدا ہوا۔

زبان تصویری حروف اور اشاروں کی بنیاد پر آگے بڑھتی رہی۔ زبان کا یہ لسانی سفر ہزاروں

کروڑوں سالوں پر مشتمل ہے۔ جس کے بارے میں مختلف حوالوں سے قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ مگر یہ لسانی تصویریں اور اشارے اپنی جگہ آج بھی اہمیت کے حامل ہیں اور ہر زبان میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتے ہیں۔ علامتیں بدلتی رہتی ہیں مگر یہ علامتیں ہر دور میں کوئی نہ کوئی لسانی خزانہ اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں۔ عام لوگوں انھیں اشاروں کی مدد سے لسانی ادراک کرتے تھے۔ ادبی ادراک بھی انھیں لسانی علامتوں اور استعاروں کی مدد سے ہوتا تھا۔

زبان دراصل ایک منظّم اور مربوط رابطے کے قانون سے عبارت ہے جس طرح قانون گرفت کرتا ہے اسی طرح الفاظ بھی انسان کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ الفاظ کے متعیّنہ معانی ومفہوم کے سبب انسان اپنی کہی ہوئی بات کا پابند ہوتا ہے۔

زبان حقیقت کا ایسا استعاراتی قالب ہے جو انسان کے مجرد تجربات اور واردات کو منظم کر کے ٹھوس جسمانیت سے ہمکنار کرتا ہے۔ زبان میں صرفی ونحوی اصولوں کی کارفرمائی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ انسان اپنے خیالات و جذبات کو منظّم کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ زبان کا بامعنی استعمال زندگی میں تنظیم اور تربیت کا مظہر ہے زبان بیک وقت ایک انفرادی اور معاشرتی عمل ہے۔ ذہن انسانی الفاظ کی صورت حقیقت کا ادراک کرتا ہے۔ الفاظ اسے انسانی تجربات اور واردات کی دنیا سے روشناس کراتے ہیں۔ اگر ذہن کو الفاظ سے محروم کر دیا جائے تو اس کا ملجاو ماویٰ چند مبہم وارداتوں سے زیادہ نہ ہوگا۔ چنانچہ ایک فرد کے لیے الفاظ خبر اور وقوف کا درجہ رکھتے ہیں۔(۴)

عام بول چال میں الفاظ کے معانی کا تعین اور طرح سے ہوتا ہے جب کہ ادبی یا شعری زبان میں معانی کا تعین دوسری طرح کیا جاتا ہے یہاں الفاظ کے اصطلاحی اور علامتی معانی بھی عبارت میں اپنی جگہ بنالیتے ہیں۔ شعر میں زیادہ تر بات سیدھے سادے انداز میں نہیں کی جاتی بلکہ شعری اظہار بعض اوقات ابہام میں ملفوظ ہوتا ہے۔ نئے علوم میں خصوصاً علم المعانی نے لفظ اور شے کے جو نئے رشتے دریافت کیے ہیں ان کے پیش نظر شاعری اور ادب میں معانی کی حیثیت بدل گئی ہے۔ اس علم کا اوّلین نقش اہلِ یونان کے ادبیات میں ملتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کی وجہ سے لفظ اور شے کا تعلق دریافت کیا جاتا ہے۔ لفظ اور شے کا تعلّق معانی کا خصوصی تصور ہے۔ اس علم نے نفسیات سے بھی استفادہ کیا ہے کیونکہ لفظ اور شے کے تعلّق کی دریافت ذہن انسانی کے خصوصی ادراک کا نتیجہ ہے۔(۵)

بہت پہلے انسان الفاظ سے تسخیر کائنات اور اپنے مسائل کا حل چاہتا تھا۔ وہ مختلف اصوات

(جنتر منتر، وظائف) کے ذریعے اس کائنات کے بند طلسم کو کھولنا چاہتا تھا، وہ صوت کے ذریعے اپنی اُمنگوں اور خواہشوں کی تکمیل کے خواب دیکھتا رہا، زبان کو اس وقت انسان نے مافوق الفطرت طاقت کے حوالے سے اپنایا ہوا تھا۔ مگر جب وہ اس کی مدد سے تسخیر کائنات نہ کر سکا اور فطرت کو زیر کرنے سے قاصر رہا تو رفتہ رفتہ زبان کا حقیقی اور معروضی تصور اس کے ذہن میں اپنی جگہ بنانے لگا۔ یوں زبان اور اصوات کسی بھید کی کنجی بننے کے بجائے احساسات اور جذبات کی ترجمان ٹھہری۔ اصوات آہستہ آہستہ الفاظ کے لباس میں زبان کا تحریری روپ بنتی چلی گئیں۔ الفاظ کی تعمیر و تشکیل میں انسانی ذہن اور تخیّل کا ایک بڑا حصہ ہے۔ بقول ڈاکٹر زور:

''یہ بات یاد رکھنی چاہئے لفظ اپنی پیدائش کے لحاظ سے انسان کا ایک خود اختیاری یا روایتی اشارہ ہے جس سے واقف ہوتے ہی کسی شخص کے ذہن میں وہی خیال یا خیالات رونما ہو جاتے ہیں جن کو وہ شخص عادتاً یا اشارتاً اس لفظ کے سننے کے بعد اپنے ذہن میں پیدا کرتا رہتا ہے مگر عام ذہنوں میں جو خیال یا تصور کسی لفظ کے سننے کے بعد پیدا ہوتی ہے وہ معین اور تفصیلی نہیں ہوتی۔۔ عام طور پر الفاظ اپنی انفرادی حالت میں نامکمّل ہوتے ہیں اور جب وہ جملوں یا فقروں میں منسلک ہوتے ہیں تو اس وقت بھی ان کی قدر و قیمت اور ان کی پیش کی ہوئی ذہنی تصویریں بالعموم نسبتی اور غیر معین ہوتی ہیں غرض لفظ اور خیال کے درمیان جو تعلّق ہوتا ہے وہ ہمیشہ استوار اور معین نہیں ہوتا۔''(۶)

الفاظ کے معانی وسیع بھی ہو سکتے ہیں اور محدود بھی، یہ موقع کی مناسبت اور عبارت کی ضرورت کے حساب سے ہوتا ہے۔ جو الفاظ کثیر المعانی ہوتے ہیں ان میں زندہ رہنے کی زیادہ توانائی ہوتی ہے۔ انیس ناگی لکھتے ہیں:

''شعری لسانیات میں صرف وہی الفاظ دوامی معنویت کا رتبہ حاصل کرتے ہیں جن میں اپنے وجود سے بڑھ کر معانی کے اظہار کی استطاعت ہوتی ہے۔''(۷)

زمین پر انسان اپنی ابتدائی زندگی میں اشاروں کے ذریعے جب بات کرتا ہوگا تو وہ اشاروں کے ذریعے اشیاء کی تصویر کشی کی کوشش کرتا ہوگا۔ جیسا کہ ہم آج کل بھی جب کسی کو اشارے سے کچھ کہتے ہیں تو ہاتھوں یا منہ کے اشارے سے اُس شے کی تصویر کشی کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کی ایک مثال ماضی کے قدیم غاروں میں انسان کے ہاتھوں سے بنی ہوئی وہ تصویریں ہیں جو کسی نہ کسی

واقعے اور تحریر کی عکاسی کرتی ہیں۔

الفاظ اور زبان کا تعلق کسی بھی صورت حال کی ترجمانی کے حوالے سے اہم ہے، جو زبان صورت حال کی صحیح عکاسی نہ کر سکے، وہ زبان لسانی حوالے سے ایک ناقص زبان سمجھی جائے گی۔ ہر حرف، لفظ اور جملہ کسی نہ کسی واقعے سے منسلک ہوتا ہے اور اس واقعے کی لفظی تصویر پیش کرتا ہے ہر لفظ اپنی جگہ اہم ہے۔ ضرورت اس لفظ کے معنی کی ترسیل کے عمل کو آسان بنانے کی ہوتی ہے۔

مولوی عبدالحق موقع محل کی مناسبت سے بولے اور لکھے گئے الفاظ کی حقیقت اور اثر آفرینی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''لفظ میں بڑی قوت ہے صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا اثر رکھتا ہے بعض اوقات اچھے اچھے ادیبوں کو لکھتے وقت صحیح لفظ نہ ملنے پر بڑی الجھن ہوتی ہے۔ ایک لفظ آتا ہے وہ اسے رد کر دیتا ہے دوسرا آتا ہے اسے بھی ہٹا دیتا ہے تیسرا آتا ہے وہ بھی پسند نہیں آتا۔ آخر اسی ردو بدل میں جب اسے صحیح لفظ مل جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے گھٹا میں چاند نکل آیا جو اس گُر سے واقف نہیں اور صحیح لفظ کی قوت کو نہیں مانتے وہ اپنا مطلب اینچ پینچ اور ہیر پھیر سے کئی کئی جملوں میں ادا کرتے ہیں پھر بھی اس سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو صحیح لفظ صحیح مقام پر اپنی جادو بیانی سے پیدا کرتا ہے۔''(۸)

زبان جتنی آسان ہوتی جائے گی اتنی ہی اسے مقبولیت ملتی جائے گی۔ مشکل الفاظ و تراکیب کے استعمال کی وجہ سے زبان عمومی مقبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔

''لفظ کی تعریف ''اقلی آزاد شکل'' کی گئی ہے یعنی وہ قلیل ترین لسانیاتی اکائی جو بامعنی طور پر تنہا بولی جا سکے۔ اقلی آزاد شکل ہونے کی حیثیت سے اس میں اضافہ، تخفیف، تبادل اور منتقلی ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر من رویا میں اگر ن کے محل وقوع کو دیکھیں تو اسے ''تو'' سے بدلا جا سکتا ہے۔ یا رویا کی جگہ کوئی اور فعل استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس کی اقلی شکل متعیّن ہو چکی ہے لہٰذا اسے لفظ تصور کرنا چاہیے۔''(۹)

الفاظ معاشرے میں جنم لیتے ہیں اور معاشرے ہی کے ساتھ زندہ رہتے ہیں، جو لفظ معاشرتی سطح پر اپنا وقار کھو بیٹھتے ہیں وہ رفتہ رفتہ زبان سے غائب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

''زبان الفاظ کے صوتی و معنوی سطح پر باہم ارتباط کے مخصوص نظام سے عبارت ہے

۔الفاظ خلا میں نہیں جیتے اور نہ ہی ان کے اوصاف وعیوب کی تعیین مفرد لفظ کی حیثیت سے ممکن ہے۔لفظ کی ثقالت یا لطافت، اس کی فصاحت، اس کی موزونیت یا عدم موزونیت اس کی دلالتیں اور ان کی تعبیریں اس کے دوسرے الفاظ کے ساتھ تقابل، تفاعل یا اتصال کے بعد ہی نمایاں ہوتی ہیں۔''(۱۰)

حروف، الفاظ اور عبارت کے بغیر زبان کا وجود ممکن نہیں۔کوئی بھی زبان بول چال اور تحریر کے حوالے سے حروف والفاظ وتراکیب پر مشتمل ہوتی ہے۔یہ الفاظ مختلف عبارات اور اقتباسات میں مختلف انداز میں معنوی اکائی کے طور پر اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں۔بقول مولوی عبدالحق:

''لفظ کوئی بے جان چیز تو ہے نہیں، جہاں چاہا اٹھایا رکھ دیا،اس کے گنوں کے پرکھنے والے مشتاق ادیب ہی ہوسکتے ہیں۔کسی اعلیٰ درجے کے ادیب یا شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھئے ہر لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے ایک نگینہ ہے جو اپنی جگہ جڑا ہوا ہے اسے بدل کر کوئی دوسرا لفظ رکھ دیجئے ساری لطافت اور نزاکت خاک میں مل جائے گی،علاوہ اس کے آسان اور مشکل اضافی لفظ ہیں یعنی ایک چیز جو مجھے مشکل معلوم ہوتی ہے دوسرا اسے آسان سمجھتا ہے۔جسے میں آسان سمجھتا ہوں وہ دوسرے کے لیے مشکل ہے۔''(۱۱)

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق زبان کا بھی ہے۔یعنی انسان اور حیوان میں کوئی فرق زبان سے زیادہ اہم نہیں ہے۔(۱۲)

لفظ بناتے وقت اس کے معنی کا تعین بھی کر لیا جاتا ہے اور معنی کا یہ تعین کسی قسم کے ربط اور منطق کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ صرف ضرورت کے مطابق ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ وہی معانی پھر اس لفظ کے ساتھ ایک حقیقت کی طرح چپک جاتے ہیں۔

معنی آوازوں میں اس وقت داخل ہوتے ہیں جب وہ مل کر ایک لفظ بن جاتی ہیں۔اور یہی زبان کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔مراد یہ ہے کہ لفظ کا ایک طرف تو آواز سے تعلق ہوتا ہے اور دوسری طرف معنی سے۔لیکن ہر علامتی نظام کی خصوصیت ہے کہ اس میں ہمیشہ دو پرتیں ہوتی ہیں۔ظاہر اور باطن۔ ہیئت اور مواد۔صورت اور سیرت اور اس خصوصیت میں زبان بھی ان نظاموں کے ساتھ برابر کی شریک ہے لیکن زبان میں ایک اور دُہرا پن بھی ہوتا ہے جو ڈھانچے کا دہرا پن کہلاتا ہے۔اس میں نہ صرف آوازوں ہی سے لفظ بنتا ہے بلکہ لفظوں کو ملا کر جملہ بھی بنایا جاتا ہے چنانچہ لفظ ایک جانب آوازوں

سے اور دوسری جانب جملوں سے مربوط اور وابستہ ہوتا ہے۔

زبان تحریری بھی ہوتی ہے اور تقریری بھی۔ مگر آواز کو حرف پر فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ پہلے اصوات وضع ہوئیں پھر ان اصوات کو محفوظ کرنے کے لیے حروف بنائے گئے۔ بے شمار زبانیں ابھی بھی ایسی ہیں جنھیں لکھنے کا رواج نہیں مگر وہ بولی جاتی ہیں۔ ایک زبان اپنے بولنے لکھنے اور سننے والوں میں جتنی بولی جا رہی ہوتی ہے اتنی لکھی نہیں جاتی۔

''جس طرح اشیاء دنیا کی اکائیاں ہیں اسی طرح الفاظ زبان کی اکائیاں ہیں۔ شے دنیا کی جان نہیں بلکہ خود دنیا ہے۔ لفظ بھی زبان کی روح نہیں زبان ہے۔ اس لیے زبان کے مطالعے کی ابتدا لفظ سے کرنی چاہیے اور اسی پر اس کی انتہا ہونی چاہیے۔''(۱۴)

لفظ کے بارے میں جب آگاہی ہو جاتی ہے تو پھر زبان کے مخفی اسرار کھلنا شروع ہوتے ہیں۔ تحریر سے تقریر، لفظ سے معنی کے سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔

لفظ بنانا: لفظ حرفوں کے مجموعے کو کہا جاتا ہے۔ لفظ آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ زبان کی ترقی اور توسیع کے لیے لفظ بنانے کا عمل نہایت ضروری ہے جب تک زبان میں نئے نئے لفظ بنتے رہتے ہیں زبان آگے بڑھتی رہتی ہے۔ کیونکہ لفظ کی مدد سے جملے بنائے جاتے ہیں اور جملے اقتباس کی شکل میں عبارت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کے بقول:

''۱۔ آوازوں سے لفظ بنانا جسے زبان کی تخلیق کہہ سکتے ہیں اور اس طرح جو چھوٹے سے چھوٹا لفظ بنتا ہے اسے جڑ، مادہ یا اساس کہتے ہیں۔ جیسے ہاتھ، پڑھ، تیر وغیرہ۔

۲۔ لفظ سے لفظ بنانا جسے زبان کی توسیع کہا جا سکتا ہے جیسے ہتھر، پڑھائی، تیراک وغیرہ جو ہاتھ، پڑھ، تیر کی جڑوں، مادوں یا اساسوں سے بنے ہیں

اردو میں بھی مادہ مختصر ترین لفظ ہوتا ہے اور اس سے دوسرے لفظ بھی بنتے ہیں لیکن اس کے کئی طریقے ہیں جو عربی کے اشتقاقی عمل سے مختلف ہوتے ہیں اس لیے اسے اشتقاق کہنا مناسب نہیں ہے۔ اس کے لیے موزوں لفظ بناوٹ یا ساخت ہے۔''(۱۵)

لفظوں سے لفظوں کا نکاس نئے نئے لفظ بنانے میں کام آتا ہے۔ لفظ ایک مختصر اکائی ہے بعض اوقات حرف وہی رہتے ہیں مگر حرفوں کی ترتیب سے لفظ اور ان کا سر بدل جاتا ہے مثلاً ظلم، ظالم، مظلوم، ظالمہ، ظلمت وغیرہ میں لفظ سر بدل بدل کر آتے ہیں۔ لازم، ملزوم، ملازم، ملازمہ، ملزم وغیرہ۔

اسے عربی میں علم اشتقاق کہا جاتا ہے۔ اردو میں صورت حال اس سے مختلف ہے۔

پڑ، پڑا، پڑنا، پڑاؤ، پڑانا،

پڑھ، پڑھا، پڑھنا، پڑھاؤ، پڑھانا، پڑھوانا

چڑھ، چڑھا، چڑھنا، چڑھاؤ، چڑھاوا، چڑھانا۔ یعنی ایک لفظ چڑھ سے الفاظ بنتے چلے گئے۔ ایسی مثالوں میں ہم چڑھ کو لفظ کا چھوٹے سے چھوٹا روپ قرار دیں گے جسے مارفیم کہا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اسحاق صدیقی، فن تحریر کی ایجاد سے پہلے، نگار جولائی ۱۹۵۳ء

۲۔ مقدمہ از شکیل الرحمٰن، زبان اور کلچر، سرینگر کشمیر، شاہین بکسٹال، ۱۹۵۸ء، ص ۴۷

۳۔ شکیل الرحمٰن، زبان اور کلچر، سرینگر کشمیر، شاہین بکسٹال، ۱۹۵۸ء، ص ۸۵

پہلا اہرام دو ہزار نو سو سال قبل مسیح خوفو نے بنوایا جس میں وہ خود دفن ہے۔ اس کی اونچائی ۴۵۰ فٹ ہے۔ (شکیل الرحمٰن، زبان اور کلچر، سرینگر کشمیر، شاہین بکسٹال، ۱۹۵۸ء، ص ۷۹)

۴۔ انیس ناگی، شعری لسانیات، لاہور، کتابیات، ۱۹۶۹ء، ص ۱۵

۵۔ ایضاً، ص ۲۱

۶۔ محی الدین قادری زور، سید، ڈاکٹر، ہندوستانی لسانیات، لاہور، مکتبہ معین الادب ۱۹۵۰ء، طبع ثانی، ص ۳۰

۷۔ انیس ناگی، شعری لسانیات، لاہور، کتابیات، ۱۹۶۹ء، ص ۸۸، ۸۹

۸۔ عبدالحق، مولوی، آسان اردو، مشمولہ نقش، ۹، ۶۱، کراچی، ص ۲۱

۹۔ اُردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ، مسعود حسین خاں، ترتیب وار دو ترجمہ: مرزا خلیل احمد بیگ، علی گڑھ، شعبہ لسانیات مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۲

۱۰۔ افضال حسین، قاضی، میر کی شعری لسانیات، دہلی، عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۲۶

۱۱۔ عبدالحق، مولوی، مشمولہ ہندوستانی زبان مرتبہ محمد قاسم نوری، لاہور، درد اکادمی، دوسری بار، ۱۹۶۹ء، ص ۸۰

۱۲۔ فلاسفی اینڈ دی نیچر آف لینگو ئیج، ص ۲

۱۳۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، لاہور فضلی سنز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۷

۱۵۔ تشریحی لسانیات، ص ۱۲۷، ۱۲۹

زبان کی قسمیں

زبان ایک ایسا موثر ذریعۂ اظہار ہے کہ جس کے ذریعے ہم اپنی زندگی میں شب وروز سینکڑوں کام سرانجام دیتے ہیں۔ ہماری پوری زندگی کی سرگرمی اور فعالیت کا دارومدار زبان پر ہوتا ہے۔ ہم زبان کو ہی استعمال کر کے ایک دوسرے سے روشناس ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں۔ زبان اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے کئی اقسام کی ہوتی ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں مختلف انداز میں زبان مصروف کار نظر آتی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور زبان کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں:

''ایک کاروباری زبان، دوسری ادبی زبان اور تیسری علمی زبان، کاروباری زبان میں معنی کی ایک ہی سطح ہوتی ہے۔ ادبی زبان میں لفظ کا تخلیقی استعمال شاعری میں اور تعمیری استعمال نثر میں ہوتا ہے۔ علمی زبان میں اظہار منطقی ہوتا ہے، جس میں حقیقی مفہوم ادا کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔۔ کاروباری زبان میں سیدھے سادے خیال اور فوری مطلب کو ادا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ علمی زبان میں پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کو اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ وہ ذہن کو روشن کر دے۔''(۱)

مندرجہ بالا اقسام کے علاوہ زبان کی بہت سی قسمیں ہوسکتی ہیں قانونی زبان، سرکاری زبان، فنی زبان، دفتری زبان، مذہبی زبان، اشتہاروں کی زبان، سائنسی زبان وغیرہ۔

فطری آوازیں

انسان، حیوان، چرند پرند کو قدرت نے آوازیں نکالنے کی جبلّت عطا کی ہے۔ فطری طور پر انسانوں میں یہ آوازیں چیخنے، چنگھاڑنے، سسکنے رونے، ہنسنے، چھینکنے وغیرہ جیسی آوازوں پر مشتمل ہیں۔ چیخ کبھی بھی بے معنی نہیں رہی۔

چیخ کی آوازیں اکثر اوقات کسی کو کوئی خبر دینے کے لیے بلند کی جاتی ہیں۔ اور چیخ اسی لیے عام آواز سے بلند ہوتی ہے تاکہ سننے والا فوری طور پر سن لے اور اُس پر چیخ کا خاطر خواہ اثر ہو۔ اگر غور کیا جائے تو چیخ میں آواز بھی ہوتی ہے اور معنی بھی۔ بعض اوقات یہ مدد مانگنے کے لیے ہوتی ہیں اور کبھی کسی خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے۔ انسانوں کے علاوہ اگر ہم جانوروں کی چیخوں کا جائزہ لیں تو یہ بھی بے معنی یا بے مقصد نہیں ہوتیں ان کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ جیسے ساتھیوں کو خبر دار کرنا، جوڑا چاہنا، بھوک کا اظہار کرنا۔

چیخ کا وجود شروع سے آج تک موجود ہے اور رہے گا۔ انسان مختلف جذبات کی عکاسی زبان کے ساتھ ساتھ چیخ کی صورت میں بھی کرتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انسان کسی بات کی شدت کو ظاہر کرنے کے لیے بول کے ساتھ ساتھ چیخ کا بھی سہارا لیتا ہے جس سے وہ فوری طور پر دوسروں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔

اشارہ چیخنا، اشارہ کرنا یا آواز نکالنا وہ الگ الگ طریقے ہیں جو انسان اپنے دل کی بات بتانے کے لیے شروع ہی سے استعمال کرتا چلا آرہا ہے۔

زبان اور چیخ میں بنیادی طور پر یہ فرق ہے کہ زبان انسان سماج سے سیکھتا ہے جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی بھی رہتی ہے جبکہ چیخ اسے فطرت نے ودیعت کی ہوئی ہے جس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

عمومی زبان

جو زبان عام بول چال میں استعمال ہوتی ہے اُسے عمومی زبان کہا جاتا ہے۔ چونکہ علمی، ادبی زبان بولنے والوں کی نسبت عمومی زبان بولنے والے ہر معاشرے اور سماج میں زیادہ ہوتے ہیں، اسی لیے عمومی زبان کا استعمال بھی زیادہ ہوتا ہے۔

ادبی اور علمی حیثیت رکھنے والوے لوگ بھی جب عام لوگوں سے یا اپنے گھروں میں اہل خانہ سے گفتگو کرتے ہیں تو انھیں عمومی زبان ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس طرح ادبی اور علمی زبان لکھنے وار بولنے بھی عمومی زبان کے سہارے اپنے بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

عمومی زبان خواص سے لے کر عام آدمی تک استعمال کرتا ہے۔ بڑے بڑے شاعروں کے وہی شعر زبان زدعام ہیں جنھیں عمومی زبان کے قریب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں شعریت اور غنائیت تو ہے مگر ادبی زبان کی سے پیچیدگی اور رنگینی ورعنائی نہیں، بلکہ وہ سیدھے عام لوگوں کے دلوں میں اُتر جاتے ہیں، ادبی زبان یا شعری زبان کو سمجھنے کے لیے بعض اوقات لغات یا فرہنگوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ جبکہ عمومی زبان میں ایسی کوئی اُلجھن پیدا نہیں ہوتی۔

ادبی زبان

ہمارے پاس ادب میں تحریر وتقریر میں زبان دو واضح دائروں میں تقسیم ہوتی نظر آتی ہے ایک دائرہ نثر کا اور دوسرا شاعری کا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ نثری زبان اور شعری زبان ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔ بقول دتاتریہ کیفی:

> ''اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ شعر کی زبان نثر کی زبان سے اور بول چال کی زبان علمی تصنیف کی زبان سے ممیّز ہوا کرتی ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ فلسفہ مابعد الطبیعات یا اسلوب تحلیلی کے نظریے پر باغ و بہار یا فسانۂ آزاد کی زبان میں کتابیں تصنیف ہونی چاہئیں۔ علمی زبان روزمرہ سے اُسی طرح مابہ الامتیاز رکھتی ہیں جس طرح ڈریس سوٹ۔ رائنڈنگ سوٹ سے کوئی صحیح حواس رکھنے والا شخص کھانے کی پوشاک پہن کر سواری کو نہیں نکلتا۔''(۲)

ایک عام آدمی اور شعبدہ باز میں یہی فرق ہوتا ہے کہ جس طرح عام آدمی چیزیں پیش کرتا ہے، شعبدہ باز وہی چیزیں انوکھے اور پُراسرار، جادو بھرے انداز میں کرتا ہے۔ شعبدہ باز کی یہی بات اسے عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے اور لوگ اس کے کام کو دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جو کچھ دکھا رہا ہے صرف ہاتھ کی صفائی ہے کوئی جادو نہیں، پھر بھی لوگ اُس کے کارناموں سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح تخلیق کار کا اصل کام الفاظ کو نئے انداز میں استعمال کرنا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا علمی ادبی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ایک اچھے ادیب کا کام ہے کہ وہ اپنے تخلیقی عمل میں پہلے تو لفظ کو اس کے مروج مفہوم

سے نجات دلاتا ہے اور پھر ایک جادوگر کی طرح اسے ایک نئے تازہ اور زرخیز مفہوم سے منسلک کردیتا ہے مگر یہ مفہوم کوئی پہلے سے طے شدہ نظریہ نہیں ہوتا۔''(۳)

ادبی زبان یا شعری زبان بعض اوقات انفرادی حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ ادیب اور شاعر لفظوں کے ذریعے ایسی ایسی تصویریں پیش کردیتے ہیں کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ ادبی زبان میں نئے الفاظ اور لفظوں کو برتنے کا نیا طریقہ بھی ملتا ہے۔

''ادبی زبان انسانی ذہن اور احساسات کے مابین کشاکش کی عکاسی کرتی ہے۔''(۴)

ادبی زبان بیک وقت تخلیقی توانائی، فنکارانہ مہارت اور عصری صداقت سے بھرپور ہوتی ہے اور بعض اوقات نامانوس بھی ہوتی ہے۔ اجنبیت اور انوکھاپن اس کو مزید پُرکشش بناتے ہیں

زبان کی ایک اہم قسم علمی زبان کی بھی ہے، جس سے قومیں اور تہذیبیں نئی سانسیں لیتی ہیں۔

علمی زبان

الفاظ مختلف علوم کی تحصیل اور ترسیل میں ایک مخصوص اور لگے بندھے انداز میں کثرت سے استعمال ہوہوکر اور متعیّن معنوں کی ترسیل کا فریضہ سرانجام دے دے کر اپنی خوبصورتی اور پُراسراریت کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ خارجی چیزوں کی ترجمانی تو صحیح طور پر کرسکتے ہیں مگر محسوسات اور داخلی جذبات کی ترجمانی مشکل کام ہے۔ علمی زبان میں الفاظ معلومات کی ترسیل، متعیّن نظریے یا مفہوم کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر ان میں استعارہ، تشبیہہ کا استعمال اور احساسات وجذبات کی عکاسی اس انداز میں نہیں ہوتی جیسا کہ ادبی یا شعری زبان میں۔

علم کسی ایک چھوٹے سے دائرے یا مضمون کا نام نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ علوم کا دائرۂ کار اس قدر وسیع ہوچکا ہے کہ ان پر دسترس حاصل کرنا کسی ایک انسان کے بس کی بات نہیں۔ ان تمام علوم میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ علمی زبان کہلاتی ہے۔ علمی زبان کا دائرہ محدود نہیں ہوتا بلکہ جس طرح علوم ے دائرے کی کوئی حد نہیں اسی طرح علمی زبان کا دائرہ بھی وسعت رکھتا ہے۔

علمی زبان ہمیشہ عام زبان سے مختلف ہوتی ہے اور بعض علوم تو ایسے ہیں کہ انھیں صرف وہی جان سکتے ہیں جو اس علم سے وابستہ ہیں۔

معیاری زبان

ایک ہی زبان کی مختلف بولیوں کے درمیان اعتدال اور پل کا کام دینے میں معیاری زبان

کو بنیادی اہمیت حیثیت حاصل ہے۔اگر ہر طبقہ اور معاشرتی گروہ صرف اپنی زبان اور بولی کو اہمیت دینے لگے تو اس سے آہستہ آہستہ وہ تمام گروہ ایک دوسرے کی بولیوں سے دور ہوتے ہوتے ایک دوسرے کے خیالات سے بھی واقف نہ ہوسکیں گے۔ایسے میں ایک ایسی زبان کی ضرورت اپنی جگہ اہم ہے جوان تمام بولیوں میں ایک معیار کا درجہ رکھتی ہو۔بقول سدھیشور ورما:

''اول معیاری زبان کو اپنی متعلّقہ بولیوں سے نفرت اور کڑا پن کے رجحان سے پرہیز کرنا ہو گا۔ان بولیوں سے بھی گاہے بگاہے متعدد الفاظ کو اپنے خزانہ الفاظ میں شامل کرنا ہوگا۔''(۵)

زبان کا تعلق بولنے والوں سے ہے بولنے والوں میں ہر قسم کے لوگ شامل ہیں وہ بھی جو زبان کو زبان سمجھ کر بولتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو زبان کو صرف ایک ذریعے کے طور پر پہچانتے ہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔اسی سبب سے زبان وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اندر تغیّرات کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ لیے ہوتی ہیں۔معیاری زبان اور زبان کے بدلتے ہوئے رویے کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''جب زبان بدلتی ہی رہتی ہے اور اس میں نئے مصطلحات، محاورات، استعمالات داخل ہی ہوتے رہتے ہیں تو پھر معیاری زبان پر اس قدر اصرار کیوں؟ اگر زندہ اور ترقی یافتہ زبانیں نئے الفاظ وغیرہ اپنے دائرے میں لاتی ہی رہتی ہیں۔تو ''غلط'' زبان کی شکایت کیوں؟''(۶)

معیاری زبان کو دوسری زبانوں اور بولیوں کی نسبت استناد حاصل ہوتا ہے۔زیادہ تر علمی و ادبی کام اسی زبان میں انجام پاتا ہے۔

زنانہ اور مردانہ زبانیں

ہمارا معاشرہ کئی طبقات میں بٹا ہوا ہوتا ہے، جس میں لڑکے، جوان، بوڑھے، خواتین وغیرہ شامل ہیں۔جو اپنی زبان اور محاورہ رکھتی ہیں۔یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ مردوں اور عورتوں کے ماحول میں پیدائش سے موت تک ایک واضح فرق رہتا ہے۔جسے کبھی بھی مٹایا نہیں جاسکتا ہے۔نہ کم کیا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی زبان میں ہمیشہ سے ایک فرق رہا ہے۔بقول شان الحق حقی:

''ہمارے ہاں لڑکوں کی بولی تو عین طفلی ہی میں ماں کی بولی سے مختلف ہوجاتی تھی۔زنانہ اور مردانہ بولی میں واضح امتیاز تھا اور یہ صرف واحد متکلّم کے لیے مؤنث یا مذکر صیغوں کا

اختلاف نہ تھا، پورے طرزِ کلام پر حاوی تھا۔ اب بھی یہ امتیاز کسی حد تک باقی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں عورتیں جس قدر مردوں کے دوش بدوش آتی جائیں گی یہ امتیاز کم سے کم ہوتا جائے گا۔"(۷)

عورتوں کا زیادہ تر وقت عورتوں کے ساتھ ہی گزرتا ہے۔ اور کچھ ایسے معمولات ہیں جن کا تعلق براہِ راست صرف عورتوں سے ہوتا ہے، مردوں کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہی فرق ان کی زبان میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

"عورتیں مردوں سے الگ ہی بولتی ہیں ان کے لغات، محاورے، لہجے، روزمرے، دعائیں، بددعائیں، کوسنے، قسمیں اور اسالیب بیان بالکل بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ قدامت پرست ہوتی ہیں۔ اور قدیم رسوم اور عادات سے وابستہ رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ان پر بیرونی اثرات بھی اتنے نہیں پڑتے جتنے مردوں پر پڑتے ہیں۔ کیونکہ مردوں کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے اور عورتوں کا تعلق گھروں کی اندرونی دنیا سے زیادہ ہوتا ہے۔"(۸)

مردوں کی بول چال اور عورتوں کی بول چال میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مردوں کی بول چال بعض اوقات روایتی، مشکل، رعب والی ہوتی ہے جبکہ عورتوں کی بول چال میں سلاست، رسائی، سادگی، ٹھہراؤ، مٹھاس، اور نرمی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مردوں کی نسبت عورتوں کی بات چیت اور گفتگو میں شرم وحیا، لحاظ، خوف، ڈر، جھجک، بھی پائی جاتی ہے۔

زبان کا تعلق چونکہ گھر سے ہے اور ہر بچہ اپنی پیدائش ہی سے کچھ نہ کچھ آوازیں نکالنا شروع کرتا ہے۔ ماں آہستہ آہستہ ان آوازوں کو مروجہ زبان سے ہم آہنگ کراتی چلی جاتی ہے۔ اسی لیے انسانی زبان کو مادری زبان بھی کہا جاتا ہے کیونکہ بچہ سب سے پہلے اپنی ماں سے بولنا سیکھتا ہے۔

"انسانی تاریخ شاہد ہے کہ جو نامراد قومیں اپنی مادری زبان کو پسِ پُشت ڈال کر پدری زبان کے اختیار کرنے کا ارتکاب کرتی ہیں وہ اپنی ماؤں کی توہین کرنے کے جرم میں مادی وذہنی دونوں حیثیتوں سے کھکھ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ آپ سمجھے میں پدری زبان کس کو کہتا ہوں؟ پدری زبان، وہ کبھی نہ آسکنے والی زبان ہوتی ہے جو معاشی دوڑ دھوپ، دیگر اقوام کے میل جول، تجارتی لین دین اور سب سے زیادہ اغیار کی غلامی کے ناجائز دباؤ کے سائے میں

ایک زہریلی بیل کی طرح پروان چڑھتی ہے اور اپنی لپیٹ میں قوموں کو ان کی مادری زبان اور مادری زبان کے تمام عطا کردہ خزانوں سے محروم کر کے رکھ دیتی ہے۔"(۹)

دنیا میں مختلف نظام قائم ہوئے مدرسری نظام، پدرسری نظام، مگر زبان کی اہمیت وہی رہی جو پہلے سے دن سے تھی۔ وحیدہ نسیم لکھتی ہیں

"زبان کی وابستگی عہد حجر (Stone age) سے لے کر عہد خلائی تک ماں ہی سے منسوب رہی۔ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ مادری زبان کا تصور بھی پختہ ہوتا چلا گیا۔"

"ماں اپنے بچے کو الفاظ سکھاتی ہے تو قصداً لفظ بگاڑ کر بولتی ہے۔ کبھی کبھی لہجہ اور تلفظ بدلتی ہے اور خود بھی تُتلا تتلا کر کرخت الفاظ کو بچوں کے لیے قابل فہم بناتی ہے۔ بچہ تتلا کر بولتا ہے ماں اسی لہجے میں جواب دیتی ہے۔"(۱۰)

ماں اپنے بچے کو بتدریج زبان سکھاتی ہے، پہلے ٹوڑ توڑ کر لفظ بولتی ہے مختصر مختصر۔ شروع میں ابا کے لیے با کہنا سکھاتی ہیں یا ابو کے لیے بو کہنا سکھاتی ہیں۔

عورتیں بے معنی اور بامعنی الفاظ سے بچوں کی پرورش کا آغاز کرتی ہیں۔ بہت سے الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو صرف ماں ہی سمجھتی ہے یا وہ بچہ جسے ماں سکھا رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح بچوں کی پرورش، سلائی کڑھائی، کھانا پکانا، پکوان، بچوں اور گھر داری بہت سے الفاظ عورت خود ایجاد کرتی رہتی ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ خواہ ترقی یافتہ معاشرہ ہو یا پسماندہ عورتیں اپنے معاملات میں بہت سے اپنے زنانہ الفاظ خود وضع کرتی ہیں۔ اپنے بچوں کو کہانیاں سناتی ہیں اور اس طرح بچوں کو کہانیوں کے ذریعے مختلف الفاظ اور ان کے معانی سکھاتی ہیں۔

"عورتوں کی زبان بہت زیادہ شستہ پاک وصاف اور شیریں ہوتی ہے نسبتاً مردوں کے اُن کا انداز بیان زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں ایک محدود ماحول میں سانس لیتی ہیں اور نجی واقعات ان کی زندگی میں اہم حصہ لیتے ہیں۔ محدود فضا میں رہنے کی وجہ سے باہر کے ماحول کا اثر ان کی زبان پر نہیں پڑتا۔"(۱۱)

عورتوں کو خدا نے زبان کے معاملے خاص طور پر مردوں کی نسبت زیادہ اہلیت دی ہے، اسی لیے عورتوں کی زباندانی اور زبان چلانا مردوں کی نسبت زیادہ مشہور ہے۔ عورتیں زبان کے معاملے میں اپنا خاص انداز رکھتی ہیں جس پر باہر کے اثرات نہیں پڑتے۔ زبان کے لسانی ارتقا میں

عورتوں کی زبان اہمیت رکھتی ہے۔

بیگماتی زبان

دہلی میں قلعے کی بیگماتی زبان کی اپنی جگہ اہمیت رہی۔ بیگماتی زبان کو مرد بھی بولتے۔ اور ان مردوں سے بعض اوقات فرمائش کر کے بیگماتی زبان بولنے کی درخواست کی جاتی۔ قلعے میں بے شمار رسمیں اور ریتیں تھیں جو خواتین میں رائج تھیں اور جن پر ہندوانہ اثرات تھے۔ جس میں منتر، جادو ٹونے، جھاڑ پھونک، اور تعویذ گنڈے مشہور تھے۔ آج بھی دہلی اور لکھنؤ کی عورتوں میں مختلف ٹونے اور ٹوٹکوں کا رواج ہے۔ بیگمات کے ہاں مختلف پہیلیاں، لوریاں، لوک گیت، کہاوتوں، محاوروں روزمرہ اور ضرب الامثال کا رواج تھا۔ ان کی زبان میں وسعت، روزمرے کی چاشنی اور مٹھاس پائی جاتی تھی۔ جس نے اردو زبان کو لوچ اور سرمایہ لفظی عطا کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری نے اپنی کہانیوں میں، منشی فیض الدین نے ''بزمِ آخر'' اور سید احمد دہلوی نے ''محاوراتِ نسواں''، ''لغات النساء''، ''رسوم دہلی'' اور ''ہادی النساء'' میں عورتوں کی زبان کے خاص خاص محاورات، ضرب الامثال، کہاوتیں ریت رسمیں اور ان کی زبان کے نمونے دکھلائے ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا نے پس پردہ اور دیوان جان صاحب (ریختی کا مجموعہ کلام) میں بیگماتی زبان کی جھلکیاں اور چاشنی کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی نے بیگموں کی چھیڑ چھاڑ اور سات طلاقنوں کی کہانی میں بیگماتی زبان کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے اور اس طرح کے کئی مصنّفین وزیر حسن دہلوی کی چاند بی بی سلطانہ، فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، خواجہ محمد شفیع، ذکاء اللہ، عصمت چغتائی کی تحریروں میں بھی بیگماتی زبان کے چٹخارے ملتے ہیں۔''(۱۲)

مختلف کتابوں میں بیگمات کے محاورات، روزمرہ الفاظ کا ذخیرہ ملتا ہے۔ اس حوالے سے محمد منیر الدین کی ''محاوراتِ نسواں'' اہمیت کی حامل ہے۔

اشاراتی زبان

اشاروں کی زبان نسل انسانی کی ابتدا سے موجود ہے۔ اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے ہر انسان روزانہ کسی نہ کسی طور کوئی نہ کوئی اشارہ ضرور کرتا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ الفاظ کے ساتھ ساتھ مزید مفہوم تک رسائی کے لیے اشاروں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہ اشارے ہاتھ، اُنگلیوں،

انگوٹھے، آنکھوں، سر، چہرے، ٹانگوں، منہ اور دانتوں کے ذریعے ادا کیے جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اشارے تمام لسانی ضروریات کو پورا نہیں کرتے، مدعا کی ترسیل کے تمام تقاضے نہیں نبھا سکتے۔ ان میں وہ خوبی، وہ تنوع نہیں ہے جو تحریری اور تقریری زبان میں ہوتا ہے۔ جو شخص یا چیز موجود نہیں ہے اس کے بارے میں اشاروں میں سمجھانا بہت مشکل بات ہے۔ بقول سہیل بخاری: ''اشارے کو زبان کا پیش رو نہیں صرف ساتھی مانا جاسکتا ہے۔''(۱۳)

کچھ اشارے غیر دانستہ اور غیر شعوری بھی ہوتے ہیں۔ مگر اشارہ صوتی ہو یا ذہنی یا شعوری یا غیر شعوری زبان کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

''اشارے اور بولی میں بڑا فرق ہے اور یہ بالکل اسی ایک بات سے جانا جاسکتا ہے کہ اشارے کا ناتا آنکھ سے اور بولی کا کان سے ہے اندھے کو اشارہ اور بہرے کو بول کام نہیں دیتا۔ یہ دونوں من کی بات بتانے کے دو الگ الگ ڈھنگ ہیں اس لیے اشارہ اور بول ایک میل میں نہیں گنے جاسکتے پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ ایسے سماج میں جو بس اشارے ہی کرسکتا تھا بولی کس سے سیکھی جاسکتی تھی۔ میری سمجھ میں تو اشارے اور بولی دونوں کے دونوں انسانی سماج میں سدا سے ساتھ ساتھ چلے آرہے ہیں۔''(۱۴)

اشاروں اور جسمانی حرکات و سکنات کو شروع ہی سے زبان میں اہمیت رہی ہے۔ بعض اوقات ہم جو بول رہے ہوتے ہیں ہماری حرکات اور بولنے کا انداز اُن کی نفی کر رہا ہوتا ہے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

''زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں قوت گویائی سب سے اہم ہے اور جس کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے۔ اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔ (از ہندوستانی لسانیات، ڈاکٹر زور) لیکن یہ بات کچھ زیادہ ٹھیک نہیں ہے کہ زبان کے ساتھ حرکتوں اور اشاروں کو بھی شامل کرلیا جائے بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ اسے صرف آوازوں سے پیدا ہونے والی حرکتوں اور اشاروں اور علامات تک محدود نہ رکھا جائے، اشارے وغیرہ اظہار کا ذریعہ ضرور ہیں مگر انھیں زبان کا جز و نہیں بنانا چاہیے۔''(۱۵)

زبان دراصل اظہارِ خیال کا نام ہے، بعض اوقات انسان لفظوں میں اپنے خیالات اور

بات کا مکمّل اظہار کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ پھر وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اشاروں کو بھی زبان میں شامل کر لیتا ہے تاکہ ابلاغ کا کام مکمّل ہو سکے۔

عوامی زبان

زبان کا تعلق ہمیشہ سے عوام سے رہا ہے۔ اور یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ خواص اور عوام کی زبان میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ فرق رہا، مگر زبان وہی معتبر ٹھہری جسے عوام کا استناد حاصل ہوا۔ جو زبانیں محدود ہو کر خواص تک یا صرف چند گروہوں تک محدود ہو گئیں وہ وقت کے ساتھ ساتھ مٹتی چلی گئیں۔ بعض اوقات ہم دوسری زبانوں سے کچھ الفاظ لیتے ہیں جو عوام کی زبان پر غلط رواں ہو جاتے ہیں۔ خواص اور ماہرین زبان لاکھ کوشش کرتے رہیں مگر آخر ایک دن وہی الفاظ زبان زد عام ہو جاتے ہیں جو کہ عوام میں مقبول ہو جائیں۔ خواص سے مراد پڑھے لکھے، مقتدر طبقہ، حکومت سے تعلق رکھنے والے لوگ سبھی ان میں شامل ہیں۔ آج کل جب اُردو کے حوالے سے ہم بات کرتے ہیں تو یہ اُردو وہ ہے جو ہماری قومی اور عوامی زبان ہے۔ ہم اہل زبان کی اردو، دہلوی یا لکھنوی اردو کے جھگڑے یا معیار سے قطع نظر اُس اردو کی بات کرتے ہیں جسے آج اکیسویں صدی میں قبولِ عام حاصل ہے۔ زبان بول چال، اطلاعات کی فراہمی اور معلومات کے تبادلے اور اظہاریت کا کام دیتی ہے۔

> ''عام گفتگو کی زبان میں شعری اظہار کا معمول بننے کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے کہ عام حالات میں زبان کا استعمال محض مدعا کی ترسیل کے لیے ہوتا ہے۔''(۱۶)

عام گفتگو لوگ بے تکان اور بے ساختہ بولے جاتے ہیں نہ تصنّع نہ تکلّف ہوتا ہے بلکہ روانی ہوتی ہے۔ انھیں کسی قسم کا خوف یا قواعد کا خیال نہیں ہوتا۔

صحافتی زبان

اخبار اور صحافت کا شعبہ ایک وسیع دائرۂ کار رکھنے والا شعبہ ہے جس کا براہِ راست تعلق نہ صرف خواص سے ہے بلکہ عوام سے بھی ہے۔ اس میں دونوں کی دلچسپی کا سامان پایا جاتا ہے۔ دنیا کے ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ چونکہ خواص کی نسبت اس کے قارئین میں عوام کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اس لیے کوشش کی جاتی ہے کہ صحافتی زبان کو ثقیل، علمی یا مکمّل طور پر ادبی زبان نہ بنایا جائے۔

''اخباری لٹریچر کی زبان دیکھ کر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ایک اخبار کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ وہ پبلک کا رویہ لے کر اس کے ادبی مذاق اور زبان کو بگاڑے۔''(۱۷)

اخبارات اور صحافت کا اصل کام ترسیل ہے، معلومات کی ترسیل، خبروں کی ترسیل، نئے ہونے والے واقعات کی ترسیل، نئے حادثات اور سانحات کی تفصیلات کی ترسیل۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''صحافت کا میدان عمل خبر کی ترسیل اور اس کے تجزیاتی عمل تک محدود ہے۔''(۱۸)

صحافت میں دوسری زبانوں سے خبریں لیتے وقت صحافی حضرات بعض اوقات ان الفاظ کو بھی انگریزی ہی میں استعمال کر جاتے ہیں جن کا مترادف اردو میں بہتر طور پر موجود ہو۔ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اخباروں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اس میں انگریزی الفاظ کی بھرمار ہے اور اسلوب، اندازِ بیان عوامی بلکہ بعض اوقات چونکانے کے عمل کو تیز کرنے کے لیے عامیانہ پن بھی جھلکتا ہے۔

''اردو میں پہلے مسجّع اور مقفیٰ زبان استعمال کی جاتی تھی اور شاعرانہ انداز بیان کو اہمیت دی جاتی تھی اور زبان وبیان پر قدرت رکھنے والے ہی صحافت کے میدان میں داخل ہو سکتے تھے جبکہ اس دور کے برعکس آج کل صحافت میں خبر نگاروں کی ادب اور زبان وبیان کے حوالے سے زیادہ معلومات نہیں ہوتیں۔''(۱۹)

صحافتی زبان میں اختصار، روانی، سلاست اور غیر جانبداری ہونا نہایت ضروری ہے۔اس میں کوئی خاص لب ولہجہ نہیں ہوتا بلکہ عام قاری کو سامنے رکھا جاتا ہے۔بعض اوقات الفاظ کی تکرار بھی سامنے آتی ہے۔مگر صحافتی زبان چاہے وہ کالم کی شکل میں، اداریے یا فیچر کی صورت میں اس کا پہلا اور آخری مقصد بات کی تفہیم اور ابلاغ ہوتا ہے۔ کیونکہ صحافت دراصل عوام سے محوِ کلام ہونے کا نام ہے۔ اسی لیے ادبی اور علمی زبان کی نسبت صحافتی زبان عام بول چال کی زبان کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

''صحافتی زبان دراصل Language of Demond ہے صحافتی زبان دراصل کرائے کی زبان ہے یا اپنے قارئین سے ادھار لی گئی زبان کیوں کہ صحافی اپنے پڑھنے والے کا پابند ہوتا ہے۔اخبار میں صحافی کی مرضی کی زبان نہیں لکھی جاتی۔اخباری تحریر میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ پڑھنے والا ایک لمحے کے لیے بھی کسی تناؤ کا شکار نہ ہو۔''(۲۰)

صحافتی زبان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ زبان میں نئے نئے الفاظ وتراکیب اور مکالموں

کو جگہ دینے کا سبب بنتی ہے۔ صحافت ہی کے ذریعے زبان میں زیادہ تر تکنیکی اور عوام کے مختلف اور مخصوص حلقوں میں رائج الفاظ، جملے اور سلوگن زبان کا حصہ بنتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کو آنے کے لیے بھی صحافتی زبان ہی کے ذریعے راستہ ملتا ہے۔ صحافتی زبان کا ایک کام الفاظ کی پہچان کرانا اور ان کو عوام میں مقبول بنانا بھی ہے۔ اور صحافتی زبان میں وہی الفاظ بار بار لکھے جاتے ہیں جنھیں معاشرے کا ایک بڑا حصہ استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ سہیل وحید کے بقول:

''اردو نثر کا اس قدر بلند مقام تک پہنچنا اور اس کا ایک بہت بڑے حلقے کو متاثر کرنا فورٹ ولیم کالج کی لسانی تحریک کا شاخسانہ نہیں ہے بلکہ صحافت کا یوگ دان ہے۔''(۲۱)

صحافت نے ہمیشہ زبان کو فروغ دیا۔ اگر ہم اردو زبان کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو جہاں ہمیں علمی و ادبی کتابوں کا قحط نظر آئے گا وہاں ہمیں اخبارات اور رسائل اردو کی خدمت کرتے اس کی نشو و نما کرتے اور اس کے ارتقا میں بنیادی کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ آج بھی بڑے اخبار سے چھوٹے چھوٹے اخباروں تک، بڑے بڑے ضخیم رسائل سے چھوٹے چھوٹے رسائل تک زبان کے حوالے سے اس کی نشو و نما میں مصروف کار دکھائی دیتے ہیں۔

سوقیانہ زبان

زبان کی ایک قسم وہ بھی ہے جسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ زبان میں گنوار پن، جہالت، گالی گلوچ، ابتذال وغیرہ زبان کو عامیانہ بنا دیتے ہیں۔ ابتذال کے بارے میں ن م راشد لکھتے ہیں:

''ابتذال کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جذبات اور احساسات کا فقدان ہو، لیکن اس کی تلافی پر زور، جوشیلے اور ہیجان پرور الفاظ کے ذریعے کی جائے۔''(۲۲)

ادب میں ابتذال کی مثالیں شروع سے موجود ہیں۔ مگر یہ ابتذال یا سوقیانہ پن الفاظ اور حروف میں موجود نہیں ہوتا بلکہ اس کے استعمال کے طریقِ کار سے نمایاں ہوتا ہے۔ سید محمد تقی لکھتے ہیں:

''نہ آواز گندی ہوتی ہے نہ حروف اور نہ الفاظ۔ گندگی الفاظ کی ترتیب سے پیدا شدہ مفہوم کی ایک خاص ثقافتی قدر سے نسبت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔''(۲۳)

زبان کا استعمال اسے سوقیانہ یا عامیانہ بنا دیتا ہے۔ وگرنہ زبان کبھی سوقیانہ یا عامیانہ نہیں ہوتی۔ بعض اوقات مختلف الفاظ کی مختلف چیزوں سے نسبتیں بھی اُن الفاظ کو عامیانہ بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ آل احمد سرور، پروفیسر، مجموعہ تنقیدات، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، س ن، ص ۹۰، ۹۱،۷۷

۲۔ برج موہن دتاتریہ کیفی، منشورات، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰، ص ۲۷

۳۔ وزیر آغا، نئے تناظر، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۱ء، ص ۹۰

۴۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، نشانات، کراچی، ادارہ عصرِ نو، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۸

۵۔ سدھیشور ورما، آریائی زبانیں، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۶۰ء، بار دوم، ص ۲۲

۶۔ دیباچہ از شمس الرحمٰن فاروقی، لغات روزمرہ، کراچی، آج، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۹، ۱۷۰

۷۔ شان الحق حقی، زبان کے معیار کا مسئلہ، مشمولہ اخبار اردو، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ۴

۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، لاہور فضلی سنز، ۱۹۹۸ء، ص ۶۸

۹۔ مقدمہ از جوش ملیح آبادی، مشمولہ اردو زبان اور عورت از وحیدہ نسیم، ۱۹۶۴ء، ص ۵

۱۰۔ وحیدہ نسیم، اردو زبان اور عورت، ص ۸، ۹

۱۱۔ محی الدین حسن، دِلّی کی بیگماتی زبان، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۲۰۱۲ء، ص ۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۳۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی زبان، کراچی، فضلی سنز، ۱۹۹۷ء، ص ۳۵

۱۴۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کا روپ، لاہور، آزاد بک ڈپو، ۱۹۷۱ء، ص ۱۶

۱۵۔ احتشام حسین، آغا سہیل، اردو لسانیات کا مختصر خاکہ، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۲۲

۱۶۔ افضال حسین، قاضی، میر کی شعری لسانیات، دہلی، عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۳۱

۱۷۔ برج موہن دتاتریہ کیفی، منشورات، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰، ص ۱۹۶

۱۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نئے تناظر، ص ۸۷

۱۹۔ مسکین علی حجازی، صحافتی زبان، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۶۳

۲۰۔ سہیل وحید، صحافتی زبان، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۸ء، ص ۳۸

۲۱۔ ایضاً، ص ۶۵

۲۲۔ ن م راشد، ادب میں ابتذال، مشمولہ روشنی کم تپش زیادہ، کراچی، رائل بک کمپنی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۵

۲۳۔ سید محمد تقی، ادب فحاشی اور سماجی قدریں، مشمولہ روشنی کم تپش زیادہ، ص ۱۳۰

زندہ اور مُردہ زبانیں

دنیا میں لاتعداد زبانیں ہیں۔اتنی زیادہ کہ انھیں شمار کرنا ممکن نہیں۔زبان کے حوالے سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں پڑھے لکھے اور ان پڑھ لوگوں کی تخصیص نہیں کیونکہ زبان کو تو پڑھے لکھے بھی بولتے ہیں اور ان پڑھ بھی استعمال کرتے ہیں۔برصغیر میں تو صورتِ حال یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگ کم ہیں اور ان پڑھ زیادہ۔اعداد و شمار کے حوالے سے بتایا جاتا ہے پاکستان کی شرح خواندگی تقریباً ۲۶ فیصد ہے۔ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو انگوٹھا لگانے کے بجائے صرف آڑی ترچھی لائنیں لگا کر دستخط کرتے ہیں۔اور خود کو پڑھے لکھوں میں شمار کروا لیتے ہیں۔

زبان کا دارومدار زیادہ تر بول چال پر ہوتا ہے۔زبانیں صدیوں تک صرف بول چال سے پہچانی جاتی رہیں اور نسل در نسل منتقل ہوتی رہیں۔بول چال ہی آگے جا کر زبان کو محفوظ کرنے اسے تحریری شکل میں لانے کا سبب بنتی ہے۔اسی سے مختلف میڈیم تشکیل پاتے ہیں۔اس حوالے سے صوتی نظام اہمیت رکھتا ہے، تکلمی اور سمعی میڈیم زبان میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔بولنے والا اور سننے والوں دو ایسے ذریعے ہیں جن سے زبان اپنی سمت متعیّن کرتی ہے۔ان دونوں میں مطابقت زبان کی تراش خراش کا باعث بنتی ہے۔گونگے بہروں کے حوالے سے اشاروں کی زبان اپنا اعتبار حاصل کرتی ہے اسی طرح نابینا افراد کے لیے لمسی اشارے تشکیل پاتے ہیں۔

زبان ایک ایسی چیز ہے جو بولنے والے کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ زبان کی نمو اور اس کے ارتقا کے لیے مناسب ماحول اور کوششوں کو بروئے کار لایا جاتا رہے، جیسا کہ بولنے میں تکلّم اور اصوات کو اہمیت ہوتی ہے اسی طرح بصری میڈیم۔۔۔ جہاں لکھنے اور پڑھنے میں زبان کا علامتی ڈھانچہ اپنا کردار ادا کر رہا ہوتا ہے۔

زندہ زبان

زبان بولنے والا چاہے عالم ہو یا جاہل وہ زبان کے حوالے سے اسے بول کر اپنا کردار نبھا رہا ہوتا ہے۔ عالم لکھنے پڑھنے اور پڑھانے میں زبان کا استعمال کرتے ہیں مگر زبان کے حوالے سے ان پڑھوں کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے کیونکہ وہ بھی زبان سے ابلاغ کا کام لے رہے ہوتے ہیں۔ وہ زبان بھی زندہ زبان ہی کہلائے گی۔ خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

''زبان کا کوئی بھی جزو ہو، اس کا ہر جزو اسی وقت تک زندہ سمجھا جاتا ہے جب تک وہ زبان زد رہتا، سنا جاتا اور یاد رکھا جاتا ہے۔ بول چال اس کی غذا ہے۔ وہ علوم و ادبیات، فکر و آگہی کی مظہر اور امانت دار بن کر بھی اپنی غذا کے لیے محتاج رہتی ہے۔ جو میسر نہ آ سکے تو اس کا فطری ارتقا رُک جاتا ہے اور کتابوں ہی میں بند ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن کتابیں اسے صحیح معنوں میں زندہ نہیں رکھ سکتیں۔''(۱)

زبان وہی زندہ کہلاتی ہے جس کے بولنے والے اور جس میں غور و فکر کرنے والے موجود ہوں۔ زبانوں میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہتا ہے، کچھ نہ کچھ نئے الفاظ شامل ہوتے رہتے ہیں کچھ پرانے الفاظ متروک ہوتے جاتے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''ہماری زبان اگر زندہ ہے تو اس میں نئے نئے الفاظ آتے ہی رہیں گے خواہ وہ کسی زبان کے ہوں۔ اس سے کوئی زندہ زبان بچ نہیں سکتی۔ لیکن اس سے یہ معنی نہیں کہ جو لفظ مدت سے رائج چلے آ رہے ہیں، انھیں خارج کر دیں اور ان کی جگہ ڈکشنریوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بے ڈول، بے ڈھنگے، اور کرخت لفظ داخل کر دیں جن کے ادا کرنے میں زبان کئی کئی قلابازیاں کھائے اور کانوں کے پردے پھٹنے لگیں۔ جو لفظ پہلے سے رائج ہیں اور ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں، خواہ کسی زبان کے ہوں وہ اب ہمارے ہیں۔ غیر نہیں۔''(۲)

نئی نئی ایجادات کے ساتھ زبانوں کا دامن لفظی بھی بڑھتا رہتا ہے۔ آج سے تیس سال

پہلے اردو زبان میں کمپیوٹر، موبائل فون اور ان سے جڑی مختلف چیزوں کے نام موجود نہیں تھے جبکہ آج کل یہ سب الفاظ اردو زبان کے ذخیرۂ لفظی میں شامل ہو کر اس کے دامن کو وسیع کر رہے ہیں۔

اسی طرح انٹرنیٹ اور کمپیوٹر سے جڑی ہوئی باتوں نے بھی اردو زبان کے دامن کو وسعت دی ہے۔ جو زبان نئی ایجادات کے نام اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس حوالے سے اس میں الفاظ و تراکیب اور اصطلاحات سازی کا کام ہوتا رہتا ہے وہ زندہ زبان کہلاتی ہے۔ مگر جس زبان میں نئے الفاظ سمونے کی اہلیت نہ ہو، اور اس کے بولنے والے بھی روز بروز کم ہوتے جا رہے ہوں وہ زبان اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہی ہوتی ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ زبان مردہ ہو جاتی ہے اور اس سے متعلّق معلومات صرف تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔

کسی بھی معاشرے کو اپنے تہذیبی اور ثقافتی ارتقا کے لیے ایک زبان کی ضرورت ہوتی ہے جس کی بدولت وہ معاشرہ ترقی کی راہیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اگر ان کی اپنی زبان اس قابل نہ ہو تو لامحالہ طور پر وہ کسی اور زبان کی طرف رجوع کر لیتے ہیں یوں ان کی زبان اس تغیّر و تبدل اور ترقی سے محروم ہوتی چلی جاتی ہے جو کہ اسے صاحبِ فکر اور ماہرین تعلیم کی بدولت ملنا تھی۔

"حرکت، تبدیلی اور نشو و نما ایک زندہ زبان کی لازمی خصوصیات ہیں، زبان جب تک زندہ ہے تب تک ارتقا پذیر ہے اور جس طرح زندگی اپنے عہد اور ماحول سے بے تعلّق نہیں رہ سکتی اسی طرح زبان بھی اپنی نشو و نما اور توسیع کے لیے انھیں عوامل پر انحصار کرتی ہے۔"(۳)

زندہ زبانیں درج ذیل حوالے سے پنپتی اور ترقی کرتی ہیں:

۱۔ تعلیم و تدریس

جو زبان تعلیم و تدریس کی زبان ہو اس کے بولنے والے کبھی کم نہیں ہو سکتے ہیں کیونکہ تدریسی نظام کے ذریعے ہر سال لاکھوں بچے اس زبان میں پڑھتے ہیں، سرگرمی میں حصہ لیتے ہیں۔ مقالات لکھتے ہیں اور نئی نئی موشگافیاں کرتے ہیں۔ سائنسی دریافتیں، تاریخی حقائق، تنقید و تحقیق کے حوالے سے متنوع کام، جس کی وجہ سے زبان آگے بڑھتی ہے۔

۲۔ ادب، صحافت

زبان کو فروغ دینے میں ایک اہم کردار اس کے ادیبوں کا بھی رہتا ہے۔ ادیب نئے نئے

موضوعات کو سوچتے ہیں، لکھتے ہیں، غور و فکر کرتے ہیں۔ زندہ زبانیں بڑا ادب پیدا کرتی ہیں۔ ادب کے ذریعے زبان میں جہاں خیالات اور سوچ کو جلا ملتی ہے وہاں نئے نئے الفاظ اور تراکیب بھی زبان کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔ ناول، افسانہ، خودنوشت، رپورتاژ، مضمون، مقالات، کالم، فیچر، شاعری، نظم، غزل، مرثیہ، قصیدہ، نعت، حمد وغیرہ سینکڑوں مختلف پہلوؤں سے ادب زبان کو نئی سانسیں عطا کرتا ہے۔

۳۔ مذہب

مذہبی عبادات، رسومات، تہوار، آسمانی کتابیں، احادیث کی کتب اور ان سے جڑی تفاسیر، تراجم زبان کو نئی زندگی کی طرف لے جاتی ہیں۔ مذہب کے حوالے سے مختلف کتب کی اشاعت، دینی ادب، حمد و نعت بھی زبان کو نئے زاویوں سے روشناس کراتے ہیں۔

۴۔ تہذیب وثقافت

تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیاں سماج کی ساخت اور زبان کی بنت میں اہم کردار کی حامل ہوتی ہیں۔ سماج میں موجود انسانوں کے آپس میں تعلّقات، گھر کی اکائی سے لے کر ملکی اور بین الملکی تعلّقات، لین دین، مذاکرات بھی زبان کی نشوونما میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ ثقافتی میلے ٹھیلے، جشنِ بہاراں اور دیگر متعدد تقریبات زبان کو زندہ رکھنے میں اپنا جاندار کردار ادا کرتی ہیں۔

زندہ زبانوں میں جدید تحقیق کے حوالے سے کام ہوتا رہتا ہے۔ اصطلاحات اور ترجمہ کے شعبے کام کرتے رہتے ہیں۔ دنیا جہان کی مختلف کتابوں اور مقالات کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا عمل ایک ایسا کام ہے جو زبان کو سوچ اور غور و فکر کے نئے نئے دھاروں سے روشناس کراتا رہتا ہے۔ ایسی زبانیں کبھی مردہ نہیں ہوا کرتیں۔

زبان کو زندہ رکھنے میں ایک اہم کردار ان بولیوں کا بھی ہوتا ہے جو مختلف علاقوں میں زبان کے مختلف روپ پیش کرتی ہیں۔ زبان کا بولیوں کے حوالے سے یہ اختلاف اور اختلاط زبان کو لسانی حوالے سے آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔

اس کے علاوہ زبان کی اصلاح اور تراش خراش کا کام بھی ہوتا رہنا چاہیے، کیونکہ زبان اسی وقت زندہ رہ سکتی ہے جب اسے وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ڈھالتے رہیں۔

۵۔ ترجمہ

ترجمہ لسانی عمل کو تیز کرتا ہے۔ دوسری ترقی یافتہ یا علمی و ادبی حوالے سے زیادہ زرخیز زبانوں

سے جب ترجمہ کیا جاتا ہے تو بہت سے الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے لیے لفظ چُننے میں لسانی عمل سرگرم ہو جاتا ہے۔ جس سے زبان میں نہ صرف ذخیرۂ علمی بڑھتا ہے بلکہ زبان لسانی حوالے سے امیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور:

''ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق سے کم نہیں۔ ترجمے میں تخلیق کو ازسرِ نو پانا ہوتا ہے اس لیے امریکہ میں ترجمے کے لیے دوبارہ تخلیق Receation کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔۔۔ مترجم کا کام صرف لسانیاتی نہیں بشریاتی Anthro pological بھی ہے یعنی اسے صرف اصل زبان Source Language سے ہی واقفیت نہیں ہونی چاہیے۔ اس اس زبان کی تہذیب اور معاشرے سے بھی آشنا ہونا چاہیے۔''(۴)

زبان میں جتنی علم زبان کی اہمیت ہے اسی قدر ترجمے کی بھی اہمیت ہے۔ زبانوں کی نشوونما، ترقی اور ارتقا میں ترجمے کا کردار ہمیشہ کلیدی نوعیت کا رہا ہے۔ بقول مرزا حامد بیگ:

''ترجمہ محض علوم علوم کے فروغ ہی میں حصہ نہیں لیتا بلکہ انسانی گروہوں کے درمیان ذہنی مفاہمت بھی پیدا کرتا ہے۔''(۵)

چونکہ ہماری جدید شاعری اور تخلیقی وغیر تخلیقی نثر پر مغربی اثرات بہت زیادہ ہیں اس لیے ترجمے کی اہمیت بھی کسی طور کم نہیں ہے۔ بلکہ اسے ہم کو تخلیق یا تصنیف سے کم نہیں سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح ہمارے ہاں جس قدر زبان اور لسانیات کے حوالے سے کام ہوا ہے وہ بھی ترجموں ہی کی بدولت سامنے آیا ہے۔

مردہ زبان

مندرجہ بالا باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جس زبان میں تعلیم و تدریس نہ ہو، جس میں ادب تخلیق نہ ہو رہا ہو، جس میں مذہبی اور دینی کام نہ کیا جا رہا ہو، جو تہذیبی اور ثقافتی رویوں کی ترجمانی نہ کر رہی ہو، جس میں اصلاح زبان رک چکی ہو، نئے نئے الفاظ اور تراکیب، اصطلاحات جس کا جز و نہ بن رہے ہوں وہ زبان آہستہ آہستہ مردہ ہوتی جائے گی اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اس کے بولنے والے ہوتے ہوتے ناپید ہوتے جائیں گے۔ خلیل صدیقی کے بقول:

''عرفِ عام میں مردہ کہلانے والی زبانیں ماضی ہی کے عصری تقاضے پورے کرنے کا وسیلہ نہ رہی تھیں، ان کے ذریعہ سے دورِ جدید کے یکسر مختلف گونا گوں اور پیچیدہ تقاضوں

سے عہدہ برآ ہونے کی توقع عبث ہے چنانچہ ان کو بول چال میں استعمال کرنے یا یا ان کے احیا کی کوئی گنجائش نہیں۔"(۶)

زبانیں بننے اور ختم ہونے کا عمل ایک دو سال پر نہیں بلکہ صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلسل لسانی عمل ہے جس کے نتیجے میں زبانیں آہستہ آہستہ متروک ہوتے ہوتے مردہ ہوتی چلی جاتی ہے یا پھر ترقی کرتے کرتے ایک مقبولِ عام اور ہردلعزیز زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

"کوئی زبان اچانک نہیں مرجاتی اور نہ اس کی جگہ کوئی دوسری زبان اچانک پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان کی خاص چیزیں اس زبان کے قوانین اور قواعد ہوتی ہیں اور عوام کے گہرے رشتے اور الفاظ کے حسین ذخیرے ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں جب تک زبان کے ساتھ ہیں زبان کی موت ناممکن ہے۔"(۷)

عوام اچانک کوئی زبان اختیار نہیں کرتے اور نہ اس پر قادر ہیں کہ سب لوگ اچانک ایک زبان کو بالکل چھوڑ کر دوسری زبان بولنے لگ جائیں۔ زبان ایک سماجی سرگرمی ہے۔ اور اس کا انسانی معاشرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ زبان کا تعلق سیاسی اور سماجی کشمکش کے ساتھ ہے۔ انھیں سیاسی کمزوریوں کی بنا پر بعض اوقات زبانیں روبہ زوال ہونا شروع ہوتی ہیں۔ اسی طرح بہت سی زبانیں آج تاریخ کی گرد میں اٹی ہوئی دنیا سے پوشیدہ ہو چکی ہیں۔ ان کے لسانی نظاموں کو بھی بھلا دیا گیا ہے۔

قواعد

قواعد کسی زبان کو زندہ رکھنے اور اسے تراشنے اور سنوارنے میں نہایت اہم ہے۔ قواعد صرف کتابیں معلومات اور اصولوں اور ضابطوں کا نام نہیں ہے بلکہ قواعد چلتی پھرتی اور بولی جانے والی زبان سے متعلّق ہے۔ ماہرین قواعد کا کام زبان کے اصولوں اور ضابطوں کی ترتیب اور اصلاح ہے۔ یہ اصول بولے جانے والی زبان سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بولے جانے والی زبان کے برخلاف اصول وضع کر کے لوگوں کو زبردستی مجبور کیا جائے کہ وہ ان اصولوں اور قاعدوں کی پابندی کریں۔ ماہرین قواعد جملوں، جملوں کی بناوٹ اور ساخت، جملوں کے اجزا، جملوں کی ترکیب، جملوں میں ترتیب دیے گئے الفاظ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ جملوں کی اقسام، فعل، حرف، اسم، فاعل، موضوع وغیرہ کے مباحث کا مطالعہ بھی قواعد کی ذیل میں آتا ہے۔ ماہرین قواعد ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ کون کون

سے جملے قواعدی اصولوں کے تحت ہیں اور کون سے قواعد کے مطابق نہیں ہیں۔ان سب باتوں کے لیے سادہ اور آسان فہم قواعد کی تشکیل زبان کی صفائی اور ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے۔

جملے میں افعال کون سے ہیں، کون کون سے افعال کی مفعولی حالت ممکن ہے، صفات کون کون سی ہیں اور کس کس طرح جملے میں آسکتی ہیں۔اسم اور فعل جملے میں کس ترتیب سے آتے ہیں۔صفاتی زمانی کیسے آتی ہیں اور صفات جسمانی کیسے اور کچھ صفات میں استثنا بھی ہے۔ماہرینِ قواعد کا فرض ہے کہ وہ جملوں میں موجود قواعد کے اصولوں کی بھی وضاحت کریں کہ جملے کس اصول کی بنا پر بنے ہیں۔اور اگر کسی جملے میں کوئی الجھاؤ ہے تو کس اصول کے تحت اسے سمجھا جاسکتا ہے۔اگر کسی جملے میں ابہام ہے تو یہ ابہام دور کرنا یا اس کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے۔یہ ابہام کیوں پیدا ہوا۔بعض اوقات جملے کی ظاہری ہیئت دیکھ کر معانی مراد نہیں لیے جاتے بلکہ جملے کی تہہ میں جا کر پھر دیکھا جاتا ہے کہ اس سے کیا معانی اخذ ہو رہے ہیں۔جملوں میں پائے جانے والے اختلاف کو سمجھنا اور ان کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔بعض جملے ساخت میں یکساں ہوتے ہیں مگر ان کے قواعدی اصولوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ماہرینِ قواعد کو ایک جیسی ساخت رکھنے والے ان جملوں کی شناخت کے اصولوں کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہیے۔

جملوں کے پیچھے قواعدی اصولوں کا ایک پورا نظام کام کر رہا ہوتا ہے جسے سیاق وسباق کے حوالے سے واضح کیا جاتا ہے۔معروف اور مجہول جملوں کے فرق پر نظر رکھی جاتی ہے۔مثال کے طور پر وہ یہ کام کرتا ہے۔۔۔یا۔۔۔اس سے یہ کام ہو جاتا ہے۔ان جملوں میں بڑا فرق ہے۔بظاہر ایک عام سی بات کو دو طریقوں سے بیان کیا گیا ہے مگر حقیقت میں دونوں جملوں کی ساخت الگ الگ ہے۔ قواعد کے ماہر کے لیے ضروری ہے کہ وہ جملوں کی ہر طرح کی ساخت اور تجزیے کی اہلیت رکھتا ہو۔

زبان اور ابلاغ

لسانیات زبان کا مطالعہ کے دوران زبانوں کی مکمل تشریح، تفہیم اور توضیح کرتی ہے۔لسانیات ایسا اس لیے کرتی ہے کہ زبان کے بارے میں کوئی غلط تصور یا کوئی اور غلطی پیدا نہ ہو جائے اور جس زبان پر لسانیاتی کام ہو رہا ہوتا ہے اس کی ماہیت پر غور وخوض بھی لسانیات کی ذمہ داری ہے۔ماہرِ لسانیات کسی زبان پر کام کرتے ہوئے کئی حوالوں اور پہلوؤں سے اس زبان کو دیکھتے ہیں۔اس مقصد کے لیے کبھی اسلوبیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے یہ مطالعہ محض اسلوبی مطالعہ نہیں ہوتا بلکہ روایت سے ہٹ کر زبان کا ان زاویوں سے مطالعہ کرتا ہے جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زبان کس طرح اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔

الفاظ وتراکیب کس انداز میں باہم مل کر جملہ سازی کرتے ہیں، اور جملے مل کر کس طرح متن کو تشکیل دیتے ہیں اور متن سے کس طرح معانی کا ادارک اور ترسیل ہوتی ہے۔ زبان کا سب سے اہم پہلو اس کا ابلاغی پہلو ہوتا ہے کیونکہ زبان اگر اپنے مقصد کے ابلاغ کے لیے ناکام رہتی ہے تو اس سے وہ مقصد فوت ہو جاتا ہے جس کے لیے وہ متن ترتیب دیا گیا ہوتا ہے۔

زبان کے ابلاغ میں کہاں کہاں مسائل کا سامنا ہے۔ کون کون سے لفظ اور تراکیب ایسے ہیں جو مطالب کی ترسیل میں رکاوٹ کا سبب بن رہے ہیں۔ لسانیات کا کام ان تمام رکاوٹوں اور اسباب کو دیکھنا، ان کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ زبان کے حوالے سے بحثیں دراصل زبان میں ترقی کا سبب بنتی ہیں۔ ماہر لسانیات اس لسانی عمل میں تاریخی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔

ماہرِ لسانیات جب زبان کے حوالے سے تحقیق کر رہا ہوتا ہے تو اس بارے میں پہلے سے موجود لسانی اصولوں کو بھی سامنے رکھتا ہے اور اگر کوئی نئے زاویے اور اصول بنانے پڑیں تو وہ کچھ اصول وضع کر کے اپنے انداز سے بھی زبان کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اس مشاہدہ میں وہ زبان بولنے والوں کو ہی پیش نظر رکھتا ہے۔

وہ زبان کے حوالے سے ان عوامل پر بات کر سکتا ہے جو زبان کے فصیح اور بلیغ ہونے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ ان زبانوں کے مصوتوں کو بھی سامنے رکھتا ہے جو زیر مطالعہ زبان پر اثر انداز ہوئے ہیں یا مختلف اوقات میں اس زبان کا حصہ بنتے رہے ہیں۔ غیر زبانوں کے الفاظ کے لیے اسے ان الفاظ کا اصل زبان کے حوالے سے بھی مطالعہ کرنا پڑے گا کیونکہ ابلاغ زبان کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ بولنے والا آخر ایسا لفظ کیوں لے کر آیا ہے جو کہ غیر زبان کا لفظ ہے، کیا اس زبان میں اپنا کوئی لفظ اس بات کی بہتر ترسیل اور ابلاغ کے لیے موجود نہیں تھا کہ اسے دوسری زبان کا سہارا لینا پڑا ہے۔

زبانوں کا مطالعہ اور تحقیق کرتے ہوئے ماہرِ لسانیات کا موضوع شروع سے لے کر آخر تک صرف زبان ہی رہتا ہے اور یہ کام سرسری مطالعے کے بجائے گہری بصیرت اور وسیع مطالعے ہی سے ممکن ہے کیونکہ بعض اوقات ظاہری اور سرسری مطالعہ اسے کسی غلط نتیجے تک بھی لے جا سکتا ہے۔ زبان کے مطالعہ اور اس کے ابلاغ کے لیے ضروری ہے کہ ماہر لسانیات زبان کا مطالعہ کرتے وقت اس دور کے سماجی اور تاریخی عوامل کو بھی سامنے رکھے اور اس کے ساتھ ساتھ مذہب اور اساطیر کو بھی نظر انداز نہ کرے۔

حوالہ جات

۱۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۴۳، ۴۴

۲۔ عبدالحق، مولوی، مشمولہ ہندوستانی زبان مرتبہ محمد قاسم نوری، لاہور، درد اکادمی، دوسری بار، ۱۹۶۹ء، ص ۸۱

۳۔ سہیل وحید، صحافتی زبان، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱۷

۴۔ آل احمد سرور، پروفیسر، مجموعہ تنقیدات، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، س ن، ص ۹۵ ۷

۵۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، مغرب سے نثری تراجم، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹

۶۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۴۵

۷۔ مقدمہ از شکیل الرحمٰن، زبان اور کلچر، سرینگر کشمیر، شاہین بکسٹال، ۱۹۵۸ء، ص ۱۷

زبان ـــــ ذریعۂ ابلاغ

زبان بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ ہر آدمی زبان سے واقف ہے اور ہر نوع ہر قبیل کا فرد کسی نہ کسی صورت اس سے فیض یاب ہوتا نظر آتا ہے۔ مگر اس کی اصلیت، ماہیت، حقیقت اور طریق کار کے حوالے سے صرف ماہرین لسانیات ہی غور وفکر کرتے ہیں۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی کیا اہمیت ہے اور یہ سماج میں کیا کردار ادا کرتی ہے اور اگر زبان نہ ہو تو ذرائع بیان اور اظہار کے وسیلے کتنے مسائل کا شکار ہو جائیں گے۔ اسی لیے اگر کوئی شخص تلاشِ روزگار یا کسی اور وجہ سے کسی ایسے ملک میں چلا جاتا ہے جہاں کی زبان کی الف بے سے بھی وہ واقف نہیں تو پھر اسے زبان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ زبان ترسیلِ خیالات اور اظہارِ بیان کے لیے کتنی ناگزیر ہے۔ پھر وہ سوچتا ہے کہ کاش میں نے یہاں آنے سے پہلے یہاں کی زبان کے بارے میں کچھ نہ کچھ سیکھ لیا ہوتا۔

زبان ایک سادہ سا لفظ نہیں ہے بلکہ اس میں گہرائی اور پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ بہت سے اُلجھے ہوئے صوتیاتی دھاگے اس کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جنھیں لسانیات سلجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ زبان سماج میں کئی حوالوں سے اپنا جاندار کردار ادا کرتی ہے اور اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کرتی رہتی ہے۔ ایک انسان کا صبح جاگنے سے لے کر سونے تک بے شمار قسم کی اصوات سے واسطہ پڑتا ہے۔ مختلف ماہرین لسانیات نے اس کے اس رویے کو مختلف انداز اور اقسام میں بیان کرنے کی کوشش

کی ہے۔

ڈیوڈ کرسٹل کے مطابق زبان کے دو پہلو ہیں ایک پہلو تفاعلی (functional) اور دوسرا رسمی (formal)۔ تفاعلی یا فنکشنل پہلو وہ ہے جو ہمارے سماج سے تعلق رکھتا ہے اور سماج میں استعمال ہوتا ہے جبکہ فارمل پہلو وہ ہے جس میں زبان کی ساخت کے بناوٹ کا طریقۂ کار سے بحث کی جاتی ہے۔ (1)

زبان کے بنانے اور اس کے صوتی وقواعدی اصول وضع کرنے کا بنیادی مقصد اپنی بات دوسروں تک کامل انداز میں پہنچانے کی کوشش ہے۔ زبان کا ایک اہم کام ترسیل ہے۔ یہ ترسیل انسان کے جذبات، خیالات، احساسات، سوچ، فکر اور نظریے کی ہوسکتی ہے۔ زبان وہ مقبول ترین ذریعہ ہے جس میں ترسیل خیالات کا عمل عمدگی اور آسانی سے پورا ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا ذریعہ خیالات واحساسات کی ترسیل اس انداز میں سرانجام نہیں دے سکتا۔

زبان کے ذریعے ہم اپنی معلومات کو دوسروں تک پہنچانے کا کام کرتے ہیں پیغام رسانی کا کام لیتے ہیں۔ زبان کا ایک حصہ کارآمد اور روزانہ کی ضرورت کا ہے جو معلومات کی ترسیل اور مدعا نگاری کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر اس کا دوسرا حصہ ہماری غیرارادی اور لاشعوری آوازوں پر مشتمل ہوتا ہے جو ہر وقت کسی نہ کسی صورت میں روبہ عمل رہتا ہے۔ غیرارادی آوازیں نکالنا، گلا صاف کرنا، کھنکھارنا، کھانسنا، ڈکارنا، خراٹے لینا، فراٹے بھرنا، چھینکیں اور ہچکیاں لینا، ناک اور منہ سے سانس لینے کی آواز، ناک سے خارج ہونے والی مختلف آوازیں، درد سے کراہنے، چیخنے یا کوہنے کی آواز، نزلہ زکام میں مختلف آوازیں، سردی میں دانت بجنے کی آواز، سیٹی کی آواز، بھاگنے کی آواز، گرنے کی آواز، کودنے کی آواز، رونے کی آواز، سسکنے کی آواز، ہنسنے کی آواز، قہقہہ، خود کلامی، ٹھنڈا گرم پانی متاثر ہو کر نکلنے والی آوازیں، چلتے وقت قدموں کی آواز، کھاتے وقت چپ چپ کی آوازیں، گرم چیز پیتے وقت چسکیاں لینے کی آواز۔ یہ سب آوازیں فطری، غیراختیاری، غیرارادی اور لاشعوری پہلو سے متعلق ہیں مگر یہ آوازیں بھی مکمل طور پر بے معنی نہیں ہیں۔ ان آوازوں سے بھی مختلف اوقات میں مختلف پیغام دوسروں تک پہنچتا ہے چاہے وہ غیرارادی ہی کیوں نہ ہو۔ چھینک سے موجودگی کا پتہ چل جاتا ہے۔ کھانسنے، تیز تیز سانس لینے سے بیمار ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ ہانپنے سے کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر ان آواازوں کو ہو بہو حرفوں میں محفوظ کرنا مشکل ہے۔

''شاعرانہ ہیئت کے ذریعہ شاعر اور قاری میں افہام اور ترسیل کا رابطہ قائم ہوتا ہے۔ شاعر

ہیئت کے ذریعے اپنے تجربے کا بیان کرتا ہے۔ شاعرانہ ہیئت قاری کو مخصوص نہج پر محسوس کرنے اور سوچنے پر آمادہ کرتی ہے۔"(۲)

جہاں تک اشاروں کی زبان کا تعلق ہے تو ہر انسان روزانہ اشاروں کو استعمال کرتا ہے۔ کبھی اثبات کے لیے کبھی نفی میں سر ہلا کر جواب دیتا ہے۔ جسمانی حرکات، آنکھوں کا اشارہ، ہاتھ کے اشارے، سر کے اشارے، چہرے کے تاثرات، آنکھوں سے گھورنا، آنکھ مارنا، آنکھیں مٹکانا، لبوں کی مسکان، مسکراہٹ، یا آنکھوں میں نمی یا شرارت، بھنویں سکیڑنا، آنکھیں پھیلانا، نتھنے پھلانا، اسی طرح سینکڑوں اشارے ہیں جنھیں ہم اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مگر اس اشاراتی زبان کے لیے متکلّم اور سامع کا آمنے سامنے ہونا ضروری ہے۔ یہ زبان کا بصری پہلو ہے۔ اگر ایک انسان دیوار کے پیچھے ہے یا نظروں سے اوجھل ہے، چاہے کہیں نزدیک بھی موجود ہو وہاں اشارہ کام نہیں کرے گا۔ وہاں پھر صوتیات کا پہلو ہی کارآمد ثابت ہوگا، یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے خیالات کی ترسیل کے لیے زبان سے ہٹ کر دوسرے ذرائع بھی موجود ہیں مگر ان کی حیثیت زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ترسیلی نظام میں صوتیات کی حیثیت مقدم ہے مگر تمام اصوات نہیں بلکہ صرف وہ اصوات جو دانستہ اور شعوری ہیں۔ نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

"انسانی سماج، گھر کے اندر ہو یا باہر کا، اسکول کا ہو یا محلے کا، کسی طبقاتی یا پیشہ ورانہ سطح کا ہو یا کسی سیاسی، معاشی، اور تکنیکی سطح کا، شہری ہو یا دیہی اس کی سطح اور اس کے ہر دائرے میں اظہار وابلاغ کو باالفاظ دیگر زبان کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔"(۳)

انسانی سماج میں جہاں رشتے، تعلق زبان کے ساتھ باہم ملتے جڑتے اور بنتے رہتے ہیں لسانی رویوں (behavior) کو بنیادی اہمیت حاصل رہتی ہے۔ کیونکہ معاشرہ انسانی جذبات کی عکاسی اور ترسیل جذبات کے ساتھ ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتا ہے۔ زبان انسانی مزاجوں اور نفسیات کی ترجمان ٹھہرتی ہے۔ لطیف سے لطیف خیال، اور باریک سے باریک نکتہ، بڑے سے بڑا فلسفہ، انسانی ذات سے جڑے اچھے برے خیالات، نظامِ زندگی سے جڑے نظریات، مذہب اور اخلاقیات سے جڑے تصورات، ان سب کی ترسیل کے لیے صرف اور صرف زبان ہی جاندار کردار ادا کرتی ہے۔ زبان تحریری ہو یا تقریری ہر دو حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔

خیالات کی ترسیل کے لیے اصوات کے ساتھ ساتھ ایک بات اور اہم ہے اور وہ ہے بولنے

والے کا لب ولہجہ۔ ایک تو اسلوب اور دوسرا اُس کی اصوات کے اخراج کا انداز، یہ انداز عمر، حالات، اسٹیٹس، مزاج، پیشے اور تعلیم کی مطابقت کے حوالے سے فرد سے فرد تک تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ایک ہی جملہ مختلف انداز میں بولا گیا ہو تو وہ جدا جدا معانی کی ترسیل کا باعث بنتا ہے۔ مختلف سماجوں اور تہذیبوں کا سراغ بھی زبان ہی کے ذریعے ملتا ہے۔ انسان اور کائنات کی معلوم تاریخ بھی زبان ہی میں بیان ہوتی ہے۔

بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے مگر جن علاقوں میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں صرف ایک ہی زبان سے واقفیت کافی نہیں ہوگی بلکہ ضرورت ہوگی کہ آس پاس بولے جانے والی دوسری زبانوں سے بھی واقفیت ہو اور وہ بھی اتنی کہ بولنے اور سمجھنے میں۔ بقول نظیر صدیقی:

''انسان کی سماجی ضرورتیں اسے محض پہلی یا مادری زبان ہی کا محتاج نہیں بناتیں بلکہ کسی اور زبان یا زبانوں کو بھی وسیلہ بنانے پر مجبور کرتی ہیں۔ جس ملک میں ایک سے زیادہ زبانیں مروج ہوں، اس میں بہت سے افراد دو یا دو سے زیادہ زبانیں جانتے اور حسبِ ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ ایسے ملکوں میں ایک سے زیادہ زبان کا سہارا لینا ناگزیر ہے، کاروباری ضرورت کے لیے بھی اور تعلیمی، ادبی اور علمی تقاضوں کے تحت بھی۔''(۴)

ہمارا ملک پاکستان بھی ایک ایسا ہی ملک ہے جہاں تقریباً ہر شہر اور علاقے میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ پہلے نمبر پر اردو چونکہ قومی زبان ہے اس لیے اس سے آگاہی ضروری ہے کیونکہ دفتروں اور تعلیمی اداروں میں اردو کے بغیر گزارا نہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تمام پروگرام اُردو کے بغیر نہیں سمجھے جاسکتے۔ دوسرے نمبر پر انگریزی کی بنیادی معلومات بھی ہونی چاہئیں کیونکہ انگریزی پاکستان کی سرکاری زبان ہے۔ عدالتی، دفتری تقریباً تمام کام انگریزی میں ہوتا ہے۔

جہاں تک پاکستان کے مختلف صوبوں کا تعلق ہے تو پنجاب میں اُردو کے ساتھ ساتھ پنجابی، سرائیکی اور ہریانوی، کرنالی وغیرہ جیسی مختلف بولیوں سے آشنائی بھی ضروری ہے۔ اسی طرح سندھ میں اُردو کے ساتھ ساتھ سندھی زبان، سرائیکی زبان اور ہریانوی کی مختلف بولیوں سے واقفیت ضروری ہے۔ خیبر پختونخواہ میں اردو زبان کے علاوہ پشتو زبان، سرائیکی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بلوچستان میں اردو، بلوچی اور پشتو کا جاننا ضروری ہے۔ گلگت بلتستان میں اُردو اور بلتی زبان کے علاوہ کئی زبانیں

بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ کشمیر میں اُردو کے علاوہ کشمیری بولی جاتی ہے۔

شروع ہی سے زبان کو مذہبی تبلیغ اور نشرواشاعت کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جیسے جیسے زبانیں ترقی کرتی گئیں نشرواشاعت کے وسیلے بھی بڑھتے چلے گئے۔ اخبارات، رسائل، جرائد صحائف، تھیٹر، اور پھر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجاد اور ارتقا۔

زبان کا ترسیل وابلاغ کے لیے موجودہ دور میں ایک اور اہم کردار صحافتی اور نشریاتی قسم کا ہے۔ بیسویں صدی کی نویں دہائی تک نشریاتی چینل کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ زیادہ تر ایک چینل ہوا کرتا تھا جو کہ قومی و ملکی خبریں، تفریحی پروگرام، ملکی نظریات، اشتہارات، کے لیے کام کیا کرتا تھا مگر اب نشریاتی چینلز کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی ترقی ملی کیونکہ یہ تمام چینل ظاہر کہ کسی نہ کسی زبان کو بطور میڈیم استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان میں زیادہ تر چینلز اُردو زبان ہی کو ذریعہ اظہار بناتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ پنجابی، سرائیکی، پشتو چینلز بھی موجود ہیں جن میں نشریات علاقے کی مناسبت سے پشتو، سندھی، پنجابی اور سرائیکی زبان میں کی جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف علاقوں میں ریڈیو اسٹیشن بھی مختلف زبانوں کو اظہارِ بیان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

انٹرنیٹ بھی زبان ہی کی شعبدہ بازی کی وجہ سے اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ مختلف ممالک میں انٹرنیٹ انگریزی کے ساتھ وہاں کی ملکی زبانوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پاکستان میں انٹرنیٹ کا زیادہ تر استعمال انگریزی زبان ہی میں کیا جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو بھی انٹرنیٹ کی زبان کے طور پر استعمال کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ بہت سے لوگ تو اردو زبان کو رومن میں لکھ کر اس کا استعمال کر رہے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کہ اردو کو اس کے اپنے رسم الخط میں بھی لکھتے ہیں۔

انٹرنیٹ کے حوالے سے ''فیس بک'' ایک مشہور ومعروف ویب سائٹ ہے جس کو روزانہ کروڑوں لوگ استعمال کرتے ہیں اور اپنی اپنی زبانوں کو فروغ دیتے نظر آتے ہیں۔ زبان کے مختلف روپ اور بولیوں کے ذائقے فیس بک پر ملتے ہیں۔ جہاں ان ویب سائٹس سے زبانوں کے اظہار کو استناد ملا ہے وہیں شعر وادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ بے شمار الفاظ مختلف زبانوں کا حصہ بنے اور بن رہے ہیں۔ تحریر اور اظہار کے وسیلوں کی وجہ سے زبانیں ایک دوسرے کے قریب آ رہی ہیں۔

تخلیق کے بعد اس کے ابلاغ، ترسیل اور افہام کی اہمیت اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے۔ تفہیم بغیر

ابلاغ کے ممکن نہیں جبکہ ابلاغ بغیر تفہیم کے ہوسکتا ہے، کیونکہ ابلاغ نہیں ہوگا تو تفہیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بقول انیس ناگی:

''لسانی فنون میں ابلاغ، افہام یا ترسیل معانی کو عموماً بنیادی حیثیت دی جاتی ہے۔ مروجہ اردو تنقید میں ابلاغ اور افہام متبادل معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔''(۵)

ایک قاری جب کسی ادب پارے کو پڑھتا ہے تو ابلاغ کا عمل مکمّل ہو جاتا ہے، تفہیم کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ اس پر غور و خوض کرے یا اس کا تجزیہ کرے۔ اور اگر ابلاغ اور تفہیم میں کوئی لسانی رکاوٹ آڑے آرہی ہو تو یہ ابہام کی صورت میں ہوگی۔ کیونکہ ادبی لفظوں کے ساتھ کئی معنویاتی اکائیاں جڑی ہوئی ہوتی ہیں اب یہ قاری کا کام ہے کہ وہ کس معنویاتی سطح تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

عام بول چال میں ابلاغ اور تفہیم کا عمل آسان ہوتا ہے کیونکہ عام بول چال میں ادبی زبان کے برعکس بولتے اور لکھتے وقت زبان کا استعاراتی پہلو پیش نظر نہیں ہوتا نہ اس میں علامتیں ہوتی ہیں اور نہ کنائے بلکہ سیدھے سادے انداز میں بات کہہ دی جاتی ہے۔

ادب میں ادیب اپنے احساس، تصور یا تخیّل کو الفاظ کا پیکر عطا کر کے اسے ادب پارے میں تبدیل کر دیتا ہے، قاری اسے کس حد تک سمجھتا ہے یہ قاری کی لسانی اہلیت اور لفظی قابلیت پر منحصر ہے، معنیات کا نظام یہاں اہم کردار کا حامل ہوتا ہے، اگر قاری کسی وجہ سے ادیب کے ادبی تجربے میں شامل نہیں ہو پاتا، تو اس سے ادیب کا بنایا ہوا لسانیاتی معنوی نظام متاثر ہوتا ہے۔ بقول انیس ناگی:

''اگر قاری الفاظ کو تاثرات میں منتقل نہیں کر سکتا تو شعری تخلیق اس کے لیے معمّہ ہے۔ اس کے لیے ابلاغ، افہام، اور ابہام کا مسئلہ اس نارسائی سے جنم لیتا ہے۔''(۶)

خاص طور پر شاعری میں اس بات کی اہمیت ہے کہ الفاظ اور ان کی معنویاتی سطح کو کس طرح ایک رکھا جائے کیونکہ شاعری میں ایک ہی لفظ بعض اوقات کئی معانی دے رہا ہوتا ہے اسی بات سے ابہام پیدا ہونے کا خدشہ سر اٹھاتا ہے جس کی وجہ سے تفہیم کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ شاعری جس میں لفظ اور معنی کے درمیان تعلّق زیادہ قریب کا ہو، ابلاغ میں آسانی ہوگی اور تفہیم کا عمل بھی اسی قدر آسانی سے مکمّل ہو سکے گا۔ اسی طرح نثر میں لسانی اکائیوں کی ترتیب سے معانی کے ابلاغ اور تفہیم میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

بقول انیس ناگی:

''تخلیق شعر میں لفظ کے استعمال کی بنیادی غایت تجربے کی ترسیل اور تشکیل ہے۔ لفظ شاعر کا بنیادی حربہ ہے۔ اسی کے ذریعہ وہ تجربے کے خط وخال معین کرتا ہے اور یہی لفظ قاری کے لیے افہام کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ تخلیق شعر میں لفظ شاعر کی واردات کا ترجمان ہوتا ہے بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ لفظ بذات خود شاعر کی واردات ہوتا ہے۔''(۷)

یہاں پر لفظ دو قسم کے کام کر رہے ہوتے ہیں ایک تو تجربے کا بیان اور دوسرا اس تجربے کی ترسیل۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ الفاظ نہ صرف یہ کہ واردات کو تحریری یا تقریری قالب میں ڈھالنے کا کام کرتے ہیں بلکہ یہ اس تجربے کو ترسیل کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں، بعض اوقات تجربے کی بہتر ترسیل کے لیے شاعر تشبیہات، استعارات اور علامات سے بھی کام لیتا ہے۔ علامت کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے بڑی اور پوشیدہ باتیں آسانی سے کہہ دی جاتی ہیں۔

علامتیں انسانی جذبات اور احساسات کا ایک ایسا انفرادی اور فنی ذریعۂ اظہار ہے کہ جس میں بڑی سے بڑی بات صرف ایک لفظ یا جملے میں ادا کر دی جاتی ہے۔ علامات تخلیقی تجربے کی ترسیل کا جامع، انوکھا اور مؤثر ذریعہ ہیں۔ ہر آواز کے لیے ایک نشان مقرر ہے، یہ نشانات کی تشکیل ایک دن میں مکمّل نہیں ہوتی بلکہ اس میں کئی برسوں اور بعض اوقات صدیوں کا عرصہ درکار ہوتا ہے تب کہیں جا کر کسی آواز کے لیے کوئی نشان یا علامت رائج ہوتی ہے۔

''لفظ اور صوت میں وہی نامیاتی اصول کارفرما ہے جو شے اور معنی میں ہوتا ہے۔ لفظ کی صوت شے کی ماہیت کا اعلان کرتی ہے۔''(۸)

جب ہم کوئی لفظ بولتے ہیں تو آواز کے ادا ہوتے ہی، اس شے کا تصور ذہنوں میں آجاتا ہے۔ اسی بات کو ساسر نے علم نشانات قرار دیا تھا اور سیگنیفائر اور سیگنیفائیڈ کی بات کی تھی، جسے ہم اُردو میں دال اور مدلول کہتے ہیں۔ کہ جب ہم کسی ایک لفظ کو بولتے ہیں تو اس کا تصور فوری طور پر ذہن میں آجاتا ہے جو کہ ہم نے خود طے کیا ہوا ہے اور من مانا ہے، سیگنیفائر اور سیگنیفائیڈ میں کوئی منطقی جواز نہیں ہوتا۔

حوالہ جات

۱۔ ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے، ڈیوڈ کرسٹل، نئی دہلی، ترقی اردو بورڈ، ۱۹۸۸ء، ص ۶۴

۲۔ انیس ناگی، تنقید شعر، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص ۴۰

۳۔ نظیر صدیقی، زبان کیا ہے، ص ۴۷

۴۔ ایضاً، ص ۷۶

۵۔ انیس ناگی، شعری لسانیات، ص ۱۴۷

۶۔ ایضاً، ص ۱۶۰،

۷۔ انیس ناگی، تنقید شعر، ص ۴۹

۸۔ انیس ناگی، شعری لسانیات، ص ۱۸۰

زبان اور بولی میں فرق

ایک ہی علاقے میں ملتی جلتی مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں، انھیں بولیوں میں سے کوئی سی ایک بولی جسے عوام اور پڑھے لکھے طبقے کی توجہ زیادہ حاصل ہو تو وہ زبان کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور ترقی کرتے کرتے ایک معیاری زبان بن جاتی ہے۔

زبان کوئی ٹھوس اور معین چیز نہیں ہے ۔زبان میں مختلف اوقات اور مختلف علاقوں میں مختلف لسانی تجربات ہوتے رہتے ہیں انھیں تجربات کی وجہ سے زبان مختلف بولیوں کی شکل میں مختلف علاقوں میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ارتقا پذیر ہوتی رہتی ہے یہی فرق بولیوں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ماہرینِ لسانیات اسی فرق کو بنیاد بنا کر زبان کی بولیوں اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیتے رہتے ہیں یوں لسانی عمل زبان کی ترقی کے مختلف مراحل پر روشنی ڈالتا رہتا ہے۔

بولی کو انگریزی لفظ ڈائیلیکٹ Dialect کا مترادف ہے۔ اسے علاقائی تحتی بولی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کسی زبان کا مقامی روپ ہوتا ہے۔

ماہرینِ لسانیات فرد بولی (idio lect) کے ذریعے ہر شخص کی بولی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جن لوگوں سے ہم روزانہ ملتے ہیں انھیں اگر ہم سامنے نہ بھی دیکھیں تو انھیں ہم آواز سے لوگوں کو پہچان لیتے ہیں، کیونکہ ہر فرد کی بولی، لب ولہجہ اور انداز گفتگو دوسروں سے جداگانہ ہوتا ہے۔ وقت اور عمر کے

ساتھ ساتھ ہر شخص کی بولی اور لہجے میں بھی فرق آتا چلا جاتا ہے۔ بقول؛ ڈاکٹر گیان چند:

''ایک گٹھے ہوئے (compact) علاقے کی تمام فرد بولیوں میں ایک قدرِ مشترک ہوتی ہے۔ اگر فرد بولیوں کی یہ مقدرِ مشترک سمجھنے اور بولنے دونوں کی حد تک سو فی صدی یا تقریباً سو فیصدی ہے تو یہ فرد بولیاں ایک بولی کے تحت آتی ہیں۔ اگر ایک بڑے علاقے کی تمام فرد بولیوں میں یہ قدرِ مشترک کسی قدر کم ہو مثلاً ۶۰ یا ۷۰ فی صدی تو یہ ایک زبان کی کئی بولیوں کو پیش کرتی ہے۔ اگر یہ قدرِ مشترک بہت ہی کم ہے مثلاً دس بیس یا تیس فی صدی تو ظاہر ہے کہ ان فرد بولیوں میں ایک سے زیادہ زبانیں دخل پا گئی ہیں۔''(۱)

بولی مشترک زبان بولنے والے لوگوں پر انحصار کرتی ہے۔ بولی زبان کی وہ شاخ ہے جس کے بولنے والوں میں کوئی لسانی اختلاف نہ پایا جائے۔ اور یہ بولی عموماً ایک مخصوص علاقے تک بولی جاتی ہے۔ جہاں تک بولیوں کی بات ہے، بولی اس لیے بولی رہتی ہے کہ اس میں ادب تخلیق نہیں ہوتا، اسے ذریعہ تعلیم نہیں بنایا جاتا بلکہ یہ صرف بولنے کی حد تک ایک لہجے کی شکل میں سینہ در سینہ اور زبان در زبان اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ زبان اور بولی کے فرق کے حوالے سے ڈاکٹر رؤف پاریکھ لکھتے ہیں:

''لسانیات کی رو سے زبان اور بولی کی تعریف کا تعین اور ان میں تفریق کرنا اتنا آسان نہیں ہے کیوں کہ بعض اوقات دو زبانوں یا دو بولیوں کی سرحدیں اس طرح ملی ہوتی ہیں کہ ایک علاقے کی زبان یا بولی معمولی فرق سے دوسرے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ اور وہاں سے ایک نئی بولی کا خطہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور ان میں تکنیکی بنیادوں پر امتیاز قائم کرنا لسانیات کے ماہرین کے لیے بھی پریشان کن مسئلہ ہوتا ہے۔''(۲)

مختلف بولیوں میں سے ایک بولی زیادہ مشہور، قابلِ قبول اور شائستہ سمجھی جاتی ہے، اسے ہم کسی بولی کا شہری روپ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس بولی کو پڑھے لکھے بولتے ہیں وہ تراش خراش ہونے کے بعد زیادہ مروج ہوتی ہے اور عموماً لکھنے پڑھنے میں بھی اسی کو استعمال کیا جاتا ہے۔ شان الحق حقی لکھتے ہیں:

''ایک جمے ہوئے معاشرے میں ہر زبان کی ایک معیاری بولی ہوتی ہے اور کئی فروعی یا تحتی بولیاں جو اس کے ارد گرد رستی بستی ہیں۔ ایک انگریزی مصنّف ارنٹ وسل (Erntwistle) نے ان کا نقشہ یوں پیش کیا ہے کہ زبانوں کی ایک کھڑی تقسیم ہوتی ہے اور ایک پڑی

تقسیم۔ ڈیلیکٹ افقی یا پڑی تقسیم میں آتے ہیں، ان کا اختلاف جغرافیائی یا مقامی ہوتا ہے
جبکہ کھڑی یا عمودی تقسیم طبقہ واری ہوتی ہے۔''(۳)

بعض ماہرین کے مطابق ہر زبان کسی نہ کسی عہد میں بولی کے روپ میں موجود ہوتی ہے، اپنے آپ کو بناتی سنوارتی ہے اور رفتہ رفتہ زبان کی شکل اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ کچھ بولیاں جو زبان کی شکل اختیار نہیں کر پاتی رفتہ رفتہ ختم ہوتی چلی جاتی ہیں یا خود کو تبدیل کرتی رہتی ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں بولی ہی کی حیثیت میں زندہ رہتی ہیں۔ ان بولیوں پر دیگر علاقائی زبانوں اور لب و لہجے کے اثرات بھی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں بعض اوقات واضح فرق نظر آتا ہے اور بعض اوقات فرق اتنا معمولی ہوتا ہے کہ اسے زیادہ محسوس نہیں کیا جاتا۔

> ''ہر زبان میں بیک وقت متعدد رنگ نظر آتے ہیں۔ ہر لسانی علاقے میں سماج کے مختلف طبقوں کی بول چال میں تھوڑا تھوڑا سا فرق ملتا ہے۔ یہ طبقے پیشے، مشغلے، علم وفن، جنس (مرد، عورت)، مالی حیثیت اور تہذیب وثقافت وغیرہ کے لحاظ سے بنتے ہیں۔ ہر طبقے کے افراد کی گفتگو بھی ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہے۔''(۴)

زبان بولیوں کے مجموعے پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک زبان کی مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں۔

معیاری بولی

زبان کی سب سے اہم بولی کو معیاری بولی کہا جاتا ہے جو لوگوں کے ملنے جلنے تعلیمی زبان، اقتدار والوں کی زبان ہونے کی وجہ سے یکساں بولی جاتی ہے۔ اگر معیاری زبان کی اہمیت اور حیثیت کم ہونے لگی تو وہ ایک بولی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ معیاری زبان میں تعلیم وادب کی نشو ونما ہوتی ہے اور بولیوں میں ادبی تخلیق کم ہوتی ہے۔ معیاری زبان، ادبی اور کتابی زبان ہوتی ہے۔ لوگ اسے مجلسوں میں بولتے ہیں بولی تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کی بولی بھی یہی ہوتی ہے، اسی میں تہذیب وثقافت کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ لوگ اسی زبان میں پر تکلّف گفتگو کرتے ہیں۔ اسے شرفاء، پڑھے لکھوں اور بالا طبقوں میں بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ یہ مرکز کی اور ارد گرد کے علاقوں کی زبان بھی ہوتی ہے۔

پست معیار بولی

کم پڑھے لکھوں اور پست طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی بولی پست معیار بولی کہلاتی ہے

۔ یہ طبقہ زبان کو بگاڑ کر بولتا ہے۔ اس میں کاریگر، ہنر مند طبقہ، بازاری لوگ، کاروبار سے وابستہ لوگ، اور عام ٹھیلہ لگانے والے لوگ شامل ہوتے ہیں، جو اس قسم کی بولی بولتے ہیں، اسی لیے اس قسم کی بولی کو تحریری روپ دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

سوقیانہ بولی

بعض لوگ، بالخصوص لڑکے، بازاروں میں گھومنے پھرنے والے، آوارہ گردی کرنے والے اور شرارتیں، شیطانیاں اور چھیڑ چھاڑ کرنے والے لڑکے جو زبان بولتے ہیں اور جو روزمرہ استعمال کرتے ہیں۔ اسے سوقیانہ بولی کہتے ہیں۔ وہ لفظوں کو بگاڑ کر بدل کر انوکھے انداز میں بات کرتے ہیں۔

گنواری بولی

اسی طرح غیر مہذب اور گنوار طبقہ یا جہلا گنواری بولی بولتے ہیں۔ یہ کسی بھی زبان کی تبدیل شدہ اور مسخ شدہ شکل ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو ہر بات میں گالی دینے کی عادت ہوتی ہے وہ کسی کو پکارتے وقت، بات کرتے وقت زبان میں گالیوں کا استعمال ضرور کرتے ہیں جو ان کی بولی کو گنواری بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ چھوٹے سے بڑے تک گھروں میں اسی قسم کی بولی بولتے ہیں۔ جسے عموماً شرفاء سننا بھی پسند نہیں کرتے۔

عورتوں کی بولی

عورتوں کی بولی بھی معیاری زبان سے کافی مختلف ہوتی ہے، عورتیں گھروں میں مخصوص زبان بولتی ہیں جو انھیں عموماً وراثت میں اپنے ماں باپ سے ملی ہوتی ہے۔ عورتوں کا محاورہ اور روزمرہ مردوں سے کافی مختلف ہوتا ہے۔ اس حوالے سے دلی کی بیگماتی زبان جیسی کتاب سامنے آچکی ہے اس کے علاوہ مختلف مصنّفین نے خاص طور پر عورتوں کے محاورہ، لغت الفاظ، روزمرہ پر خصوصی کام کیا ہے۔ سید احمد دہلوی نے لغات النسا لکھی ہے۔ وحیدہ نسیم نے ایک کتاب بعنوان "اردو زبان اور عورت" لکھی ہے۔

انشا اور جان صاحب نے تو اس حوالے سے ریختی جیسی صنف متعارف کرادی جس میں مرد عورتوں کے جذبات ان کی بولی، محاورہ اور ان کے روزمرہ میں بیان کیا کرتے تھے۔

علاقائی بولیاں

بعض بولیاں اپنے علاقوں یا اضلاع کی بنا پر بھی پہچان رکھتی ہیں۔ جیسے ضلع کرنال کی بولی،

پانی پت کا لہجہ، بجنور کی بولی، سہارنپور کی بولی، دہلی کی بولی، لکھنو کی بولی، ہریانہ کی بولی، رام پور کی بولی، سونی پت کی بولی وغیرہ۔ اسی طرح پنجاب کے علاقوں میں بولے جانے والی اردو، کراچی کے مختلف طبقوں میں بولے جانے والی بولیاں، اندرونِ سندھ رہنے والے سندھیوں کا اردو کا لہجہ، پشاور اور کوئٹہ میں پشتو بولنے والوں کا اردو بولتے وقت لہجہ یہ سب ایک زبان کو مختلف بولیوں میں پیش کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ہریانہ، کرنال وغیرہ کے علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں اور ان کی اولادوں کی بولیاں اردو کی معیاری بولی سے قدرے مختلف ہیں۔

اُردو کے مختلف علاقائی روپوں میں بھوپالی اردو، کلکتے کی اردو، بمبئی کی اردو، کشمیری اردو، سورجاپوری اردو، دکنی اردو، بہار اور رام پور کی اردو، ڈھاکے کی اردو، پشاور کی اردو، لاہور کی اردو مشہور ہیں۔[۵]

اس وقت اُردو پاکستان کے تمام علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے مگر مختلف علاقوں کے لوگ اسے اپنی مادری زبان کے آمیزش کر کے جب بولتے ہیں تو اس کا ایک نیا لہجہ سامنے آتا ہے، جب پٹھان اردو بولتے ہیں تو ان کی بولی اُن لوگوں سے مختلف ہوتی ہے جو سندھی زبان، سرائیکی یا پنجابی زبان بولنے والے اردو بولتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کی بولی اور اصوات میں اپنی بولی اور علاقائی انداز شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کوئٹہ میں رہنے والے متوسط یا غریب طبقہ کے لوگ سردیوں کے موسم میں جب کام اور روزی کے سلسلے میں دوسرے علاقوں کا رخ کرتے ہیں تو وہاں وہ جس انداز میں اردو بولتے ہیں، وہ انھیں سے مخصوص ہے۔ یوں کوئٹہ میں بولی جانے والی اردو اپنا مخصوص لب و لہجہ رکھتی ہے۔

بولیاں ارتقا پذیر ہیں۔ انسان اور تہذیب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ بولیوں کا ارتقا بھی جاری وساری ہے۔ انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ بولیوں کا لسانی سفر بھی جاری رہتا ہے۔

اس وقت دنیا میں ۱۹۵ ممالک میں ۶۸۰۹ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بھارت میں ۴۳۳ کے قریب زبانیں مستعمل ہیں جبکہ اٹھارہ بڑی زبانوں کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ پاکستان میں زبانوں کی تعداد ۵۶ کے قریب ہے جبکہ ۱۸ زبانیں ایسی ہیں جن کا رسم الخط موجود ہے اور جن میں ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ ان زبانوں میں اُردو، بلوچی، براہوی، پشتو، سندھی، سرائیکی، پنجابی، کشمیری، پہاڑی، گوجری، ہندکو، بلتی، شنا، کھوار، توروالی، گاؤری، بروشسکی اور واخی جیسی زبانیں شامل ہیں۔[۶]

چترال میں کلاشہ، پالولہ، گاوری، ڈمیلی اور سونی وار، یدغہ، کھوار، دری (مڑاکلشٹی)، پشتو، گوجری، بشگالی وار، سریقولی، واخی اور کرغیز کو مادری زبانوں کی حیثیت حاصل ہے۔(۷)

پشتو

پٹھان قوم افغان اور پختون (پشتون) دونوں ناموں سے مشہور ہے۔ یہ مختلف قبیلوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان کی زبان پشتو یا پختو ایک پرانی زبان ہے۔ جو کہ ایک ہند یورپی زبان ہے۔ پشتون یا پختون اسے بولتے ہیں۔ براعظم ایشیا کے جنوب مغرب کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ پختونوں کے وطن میں کوہ سیاہ، ہزارہ، وادی سوات، وادی کاغان، پشاور، مردان، کوہاٹ، بنوں، وادئ کرم، شمالی وزیرستان، ڈیرہ اسمٰعیل خان، جنوبی وزیرستان شامل ہیں۔ زیادہ تر علاقہ پہاڑی ہے۔

زمانۂ قدیم میں پشتونوں کے وطن کو گندھارا کے نام سے بھی یاد کیا گیا۔ گندھارا سے مراد وہ علاقہ ہے جو دریائے کابل کی وادی سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی تہذیب اس وقت مشرق میں ٹیکسلا تک اور اور مغرب میں کابل سے آگے تک پھیل گئی۔(۸)

پشتو زبان بہت قدیم زبان ہے۔ اس کی قدامت کے بارے میں کئی دعوے کیے جاتے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چار ہزار سال سے زیادہ قدیم زبان ہے۔

"یہ زبان سنسکرت کی ماں ہے تاہم یہ صحیح طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ زبان کب اور کس طرح پیدا ہوئی۔ البتہ مستشرقین نے یہ ثابت کیا ہے کہ پشتو زبان کا تعلق مشرقی ایران میں مستعمل زبانوں سے ہے اور اس کی بنیاد قدیم ایرانی زبان اوستا پر رکھی گئی ہے، بعد میں دوسری زبانیں خاص طور سے عربی، فارسی اور سنسکرت اس پر اثر انداز ہوئیں۔"(۹)

سنسکرت سے پشتو کا رشتہ ہوتا تو اس کا رسم الخط ضرور سنسکرت سے متاثر ہوتا۔ جبکہ پشتو کا رسم الخط ابتدائی طور پر خروشتی تھا جو کہ دائیں سے بائیں لکھا جاتا تھا۔ موجودہ رسم الخط متفقہ رسم الخط ہے جسے باڑہ گلی کا رسم الخط کہا جاتا ہے، کیونکہ اسے باڑہ گلی میں منعقدہ ایک کانفرنس میں متفقہ طور پر طے کیا گیا ہے۔ پنجابی، سرائیکی، پشتو، بلوچی ہندکو اور سندھی کی بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر شمالی علاقہ جات میں بولے جانے والی زبانوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"بلتی، شینا، بروشسکی، کوہستانی، کھوار، واخی، ڈومکی، کاشغری اور ان کے ساتھ ساتھ فارسی، کشمیری، گوجری اور ہندکو بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اس طرح بلوچستان میں

براہوی زبان بھی ہے جبکہ خود پنجابی اور سرائیکی کے کئی لہجے ہیں۔"(۱۰)

یہ تخصیص صرف پاکستانی زبانوں کی حد تک ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں زبانوں کی یہی صورتِ حال ہے کہ وہ مختلف بولیوں میں منقسم ہیں اور ایک بولی دوسری بولی سے کسی نہ کسی حد تک مختلف لسانی خصوصیات رکھتی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ گیان چند، عام لسانیات، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۳ء، ص ۶۲

۲۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، پاکستانی زبانیں تحتی بولیاں اور قومی یکجہتی، مشمولہ تحقیق، سندھ یونیورسٹی جام شورو، شمارہ ۱۶، ۲۰۰۸ء، ص ۵۰

۳۔ شان الحق حقی، زبان کے معیار کا مسئلہ، اخبار اردو اسلام آباد، مئی جون ۲۰۱۴، ص ۳

۴۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، ص ۷۰، ۷۱

۵۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، پاکستانی زبانیں تحتی بولیاں اور قومی یکجہتی، ص ۵۸

۶۔ انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، پاکستانی زبانیں اور قومی یکجہتی، اخبار اردو اسلام آباد، جون ۲۰۱۰ء، ص ۲۱

۷۔ عنایت اللہ فیضی، ڈاکٹر، قومی یکجہتی اور شمالی علاقوں کی زبانیں، اخبار اُردو، اسلام آباد جون ۲۰۱۰ء، ص ۳۱

۸۔ محمد مدنی عباسی، پشتو زبان و ادب کی تاریخ، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۹ء ص ۱۵، ۱۶

۹۔ محمد مدنی عباسی، پشتو زبان و ادب کی تاریخ، ص ۵

۱۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، لفظ ۔۔ آقا، اخبار اردو اسلام آباد، جون ۲۰۱۰ء، ص ۹

زبانوں کے خاندان

زبانوں کے خاندان بہت زیادہ ہیں۔اس کی وجہ زبانوں کی بے شمار اقسام اور زبانیں بولنے والوں کے مختلف گروہ ہیں۔تاریخ سے قبل معلوم نہیں کتنی زبانیں معدوم ہو گئیں اور کتنی زبانوں نے کیا کیا چلن بدلے۔کسی بھی زبان کی تاریخ جتنی زیادہ پرانی معلوم ہوگی اتنا ہی اس کے خاندا کا تعین آسان ہوگا۔

ماہرینِ لسانیات نے کچھ زبانوں کے علاوہ متعدد زبانوں کو مختلف لسانی خاندانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔یہ تقسیم کبھی نوعیاتی حوالے سے کی جاتی رہی ہے اور کبھی نسبی حوالے سے۔کبھی عہد اور زمانے کے حوالے سے، کبھی مختلف تہذیبوں اور قوموں کے حوالے سے، اور کبھی یہ تقسیم براعظموں یا علاقوں کے حوالے سے کی جاتی رہی ہے۔

دنیا کی زبانوں کے مختلف گروہ

زبان کے مطالعہ نے جب سے سائنس کی حیثیت اختیار کی ہے اس وقت سے زبان کا علم رکھنے والے ماہرین نے دنیا بھر کی زبانوں کے حوالے قابلِ قدر کام کیا ہے۔چونکہ زبان کے ارتقا اور تاریخ کا تعلق انسان کے ارتقا اور تاریخ سے ہے۔تو جس طرح انسان کی تاریخ قدیم ہے اسی طرح زبان کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔انسان اپنی پیدائش کے بعد سے لے کر آج تک مختلف زبانیں

بولتا چلا آرہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہاں کئی پرانی زبانیں معدوم ہو چکی ہیں یا ان میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی ہیں وہاں نئی زبانوں کی دریافت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ابھی تک ہم اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہمارے ماہرین لسانیات کا مطالعہ دنیا میں بولے جانے والی تمام زبانوں کا احاطہ کر چکا ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ زبانیں چاہے قدیم ہوں یا جدید وہ مسلسل مختلف لسانی تغیرات سے دوچار رہتی ہیں۔ کچھ زبانیں ترقی یافتہ ہیں جن کے ذریعے سائنس و ٹیکنالوجی اور علم و ادب نے خوب ترقی کی ہے، کچھ زبانیں ایسی ہیں جو صرف بول چال ہی کی حد تک موجود ہیں۔ ان میں لکھائی پڑھائی کا چلن عام نہیں۔

جس طرح دنیا میں مختلف النسل انسان اور مختلف جغرافیہ اور بدلتے ہوئے موسم کے حامل علاقے موجود ہیں اسی طرح دنیا میں مختلف قسم کی زبانیں بولی، سمجھی اور لکھی جاتی ہیں۔ ماہرینِ لسانیات نے معلوم زبانوں کو ان کی باہمی مماثلت، مشابہت، باہمی ربط اور مشترک و ملتے جلتے قواعد کی بنا پر ان کی لسانی تقسیم کرتے ہوئے کبھی ان کو نسبی اور صورریاتی بنادوں پر تقسیم کیا گیا، کبھی یک رکنی، سبقلاحی، اشتقاقی بنیادوں پر۔

کبھی زمانے کی بنا پر، یعنی قدیم، وسطی اور جدید،
کبھی براعظموں کی بنا پر ایشیائی، افریقی، امریکی یوپی وغیرہ،
کبھی تاریخی اعتبار سے،
کبھی قواعد اور صرف ونحو کی بنیاد پر، کبھی ترکیبی (شمولی، امتزاجی، تصریفی) (تصریفی میں ہند یورپی، سامی اور حامی تین خاندان آتے ہیں) اور کبھی غیر ترکیبی، کبھی صوتیاتی، نحوی بنیادوں پر فِنک نے زبانوں کو آٹھ گروہوں میں تقسیم کیا:

اسکیمو، ترکی، جارجیائی، عربی، چینی، یونانی، ساموائی، subuja[1]

زبانوں کی خاندانی گروہ بندی

خاندانوں کے حوالے سے زبانوں کی تقسیم میں درج ذیل گروہ سامنے آتے ہیں:
امریکی خطہ، اسٹرک خطہ، افریقی خطہ، یوریشیائی خطہ، سامی خاندان، شمالی خطے کی زبانیں، بورال زبانیں، التائی زبانیں، تائی زبانیں تبت چینی خاندان، آسٹرو ایشیائی خاندان، دراوڑ

خاندان، ہندیورپی خاندان، یونانی، اطالوی، کیلٹک، بالٹک، سلافی خاندان، ہند ایرانی شاخ ،ایرانی، دردی کے علاوہ کچھ زبانیں ایسی بھی ہیں جن کا ابھی تعین ہونا باقی ہے کہ انھیں کس خاندان میں شامل کیا جائے۔

زبانوں کی قدیم تاریخ سے کسی حد تک جو صورت حال سامنے آتی ہے اس معلوم ہوتا ہے کہ سمیریائی ۴۰۰۰ ق م، قدیم مصری ۳۵۰۰ ق م، ہندیورپی تقریباً ۲۰۰۰ تا ۱۸۵۰ ق م، چینی ۲۰۰۰ تا ۱۵۰۰، دراوڑی دوسری صدی عیسوی، جنوبی قافی یا جارجی پانچویں صدی ق م، التائی آٹھویں صدی ق م، تبت برمی نویں صدی، یورالی تیرھویں صدی سے معلوم ہیں۔۱۸۲۲ء میں جرمن عالم ہمبولٹ نے دنیا میں زبانوں کے ۱۳ خاندانوں کی بات کی، پارٹی رِج نے ۱۰ کی، فریڈرک مُلر اور دوسرے کئی علما کے مطابق ۱۰۰ خاندان ہیں جب کہ جے. ڈبلیو. پاول نے ۱۸۹۱ء میں امریکہ ہی میں ۵۴ خاندانوں کی نشان دہی کی۔ سپیر نے ۱۹۲۹ء میں چھ بڑے خاندانوں کا ذکر کیا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں فرنچ اکیڈمی نے دنیا میں زبانوں کی تعداد ۲۷۹۶ بتائی ہے۔ گرے نے درج ذیل ۲۶ خاندان گنوائے ہیں:

۱۔	ہندیورپی	:	۱۳۲ زبانوں پر مشتمل ہے
۲۔	حامی سامی	:	۴۶ زبانیں
۳۔	یورالی	:	۳۲ زبانیں
۴۔	التائی	:	۳۴ زبانیں
۵۔	جاپانی، کوریائی	:	۲ زبانیں
۶۔	اسکیمو	:	۲۴ زبانیں
۷۔	کاکیشی	:	۲۶ زبانیں
۸۔	آئبیرو	:	۲ زبانیں
۹۔	مشرق قریب اور ایشیائی معدوم زبانیں	:	۲۹ زبانیں
۱۰۔	ہائپر بوری اور عتیق ایشیائی	:	۱۲ زبانیں

۱۱۔ بروشاسکی : ۱

۱۲۔ دراوڑی : ۲۶ زبانیں

۱۳۔ انڈومانی : ۱۲ زبانیں

۱۴۔ چینی تبّتی ۱۱۵ زبانیں

۱۵۔ لائی : ۱

۱۶۔ آسٹروایشیاٹک : ۵۲ زبانیں

۱۷۔ ملایاپولینشیائی : ۲۶۳ زبانیں

۱۸۔ پاپوائی : ۱۳۲ زبانیں

۱۹۔ آسٹریلیائی : ۹۶ زبانیں

۲۰۔ ٹسمانیائی : ۵ زبانیں

۲۱۔ سوڈان گنی : ۴۳۵ زبانیں

۲۲۔ بانتو : ۸۳ زبانیں

۲۳۔ ہائن ٹاٹ، بش مین : ۶ زبانیں

۲۴۔ شمالی امریکہ : ۳۵۱ زبانیں

۲۵۔ میکسیکواوروسطی امریکہ : ۹۶ زبانیں

۲۶۔ جنوبی امریکہ : ۸۳۷زبانیں[۲]

ہندیورپی خاندان

زبانوں کے خاندان میں ہندیورپی خاندان کوایک لسانی اہمیت حاصل ہے۔پوری دنیا میں بولی جانے والی زبانوں میں سے اکثر اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔اس خاندان سے وابستہ زبانوں میں لسانی ادبی، علمی اور سائنسی سرمایہ دوسرے خاندان کی زبانوں کی نسبت زیادہ ہے۔ان زبانوں کے بولنے والوں میں یورپ، ایران، پاکستان، افغانستان، شمالی بھارت، سری لنکا، نیپال، بھوٹان، امریکہ(شمالی جنوبی)، کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جزائرغرب الہند میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کاتعلق مختلف نسلوں، مذہبوں، فرقوں اور سیاسی قومیّتوں سے ہے۔[۳]

اس خاندان سے متعلق زبانوں سے تعلق رکھنے والے سیاسی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی اور معاشرتی حوالے سے دنیا میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ سر ولیم جونز کی اس دریافت کی وجہ سے کہ سنسکرت اور یورپی کلاسیکی زبانیں ایک ہی لڑی سے تعلق رکھتی ہیں، جرمنوں نے اپنے لسانی مطالعہ کو آگے بڑھایا جس سے تاریخی لسانیات کے تقابلی قاعدے اور صوتی قوانین مرتب ہوئے جرمنوں نے سوچا کہ زبانوں کا یہ خاندان ایک طرف تو یورپ سے جڑا ہوا ہے اور دوسری طرف انگریزی یا آئس لینڈی جرمن زبانوں سے، اسی لیے اس خاندان کا نام ہند جرمن سوچا گیا تاکہ اس نام سے دونوں بڑے علاقوں کی نمائندگی ہو جائے۔

آئرلینڈ کی زبان آئرش کیلٹک خاندان ہونے کی وجہ سے اس نام انڈو کیلٹک بھی رکھا گیا مگر پھر زبانوں کے اس خاندان کا نام ہند یورپی رکھ دیا گیا۔ جرمن علما نے اس بات کو اچھا نہیں سمجھا اور خیال کیا کہ ہند جرمن (Indo German) نام کو بدلنا دراصل جرمن بیزاری کا نتیجہ ہے۔ چونکہ ہند یورپی نام بھی فرانسیسیوں کا دیا ہوا ہے جو کہ جرمنی سے کئی بار جنگ کر چکے تھے اسی لیے جرمن اس خاندان کو ہند جرمن ہی کہتے ہیں اور باقی اسے ہند یورپی کے نام سے پکارتے ہیں۔[۴]

ہند یورپی خاندان کو سنسکرتی، یورپی، سرمیئن، سامی (Semitic) اور حامی (Hemetic) کے مقابلے پر جافی (Japhetic)، ہند کلاسیکی، ہند جرمانی (Indo Germanic)، آریائی بھی کہا جاتا رہا۔ بہر حال عالمی سطح پر ہند یورپی رائج ہے۔[۵]

ہند یورپی زبانوں کا خاندان اپنی اہمیت کے اعتبار سے لسانیات کے باب میں ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ ہند یورپی کی تین شاخوں کا تعلق قبل مسیح ادوار سے ہے۔ ان شاخوں میں ہند ایرانی، یونانی اور اٹالک (Italic) زبانیں شامل ہیں۔ قدیم ایرانی کی ذیلی شاخ ''ایرانی'' کی قدیم ترین دستاویز ''اوستا'' ہے اور ہند آریائی کی سب سے پرانی زبان ''رگ وید سمہتہ'' ہے۔ ماہرینِ لسانیات کے مطابق رگ وید کے منتر اور بھجن ۱۶۰۰ تا ۲۰۰۰ قبل مسیح کے درمیانی عرصے میں وضع کیے گئے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹر جی کی رائے میں ان کی تخلیق ۱۲۰۰ قبل مسیح کے قریب ہوئی ہوگی اس زمانے میں آریائن تحریر سے ناواقف تھے، اس لیے انھوں نے ان منتروں اور بھجنوں کو از بر کر لیا ہوگا جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے اور ایک طویل مدت کے بعد ضبط تحریر میں لائے گئے ہوں گے۔[۶]

ہند یورپی خاندان کی شاخیں

۱۸۷۰ء میں ایسکو لی Askoli نے ہند یورپی کو دو شاخوں میں تقسیم کیا۔قدیم ہند یورپی میں کچھ تالوئی آوازیں تھیں جنھیں {k,kh,g,gh} سے پیش کیا جاتا ہے۔ایک شاخ میں یہ آواز ک میں بدل گئی اور دوسری شاخ میں س ش میں۔اسکولی کے اصولوں کو لے کر فان بریڈلے نے کینٹم Centumاور ستم satam گروہ بنائے کینٹم لیٹن میں اور ستم اوستا میں سو کے عدد کو کہتے ہیں۔ہند یورپی خاندان کی شاخوں کی تقسیم درج ذیل ہے:

کینٹم

اس گروہ میں حتی، طخاری، یونانی، اطالوی (لیٹن)، ایرین، نیوٹانک (جرمن)، کیلٹک زبانیں شامل ہیں۔کینٹم میں بڑے اہم لسانی گروہ سے متعلق زبانیں شامل ہیں۔حتی خاندان میں ہند یورپی کی کئی زبانیں شامل ہیں۔طخاری زبان کے حوالے سے فرسودہ روپ رکھتی ہے۔اسے ہند یورپی کی قدیم شکل سمجھا جاتا ہے۔یونانی یا ہیلنک میں یونانی اہم بولی رہی ہے۔اطالوی خاندان میں اٹلی میں بولے جانے والی زبانیں شامل تھیں۔یہ روم اور اس کے آس پاس بولی جاتی تھی۔کیلٹک خاندان کی زبانیں برطانیہ کے جزائر اور یورپ کے بیشتر علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔اسی طرح ٹیوٹاک ہند یورپی کی شاخوں میں اہمیت رکھتی ہے۔اس گروہ کی زبانیں نہ صرف جرمنی بلکہ ناروے اور ڈنمارک کے علاوہ اور کئی علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔

ستم

اس گروہ میں البانوی، بالٹک، سلافی، آرمینائی اور ہند ایرانی زبانیں شامل ہیں:

گرے نے موجودہ ہند یورپی زبانوں کو بارہ گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔جن میں ہند ایرانی، طخاری، حتی، آرمنی، Thraco-Frigian، یونانی، البانوی، ایرین، اطالوی، کیلٹک، ٹیوٹانک اور بالٹو سلافی شامل ہیں۔

ہند ایرانی

۱۶۰۰ قبل مسیح آریاؤں نے جب یہاں قدم رکھا تو ان میں سے کچھ ایران میں ٹھہر گئے اور کچھ ہندوستان کی طرف چلے آئے ان دونوں کی زبان میں مماثلت اوستا اور سنسکرت کی زبان کے تقابلی مطالعہ نے ثابت کردی ہے۔اوستا اور سنسکرت سے زبان کے دو دھاروں نے جنم لیا۔ گریرسن نے ہند آریائی کو تین ذیلی شاخوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ایرانی

۲۔دردی یا پشاچی

۳۔ ہند آریائی

۱۔ایرانی

ایرانی زبانوں میں فرس قدیم، پہلوی، زبان سغدی، زبان دری، بلوچی اور پشتو زبانوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

۲۔دردی یا پشاچی

دردی کنبہ کی بولیاں کشمیر، چترال، کافرستان، پامیر، ہندوکش کے علاقے میں بولی جانے والی بولیاں جن میں کھوار، کافر، شنا، کوہستانی، کشمیری شامل ہیں۔اس کے علاوہ ہنزہ کی وادی میں بولی جانے والی بروشسکی میں بھی پیشاچی کی خصوصیات موجود ہیں۔

۳۔ ہند آریائی

ہند آریائی میں سنسکرت، وسط ہند آریائی پراکرتیں، اپ بھرنش (مہاراشٹری اپ بھرنش، شورسینی، پیشاچی، اردھ ماگدھی) قواعد نویس مارکنڈیہ کے بقول سنسکرت سے پراکرت نکلی اور پراکرت سے اپ بھرنش۔ مذہبی پراکرتوں میں پالی، اردھ ماگدھی، جین مہاراشٹری، جین شورسینی، عمومی سنسکرت (سنسکرت اور پراکرتوں، پالی اور اردھ ماگدھی کی مخلوط زبان)، اوہٹ (شورسینی اپ بھرنش کی ایک صورت جسے پنگل بھی کہا جاتا تھا اور گویے پنگل کے دوہے گاتے تھے۔) پراکرتیں سنسکرت سے جہاں بہت کچھ لیتی تھیں وہاں وہ بہت کچھ دیتی بھی تھیں۔ ہیورنلے اور گریرسن نے جدید ہند آریائی زبانوں کو دو گروہوں اندرونی اور بیرونی میں تقسیم کیا ہے۔
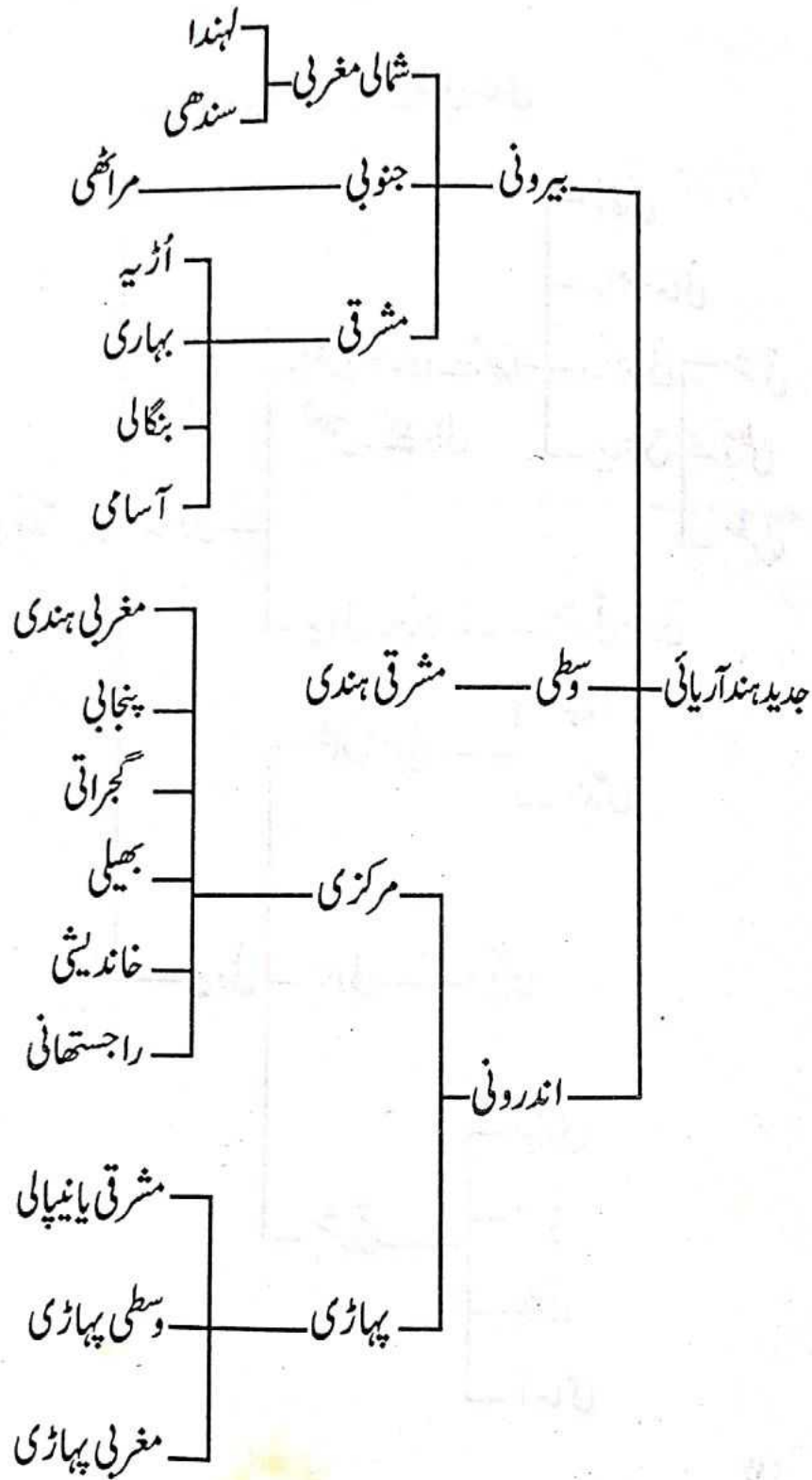
جدید ہند آریائی

گریرسن نے لسانیاتی جائزہ ہند جلد اول میں ص ۲۰ پر درج بالا گروہ بندی کی ہے۔(۷)

۱۹۳۱ء میں گریرسن نے ایک اور گروہ بندی کی جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

جدید ہند آریائی
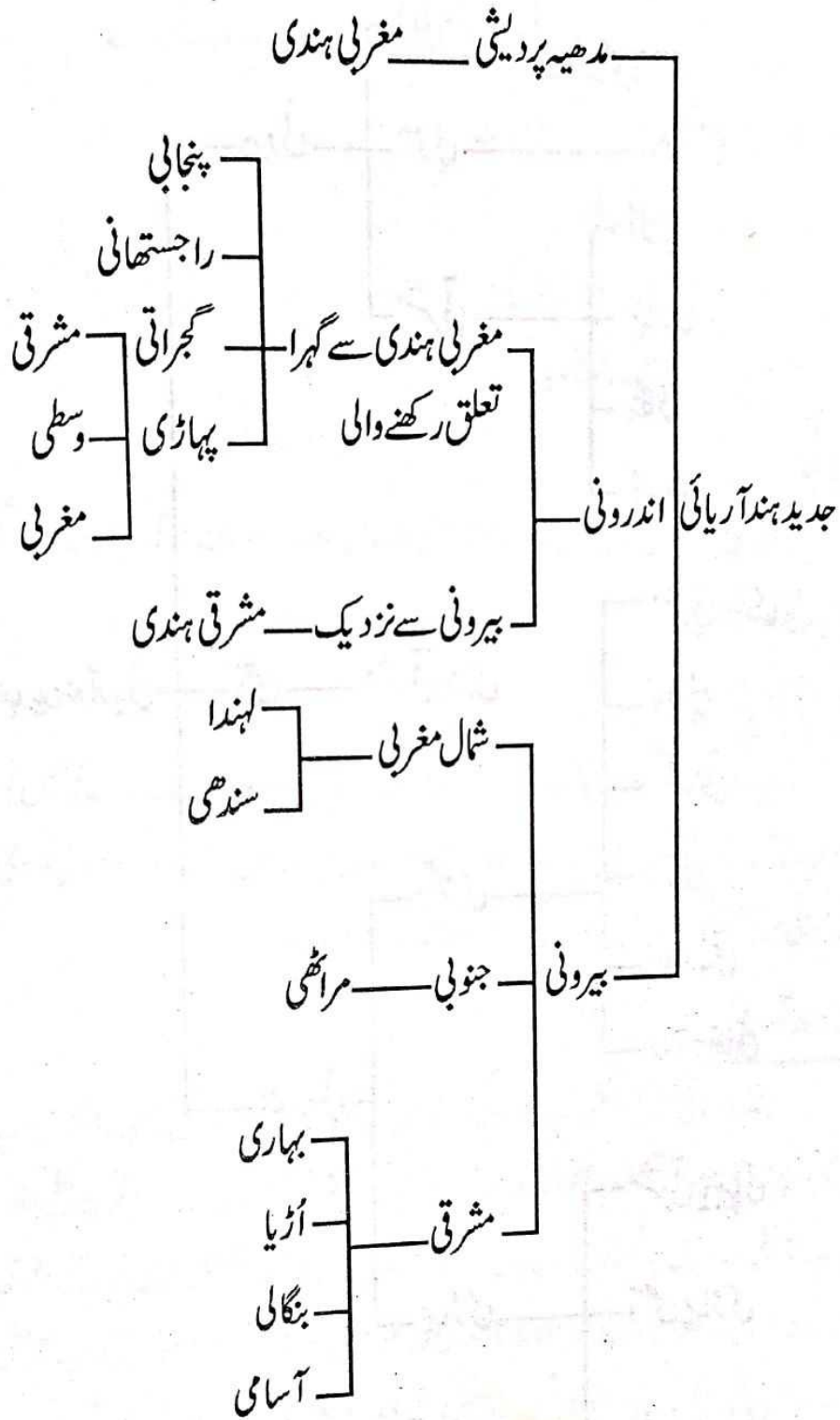
(۸)

اندرونی گروہ کی زبانوں کو شورسینی ماخذ اور بیرونی گروہ کی زبانوں کو ماگدھی پیداوار کہا ہے۔

بیرونی زبانوں میں لہندا، سندھی، مراٹھی، آسامی، بنگالی، اڑیا، بہاری شامل ہیں جبکہ اندرونی میں مغربی ہندی، پنجابی، گجراتی، راجستھانی، بھیلی، خاندیشی، مشرقی ہندی، پہاڑی زبانوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان کی غیر آریائی زبانوں میں دراوڑی، کول، منڈا، تبتی زبانیں وغیرہ شامل ہیں۔(۹)

سی ایل باربر نے ہندیورپی زبان کو درج ذیل شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔(۱۰)
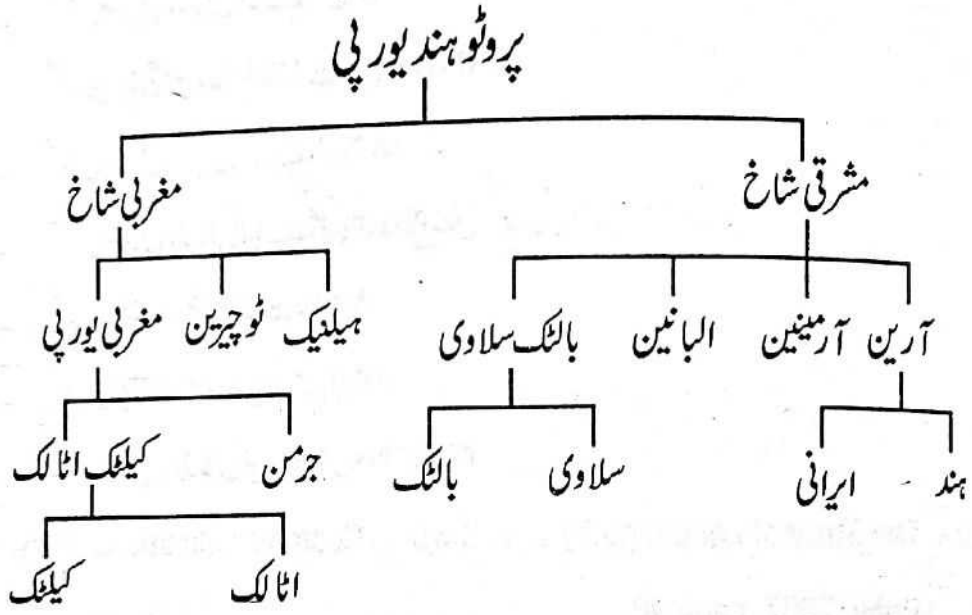
حوالہ جات

۱۔ گیان چند جین، عام لسانیات، ص۷۳۹

۲۔ گیان چند جین، عام لسانیات، ص۷۴۴

۳۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص۱۷۱

۴۔ گیان چند جین، عام لسانیات، ص۷۹۲، ۷۹۳

۵۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص۱۷۳

۶۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص۱۷۳، ۱۷۴

۷۔ گیان چند، عام لسانیات، ۸۵۷

۸۔ گیان چند، عام لسانیات ص۸۵۸

۹۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص۱۹۸ تا ۲۴۸

10 - The Story of Language by C. L. Barber, Cosmo Publications, New Dehli, 2007, page 90

اُردو پر دیگر زبانوں کے اثرات

اُردو اور ہندی برصغیر پاک و ہند کی اہم زبانوں میں شمار ہوتی ہیں۔ دونوں زبانیں بولنے میں زیادہ فرق نہیں رکھتیں مگر ان کی لکھائی الگ ہے جو فارسی رسم الخط جانتے ہیں وہ دیوناگری رسم الخط کو نہیں سمجھ سکتے اسی طرح جو دیوناگری رسم الخط میں لکھتے ہیں وہ فارسی رسم الخط سے ناواقف ہیں کیونکہ ان دونوں میں لکھائی اور سرمایۂ لفظی کے حوالے سے بہت زیادہ بُعد ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اردو اور ہندی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اُردو اور ہندی ایک ہی بولی کے دو نام ہیں، جب اس بولی میں سنسکرت کے بول ملا کر بولتے ہیں تو اسے ہندی کہتے ہیں اور جب اس میں عربی فارسی کے بول بھر لیتے ہیں تو اُردو کہنے لگتے ہیں۔ ان میں دوسرا بھید یہ ہے کہ ہندی دیوناگری (دیونگر کی) لپی میں لکھی جاتی ہے اور اردو فارسی لپی میں لکھی جاتی ہے۔ ان دو بھیدوں کو چھوڑ کر ان میں اور کوئی بل نہیں ہے، ان کا سبھاؤ اور ڈھانچا ایک ہے اس لئے دونوں کی کہانی بھی ایک ہی ہے۔''(۱)

ڈھانچا تو ایک ہو سکتا ہے مگر ان دونوں کی کہانی ایک نہیں۔ دونوں الگ الگ اپنا وجود رکھتی ہیں۔ اور موجودہ دور میں دونوں میں رسم الخط سے ہٹ کر بھی کافی حد تک لسانی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ گریرسن اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"The Name of Urdu can then be confined to that special variety of

Hindustani in which Persion words are of frequent accurence, and which thetrefore can only be written with case in the Persion character; and similarly , Hindi can be confined to that form of Hindustani in which Sunckarit words abound, and which therefore is ligible only when written in Nagri character." (2)

زبان اور تہذیب وتمدن کا ارتقا قوموں کے باہمی اختلاط اور ارتباط سے نئے رنگوں میں ڈھلتا رہتا ہے۔انسانی فطرت تبدیلی چاہتی ہے اور یہی تبدیلی ترقی کا باعث بھی ہوتی ہے۔تہذیب وتمدن اور زبان پر فاتح ومفتوح کے رشتے سے سب سے زیادہ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ تاجر، سیاح، مذہبی تبلیغ کرنے والے، خانہ بدوش، درویش، فقراء، اولیاء تہذیب، تمدن، ثقافت اور زبان کے اثرات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جانے میں اہم کردار کے حامل ہوتے ہیں۔یہاں پر آنے والے فاتحین اپنی زبانیں اور بولیاں ساتھ لاتے رہے جو یہاں کی زبانوں اور بولیوں پر اپنے اثرات مرتب کرتی رہیں۔اُردو کے بارے میں ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

''اردو بھی دوسری بولیوں کی طرح بہت ہی پرانی بولی ہے جس کا جنم دن نہیں بتایا جا سکتا کیوں کہ اس کا کوئی ثبوت کسی کے پاس نہیں ہے پر چار بدیسی بولیوں (ویدک، سنسکرت، فارسی اور انگریزی) میں مِلا ہوا اس کا پُٹ، اس کے پرانے پن کا ایک ایسا ٹھوس اور پکا ثبوت ہے کہ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔''(۳)

خسرو(۱۲۵۳ء۔۱۳۲۵ء) جنھیں قدیم اردو کے سب سے پہلے اور اولین شعراء میں شمار کیا جاتا ہے، کے گیتوں کی زبان برج بھاشا اور ان کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کی ملی جلی زبان ہے۔ان کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ اب یہ زبان نکھرتی جا رہی ہے اور اس میں کئی دوسری زبانوں کے الفاظ شامل ہوگئے ہیں جو کہ دہلی میں یا اس کے گردونواح میں بولی جاتی ہیں۔

کھڑی بولی کا نام اُردو کی ابتدا اور ارتقا کے حوالے سے بار بار لیا جاتا ہے اور فارسی زبان کا شروع ہی سے اردو کے ساتھ گہرا تعلق رہا۔یہ اردو زبان کی نشوونما، پرداخت اور ترقی میں منزل بہ منزل شامل رہی۔اس حوالے سے سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

''کھڑی بولی میں فارسی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ سب سے ابتدائی فقرے اور چند اشعار مشہور درویش اور صوفی بابا فرید گنجِ شکر(۱۱۷۳ء۔۱۲۶۵ء) سے منسوب ہیں۔بابا فرید

اس زبان کو ہندی یا ہندوی کہتے تھے۔۔۔خسرو کی مکرنیاں، پہیلیاں، دو سخنے، ڈھکوسلے ہماری زبان کی عوامی اصل کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔خسرو نے جو زبان استعمال کی وہ ان کی اختراع کی ہوئی نہیں ہے۔لیکن ان کی عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے اپنے آس پاس کی مروّجہ عوامی زبان کو ایسی ادبی تخلیق کے لیے استعمال کیا، جو عوام سے متعلق تھی اور جو عوام کے لیے تھی۔اردو کی ابتدا جب کہ اس کا نام ہندی یا ہندوی تھا یہاں کی کھڑی بولی میں فارسی، ترکی اور عربی کے الفاظ ملنے سے ہوتی ہے جسے باہر سے آئے ہوئے عام مسلمان بولتے تھے۔''(۴)

اُردو زبان کی جب بھی بات ہوتی ہے، کھڑی بولی اور زبان دہلوی کی بات ضرور ہوتی ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو زبان کا ان زبانوں کے ساتھ گہرا تعلّق رہا ہے جو دہلی میں یا اس کے نواح میں بولی جاتی رہی ہیں۔

نام دیو (۱۲۷۰ء۔۱۳۵۰) کی زبان میں کھڑی بولی یا زبان دہلوی کا ابتدائی روپ ملتا ہے۔کبیر داس (۱۳۹۸۔۱۵۱۸ء) مرہٹی زبان کے شاعر تھے، وہ بھگتی تحریک سے تعلّق رکھنے کی وجہ سے بھگتی پیغام کو دور دور تک پہنچانے کے لیے مختلف زبانوں کے الفاظ اپنی شاعری میں شامل کرتے رہے۔ان کے کلام میں برج بھاشا کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔گورونانک (۱۴۶۹ء۔۱۵۳۹ء) بنارس کے رہنے والے تھے ان کا کلام گرو گرنتھ میں بھی موجود ہے۔ان کی زبان میں راجستھانی، پنجابی اور کھڑی بولی کے اثرات ملتے ہیں۔انھوں نے عربی فارسی الفاظ کا آزادانہ استعمال کیا ہے۔بقول حافظ محمود شیرانی یہاں دس فیصد نہیں تو پانچ فیصد عربی الفاظ مل جائیں گے۔ضیاء الدین خسرو کی خالق باری ایک منظوم لغت ہے جو کہ مبتدیوں کو فارسی لغت زبان سکھانے کے لیے لکھی گئی۔اس کا سن تصنیف ۱۶۲۱ء ہے۔(۵)

اُردو پر جیسا کہ محققین نے کہا ہے کہ ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں کے اثرات سے پاک نہیں، جگہ جگہ سے الفاظ کا ذخیرہ لے کر لسانی توانائی حاصل کرتی رہی ہے۔حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''شمالی ہند کے مصنّفین میں سب سے پیشتر محمد افضل پانی پتی (یا جھنجھانوی) ہیں جو ۱۰۳۵ھ میں (بہ عہد جہانگیر) وفات پاتے ہیں ان کا ''بارہ ماسہ'' بہت مشہور ہے۔یہ تصنیف جس

بھی خالی نہیں ہے۔"(۶)

میں فارسی اثرات بہت نمایاں ہیں برج کے اثرات سے

یہ بکٹ کہانی کے نام سے مشہور ہے۔(۷)

۱۶۸۸ء کی تصنیف عاشور نامہ جو کہ تین ہزار پانچ سو چوالیس اشعار پر مشتمل ہے جس کی

زبان بالائی دوآب کی قصباتی زبان ہے۔(۸) اس میں بھی فارسی اثرات موجود ہیں۔

آس پاس کے رہنے والوں کی بدولت ایک بولی کے اثرات دوسری بولی تک منتقل ہوتے

رہتے ہیں۔ یہ ذخیرۂ الفاظ ضم ہو کر زبان کا حصہ بن جاتا ہے۔

اُردو میں برعظیم پاک و ہند کی علاقائی بولیوں سمیت اکتالیس زبانوں کے الفاظ شامل ہیں

جن میں اطالوی،، انگریزی، اوستائی، بلتی، بلوچی، بنگلہ، پراکرت، پرتگالی، پشتو، پنجابی، پوربی، تامل، ترکی، جاپانی، جرمن، چینی، دکھنی، روسی، ژند (قدیم ایرانی بولی)، سرائیکی، سریائی، سندھی، سنسکرت، عبرانی، عربی، فارسی، فرانسیسی، کشمیری، گجراتی، لاطینی، لداخی، مارواڑی، مرہٹی، ملائی، نیپالی، ولندیزی، ہریانوی، ہسپانوی، ہندکو، ہندی، یونانی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی زبان میں تعریب وتفریس کی انتہا ہے اور مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر قرآن میں (جو اردو میں ہے) عربی الفاظ کی اوسط فی صفحہ ۱۸۵ ہے۔

اردو میں اس وقت ۲۰ سے ۴۵ فیصد الفاظ انگریزی کے ہوتے ہیں۔(۹) اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان پر بہت سی بولیوں کے اثرات پڑتے رہے ہیں۔

برصغیر میں مختلف قوموں کے آنے سے ان کی زبانوں کے اثرات ہندوستانی زبانوں پر پڑتے رہے اور یہ عمل صدیوں سے جاری ہے۔ ۱۵۴۰ء میں ہندوستان کی مشہور بندرگاہوں پر اہلِ پرتگال قابض تھے اور تجارت انھیں کے ہاتھ میں تھی، وہ لوگوں میں بھی گھلتے ملتے تھے سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ان کی زبان کے بہت سے الفاظ عربی، فارسی مرہٹی اور ہندوستانی دیگر زبانوں میں پہنچ گئے، اور بہت سے عربی فارسی لفظ پرتگالی سے مل کر نئے روپ میں ہندوستانی زبانوں میں داخل ہو گئے خورد ونوش سے متعلق یہ الفاظ دیکھئے: اچار، اناس، بسکٹ، پپیتا، تمباکو، چائے، گوبھی وغیرہ اور سامان آرائش اور آلات واسلحہ سے متعلق الفاظ میں الماری، بالٹی، بوتل، پیپا، پستول، صابون، کوچ، کپتان، کارتوس، میز، تولیہ وغیرہ۔ مذہبی اور متفرق الفاظ میں گرجا، پادری، کراس، انگریز، چھاپہ، نیلام، مستری، کمرہ، روپیہ وغیرہ۔(۱۰)

رائس، پی کاک (مور) اصل میں تامل زبان کے الفاظ ہیں جو تامل سے انگریزی زبان

میں آئے۔[11] پی کاک اور رائس (چاول) آج کل اردو میں بھی مستعمل ہیں۔

اُردو زبان میں ایک صلاحیت یہ بھی ہے کہ یہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو جوں کا توں اپنا سکتی ہے۔ اردو میں انگریزی اور یورپی زبانوں کے بے شمار الفاظ شامل ہوئے۔ ابتدا ہی سے بہت سی زبانوں کے الفاظ کو اس نے اردوانا شروع کیا ہوا ہے۔ شان الحق حقی کے بقول:

''سینکڑوں یورپی لفظ ہیں کہ بالکل اردو ہو گئے ہیں۔ بکس، دراز، الماری، کارتوس، بالٹی، چابی، فراش، بین، گھاس، لیٹ، کف، کالر، چھینٹ، رفل، لیس، کنستر، گیٹس، بکلوس، بٹن، مسمریزم، افسر، اردلی۔۔۔ حتیٰ کہ بوریت اور جھانپزم جیسی جدید اختراعات بھی موجود ہیں۔''[12]

اُردو زبان کا دامن لفظی نہایت وسیع ہے۔ ان گنت زبانوں سے الفاظ اردو زبان میں آئے اور مستعمل ہو کر مستقل طور پر اردو زبان کا حصہ بن گئے۔ چاہے وہ لفظ عربی کا ہو، یا فارسی کا، ترکی کا ہو یا پرتگالی کا، انگریزی کا ہو یا فرانسیسی کا، پنجابی کا ہو یا سندھی کا، اگر وہ اردو زبان میں رواج پا گیا ہے تو اب وہ لفظ اردو کا بن گیا ہے۔ چاہے اس کی اصل کچھ بھی ہو مگر وہ جس طرح اردو میں مستعمل ہے، اردو میں وہی اس کی اصل ہے، جب اسے ہم نے اردو میں اپنا لیا ہے تو اب اس کی موافقت اردو زبان کے حوالے سے دیکھی جائے گی۔

''دینی الفاظ زیادہ تر عربی سے آئے ہیں۔ خود دین، اسلام، سورہ، آیہ، رسول، مسجد، وحی، یہ سب عربی کے الفاظ ہیں۔ درباری الفاظ فارسی سے آئے ہیں۔ بادشاہ، تخت، پائگاہ، پیادہ، رُخ، فرزیں، شہ سوار، اسلحات کے کئی الفاظ ترکی سے: توپ، توپچی، بندوق، چاقو، چقماق، منجنیق، پرتگالی سے روزمرہ کے الفاظ فیتہ، میز، آیا، چابی وغیرہ۔''[13]

اُردو زبان نے شروع میں کئی زبانوں سے استفادہ کیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اُردو زبان نے کسی بھی زبان سے الفاظ لینے میں کبھی کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ اردو کی ابتدا میں اس پر مختلف زبانوں کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے۔ مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

''اُردو کی ابتدا جب کہ اس کا نام ہندی یا ہندوی تھا یہاں کی کھڑی بولی میں فارسی، ترکی اور عربی کے الفاظ کے ملنے سے ہوتی ہے جسے باہر سے آئے ہوئے عام مسلمان بولتے تھے۔''[14]

قدیم اردو نے شروع میں زبان دہلوی اور دہلی کے اردگرد بولی جانے والی بولیوں کے

اختلاط سے نمو پائی۔ اس وقت دہلی میں اور اس کے نواح میں کھڑی بولی، برج بھاشا، میواتی اور ہریانی (جاٹو۔ بانگڑو) بولی جاتی تھیں۔ مسعود حسین خاں گریرسن لنگوسٹک سروے آف انڈیا، جلد نہم، ہندوستانی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بجنور کی کھڑی بولی، دوآبہ کے اضلاع کی کھڑی اور رام پور اور مراد آباد کی اُردو نما کھڑی کے درمیان کی کڑی ہے۔ مثلاً انفی کوز آواز (ن ط) جو اردو میں کبھی رائج نہ ہوسکی اور میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع کی خصوصیت ہے، بجنور تک سنائی دیتی ہے۔"(۱۵)

اُردو زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنانے کا سلسلہ شروع سے جاری ہے۔ اس حوالے سے ماہرین زبان نے کچھ اصول بھی وضع کیے کہ کس زبان سے الفاظ کو کس انداز میں مستعار لینا ہے۔ کہیں یہ تبدیلی خود عوام نے مختلف زبانوں کے الفاظ کو قبول کرتے ہوئے پیدا کر لی۔

اردو زبان نے سنسکرت سے الفاظ لیتے ہوئے دوسری ہندوستانی زبانوں کی طرح آسانی پیدا کرنے کے لیے لسانی فطری اصولوں کے تحت ان کی ہیئت میں تبدیلی کر کے اپنایا ہے مگر اُردو زبان نے عربی فارسی کے ہزاروں الفاظ ان کی صوتی اور تحریری ہیئت میں کسی قسم کی تبدیلی لائے بغیر قبول کیے ہیں۔(۱۶)

اُردو میں لیے جانے والے فارسی اور عربی الفاظ میں بھی آہستہ آہستہ صوتی اور تلفظ کی تبدیلیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جیسے تَشنہ کو اردو میں تِشنہ زیادہ تر بولا جاتا ہے۔ اسی طرح کِلمہ کو کَلمہ بولا جاتا ہے۔ اسی طرح عربی فارسی کے بے شمار الفاظ ہیں جنھیں اردو میں لیتے وقت چھوٹی بڑی کئی تبدیلیاں کر لی گئی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ خود بخود ہوتی چلی گئی ہیں۔

اردو پر سب سے پہلے فارسی نے اپنے اثرات مرتب کرنے شروع کیے۔

مرتبہ ریختہ کا اور ہوا
معتبر فارسی کے طور ہوا (سوز، پنجاب میں اردو، ص ۲۷)

ریختہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اسی صنف سے اردو زبان کو ابتدا میں فروغ ملا۔ حافظ محمود شیرانی ریختہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ریختہ کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا تھا جس میں ہندی اور فارسی اشعار یا مصرعے یا فقرے جو مضمون۔ تال اور راگ کے اعتبار سے متحد ہوتے تھے۔۔۔ ریختہ ایسی نظم ہوتی تھی جس

میں ہندی فارسی کے اشعار یا فقرے متحد ہوتے تھے۔"(۱۷)

میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں ریختہ کی چار قسمیں بیان کی ہیں:

۱۔ یہ ہے کہ ایک مصرع ہندی ہو اور ایک مصرع فارسی

۲۔ یہ ہے کہ نصف مصرع ہندی ہو اور نصف مصرع فارسی

۳۔ یہ ہے کہ اس میں فارسی کا عنصر حرف وفعل کی صورت میں ہو۔

۴۔ وہ ہے کہ اس میں فارسی کی ترکیبیں پائی جائیں۔

فارسی، عربی اور ترکی سے اردو نے کیا کیا حاصل کی اس کی تفصیل طولانی ہے۔ زبان میں نئی اصوات داخل ہوئیں یہ خود ایک بڑی تبدیلی تھی۔ اردو ابجد میں چودہ حروف ایسے ہیں جو ان نئی آوازوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ نئے الفاظ جن میں یہ حروف موجود ہیں اردو لغت کا بہت بڑا عنصر اور اس کا جزو لاینفک ہیں۔ بہت سے نئے اسماءِ صوت یا حکائی الفاظ پیدا ہوئے۔ غڑاپ، غٹرغوں، غرفش، غائیں غائیں، زپاٹا، فراٹا، غٹ پٹ، تڑاق پڑاق وغیرہ میں ہندی اور عربی مخارج مدغم نظر آتے ہیں۔ یہ ایک نئی صوتیات کا آغاز تھا جو اردو کی اپنی چیز ہے۔ ایک اور نہایت مفید اکتساب جو اُردو نے فارسی سے کیا وہ واوِ عطف اور کسرۂ اضافت کا استعمال ہے ان کے بغیر اردو کا کام نہیں چل سکتا تھا۔ (۱۸)

شروع میں دوسری زبانوں سے لیے گئے الفاظ کو ادا کرنے میں مشکل ہوتی ہو گی مگر رفتہ رفتہ یہ اردو زبان کے مزاج کے مطابق ڈھلتے چلے گئے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

"اردو زبان میں آج ایسے بہت سے الفاظ ملتے ہیں جن میں فارسی عربی کے حروف داخل کر دیے گئے ہیں اور اب بولنے والے ان حروف کی آوازیں بھی نکالنے لگے ہیں۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے کچھ پڑھے لکھوں نے اردو زبان کو عرصہ دراز تک فارسی عربی سے مشتق سمجھا اور اس کی صوتیات اور صرف ونحو کی تشریحات کے لیے ہمیشہ انھیں زبانوں سے استناد کیا۔ چنانچہ ایسے ہی خیالات رکھنے والوں نے اردو کے بہت سے الفاظ میں اس کی قدیم آوازوں کی جگہ فارسی عربی کی آوازیں داخل کر دی ہیں۔ مثلاً:

ق بجائے ک	قصائی	(کسائی)، قلابازی (کلابازی)
غ بجائے گ	غلیل	(گلیل)
ف بجائے پھ	فراٹا	(پھراٹا)

خ بجائے کھ	اخروٹ	(اکھروٹ)
ع بجائے الف	عمدہ	(اودمھا)، علیحدہ (الیدھا، قدیم دکنی ادب الادھا)
ط بجائے ت	طوطا	(توتا) واسطے (واستے)
ص بجائے س	مصالحہ	(مسالا)[19]

برصغیر میں عہد قدیم کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یورپی تاجر اور سیاح یہاں آتے رہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں با قاعدہ تجارتی اور سفارتی وفود کی صورت میں ان کی آمد ہوئی۔ اس کے علاوہ پرتگالی، اطالوی، ولندیزی جہاز ران بھی یہاں تجارت کی غرض سے آتے اور قیام کرتے رہے۔ انھیں لوگوں کے ذریعے یورپی زبانوں کے بے شمار الفاظ اس علاقے کی زبانوں میں شامل ہوگئے۔ ان تجارتی وفود کی وجہ سے بہت سے پرتگالی الفاظ مثلاً نیلام، فالتو، پستول، فٹ، ٹرنک اور لاطینی الفاظ پادری، فرانسیسی الفاظ آملیٹ اور کارتوس وغیرہ شامل ہوگئے۔ جو کہ اب اُردو زبان ے سرمایہ لفظی میں شامل ہیں۔ اُردو پر عربی فارسی اثرات کی بات کرتے ہوئے مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''اس پر عربی فارسی لسانی اثرات محض اتفاق نہیں جیسا کہ بنگالی اور مرہٹی یا ہندی میں پائے جاتے ہیں بلکہ ان کی نوعیت بنیادی اور ترکیبی ہے۔ جن سے قطع نظر اردو زبان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ عربی فارسی عناصر نے اس زبان کو اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ انیسویں صدی کے تمام محققین نے اس بولی کو پہچاننے میں لغزش کی ہے جو کہ اس کی تہہ میں موجود ہے اور جس کے ذریعے اس کا رشتہ قدیم ہند آریائی تک پہنچتا ہے۔''[20]

اُردو پر عربی فارسی اثرات اتنے گہرے ہیں کہ ہم اُردو زبان کو ان زبانوں سے ہٹ کر صحیح طور پر نہیں دیکھ سکتے۔ یہ بات بجا کہ اُردو زبا عربی فارسی سے نہیں نکلی مگر اس کے باوجود ہم اُردو کے قواعد کو عربی فارسی کے بغیر نہیں جان سکتے۔

عربی زبان کے اثرات

عربی زبان چونکہ مسلمانوں کی مذہبی اور قومی زبان ہے۔ یہی زبان مسلمانوں کے اتحاد اور یگانگت کی علامت ہے۔ فارسی، ترکی، پنجابی وغیرہ الگ الگ زبانیں ہیں مگر ان سب نے عربی زبان سے استفادہ کیا ہے۔ ان زبانوں کے علمی اور لسانی سرمائے میں عربی سرمایہ شامل ہے۔ مسلمان ممالک میں بولے جانے والی زبانیں عربی زبان کے اثرات سے فیض یاب ہیں۔ ان زبانوں میں بہت سے

الفاظ عربی الاصل ہیں۔

اُردو میں بھی جب علمی و ادبی کام شروع ہوا تو عربی زبان کا علمی سرمایہ کام آیا۔ مختلف شعبوں میں اصطلاحات کے لیے عربی الفاظ اور اصطلاحات کا سہارا لیا گیا۔ دوسری اہم بات یہ کہ قرآن مسلمانوں کے لیے کتاب ہدایت ہے جو کہ ایک مکمل نظام حیات ہے۔ مسلمان کے لیے قرآن کو پڑھنا، سمجھنا اور اس پر عمل کرنا فرض ہے۔ اسی وجہ سے ہندوؤں نے اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا۔ جبکہ پہلے ہندو بھی اسی شوق اور رغبت سے اردو بولتے تھے جس شوق اور وارفتگی سے مسلمان اسے پسند کرتے تھے۔ بعد میں کچھ انتہا پسند سوچ رکھنے والوں نے اردو کو مسلمانوں سے مخصوص کر دیا۔ جس کی وجہ سے ہندوؤں نے اردو میں سے عربی کا خزانہ نکالنا شروع کر دیا اور عربی کی جگہ سنسکرت آمیز الفاظ کو رواج دیا گیا اور اس زبان کا نام ہندی رکھا گیا۔ بقول ڈاکٹر احسان الحق:

”عربی سامی زبان ہے سامی زبانیں سام ابن نوح علیہ السّلام سے منسوب ہیں جو ان تمام قوموں کے جد اعلیٰ ہیں جو اس وقت سامی زبانیں بولتی ہیں۔ اصطلاح میں ان زبانوں کے بولنے والوں کا مسکن نیل وفرات کے مابین علاقہ جزیرہ عرب اور شام ہے جو مشرق میں علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔“(۲۱)

سامیوں کا اصل وطن بابل تھا اور مصری تہذیب اور بابلی تہذیب ہم عصر تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے علم کا تبادلہ کیا۔(۲۲)

اُردو نے عربی زبان سے زیادہ اثرات قبول کیے کیونکہ یہاں جو فاتحین آئے ان کی زبان عربی تھے اور بعد میں فارسی اور ترکی بولنے والے آئے تو ان کی زبانوں میں بھی عربی کے اثرات غالب تھے۔ نہ صرف عرب بلکہ ایرانی بھی عربی میں مہارت رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی کا ملا جلا رجحان اُردو میں شروع سے موجود ہے۔ ڈاکٹر احسان الحق لکھتے ہیں:

”آج بھی اردو میں کثیر عربی الفاظ۔ فارسی کے توسط سے ہی سہی۔ اس زبان پر عربی کی گہری چھاپ کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد مغلیہ عہد ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک میں اگرچہ فارسی زبان ہماری تہذیبی زندگی کا محرک اور غالب عنصر تھی لیکن فقہ اور منقول و معقول کی تدریس عربی زبان میں ہی ہوئی تھی۔ عربی زبان جاننا معیار ثقافت و فضیلت تھا۔“(۲۳)

برصغیر میں عرب لوگ تجارت کی غرض سے آتے تھے، ان کی زبان عربی اور مقامی زبانوں

میں الفاظ کا تبادلہ بھی ہوتا تھا، یہ سلسلہ صدیوں پر مشتمل ہے۔ ساتویں ہجری عیسوی میں جب یہاں دوبارہ برہمنوں کا عروج ہوا تو سنسکرت کو بھی فروغ ملا۔ برصغیر میں ساحل سمندر تک بولے جانے والی زبانوں پر ایرانی اور ترک زبانوں کے اثرات موجود تھے۔۷۱۲ میں محمد بن قاسم کے آنے کے بعد یہاں عربوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہوئی جس کی وجہ سے آنے والی صدیوں میں عربی زبان یہاں کی سرکاری زبان ٹھہری۔ جس کی وجہ سے یہاں سندھی اور سرائیکی میں عربی الفاظ کا میل ملاپ شروع ہوا۔ بے شمار عربی الفاظ یہاں کی زبانوں کا اٹوٹ حصہ بنتے چلے گئے۔ قدیم رسم الخط کو ترک کر کے عربی رسم الخط کو اپنایا جانے لگا۔

ان گنت عربی الفاظ وتراکیب، محاورے روزمرہ استعمال کی اشیاء کے ناموں کے حوالے سے یہاں عربی زبان غالب نظر آنے لگی۔ الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی تلفظ کو بھی اہمیت دی جانے لگی۔ یہاں پر بادشاہوں کی زبان چونکہ فارسی تھی، لہٰذا جہاں فارسی کا چلن عام ہوا وہاں یہ بات بھی تھی کہ فارسی زبان میں خود عربی الفاظ دخیل تھے جنھوں نے یہاں کی زبانوں پر بھی اپنے اثرات چھوڑے۔(۲۴)

فارسی اور عربی نے مل کر یہاں کی زبانوں پر جب اپنے اثرات مرتب کیے تو اردو زبان چونکہ ابتدائی مراحل میں تھی، اسی لیے اردو زبان نے یہ اثرات زیادہ قبول کیے۔ اُردو نے شروع ہی سے عربی فارسی زبانوں سے الفاظ لینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

"اردو کی بنیاد اس وقت پڑی جب کہ مسلمان فاتحین نے کوہ ہندوکش کو عبور کر کے سرزمین ہند میں قدم رکھا اور آریہ ورتھ کے باشندوں سے ملاپ ہوا۔ جوں جوں ان دونوں قوموں کا میل ملاپ بڑھتا گیا۔ مسلمانوں کی عربی فارسی اور ہند کی آریائی زبانوں سے ایک مخلوط زبان یعنی اُردو وجود میں آئی۔"(۲۵)

اسلام کے فروغ کے ساتھ ساتھ لوگوں میں قرآنی اور عربی نام رکھنے کا رواج پڑ گیا، جو کہ آج بھی موجود ہے۔ آج بھی لوگ بچوں کا نام رکھنے سے پہلے کوشش کرتے ہیں کہ نام قرآن سے لیا جائے یا اللہ اور رسولِ اکرم ﷺ کے صفاتی ناموں کے ساتھ ترکیب سے بنایا جائے۔ پھر جیسے جیسے اردو زبان کا ہیولا تیار ہونے لگا تو اس زبان میں بھی عربی زبان کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ ناموں، محاوروں کے علاوہ یہاں اشیاء، سبزیوں اور پھلوں پودوں وغیرہ کے نام بھی عربی زبان میں نظر آتے ہیں۔

اُردو پر عربی زبان کے اثرات کو دو نقشوں کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے:

پہلا نقشہ

ہندوستانی زبانوں میں اُردو کی قدیم جڑیں

اُردو کی نشو ونما میں عربی زبان کا کردار

بذریعہ سندھی و پنجابی	بذریعہ ملیالم
(جب مسلمان سندھ اور پنجاب پہنچے)	(جب مسلمان ملیبار پہنچے)

دوسرا نقشہ

اردو کی نشو ونما میں عربی زبان کا کردار

بذریعہ فارسی	بذریعہ دینی و عربی تعلیم	بذریعہ ترکی و مقامی زبانیں
(ادبی و سرکاری زبان)	(اس وقت کا واحد تعلیمی نظام)	(فوج اور عوام کی زبان)[۲۶]

زبانوں کا کام ایک دوسری کے بغیر نہیں چلتا۔ زبانوں میں لسانی لین دین کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جس زبان میں یہ سلسلہ رک جائے تو سمجھو کہ وہ زبان رک گئی (آگے بڑھنے سے)۔ زبان رکنے سے اس کے مفقود یا غیر مقبول ہونے کا خدشہ موجود رہتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

"زبانیں ایک دوسرے سے استفادہ کرتی ہیں اور چراغ سے چراغ جلاتی ہیں۔۔۔ اردو نے جو الفاظ عربی سے مستعار لیے ان میں سے بیش تر متشابہ الصوت حروف اور متحد المخارج آوازوں کی ترکیب سے بنے ہیں۔ اہلِ اردو عموماً بولتے وقت ان آوازوں میں فرق نہیں کرتے اس لئے سننے والوں کو اسرار، 'اصرار'، یا 'علیم' 'الیم' وغیرہ یکساں الفاظ کے سمجھنے اور ان کے معانی تک رسائی حاصل کرنے میں خاصی قدت پیش آتی ہے۔ جو کبھی کبھی سیاق و سباق کی رہنمائی کے باوجود اشتباہ کا باعث بن جاتی ہے۔ یہ دقت سننے کی حد تک ہے۔"[۲۷]

پھر جب اردو میں سائنسی اور دیگر مختلف علوم کو فروغ حاصل ہوا تو کوشش کی گئی کہ دوسری

زبانوں سے جو اصطلاحات لی جا رہی ہیں انھیں عربی میں ترجمہ کر کے اردو کا حصہ بنایا جائے۔اس سے اردو زبان کا دامن علمی وسیع ہوا۔اور وسعت کے ساتھ ساتھ عربی کے ساتھ تعلق مزید گہرا ہوتا گیا۔

فارسی زبان کے اثرات

برصغیر میں کنشک، ساکا اور دارا کے حملوں کی وجہ سے فارسی کے اثرات موجود تھے۔پھر محمد بن قاسم کی فوج میں بھی ایک حصہ فارسی بولنے والا تھا۔اسماعیلیوں، سبکتگین، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، التمش، سے لے کر بابر تک اور پھر شیر شاہ سوری، احمد شاہ ابدالی جیسے سالاروں نے یہاں حملے کیے، حکومتیں قائم کیں اور فارسی زبان رائج کی۔

فارسی زبان یہاں کی زبانوں کے ساتھ گھل مل گئی اور ان پر گہرے اثرات مرتب کرتی رہی۔ اُردو زبان کے آغاز سے اس کے عروج تک اگر پورے عہد کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں اس وقت فارسی کی بڑی مضبوط علمی اور ادبی روایت مستحکم ہو چکی تھی۔تدریسی زبان بھی فارسی تھی، اسی لیے فارسی نے مستقل اور مسلسل اردو زبان پر اپنے اثرات مرتب کرتی رہی۔

فارسی زبان کا شروع ہی سے اردو کے ساتھ گہرا تعلق رہا۔یہ اردو زبان کی نشوونما، پرداخت اور ترقی میں منزل بہ منزل شامل رہی۔

ذخیرۂ الفاظ دینے کے ساتھ ساتھ فارسی نے تو اردو زبان کی قواعد اور لسانیات کے حوالے سے بھی اردو کا دامن وسیع کیا۔اردو زبان میں بے شمار الفاظ و تراکیب، لاحقے، سابقے، محاورات، ضرب الامثال، صرف ونحو، جملوں کی ساخت، اسماء و افعال، علامات فارسی زبان سے استعمال ہوتی ہیں۔چونکہ فارسی یہاں صدیوں تک سرکاری، علمی اور تدریسی زبان رہی اسی لیے اس نے یہاں کی زبانوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

کھڑی بولی میں فارسی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ سب سے ابتدائی فقرے اور چند اشعار مشہور درویش اور صوفی بابا فرید گنجِ شکر سے منسوب ہیں۔بابا فرید خود اس زبان کو ہندی یا ہندوی کہتے تھے۔[۲۸]

مرزا غالب ہاں فارسی زبان کی ایک بڑی مضبوط روایت نظر آتی ہے جو اِن کی فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں بھی جلوہ گری کرتی نظر آتی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کی کتب سخن دانِ فارس، آب حیات، مولانا شبلی کی شعر العجم، اور حافظ محمود شیرانی کے مقالات پر بڑی حد تک فارسی زبان کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا ایک بڑا حصہ بذاتِ خود فارسی میں ہے مگر ان کی اُردو شاعری میں بھی فارسی تراکیب اور الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اردو اور فارسی صنعتوں کے اشتراک کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

''اُردو اور فارسی میں صنعتوں کے اشتراک کی توجیہہ یہ ہے کہ آخری دور فارسی شاعری کا جس نے اردو شاعری کو متاثر کیا، خود صنائع بدائع لفظی و معنوی سے متاثر تھا، دوسرے اردو میں نئ صنعتوں کی ایجاد، الا ماشاء اللہ ہوئی ہی نہیں۔ بس فارسی میں جو صنعتیں اور کتابیں رائج تھیں انھی کو سامنے رکھ کر یا تو اردو سے مثالیں ڈھونڈ لیں یا گھڑ لیں یا کسی شاعر سے کہلوالیں۔''(۲۹)

ہم اگر اردو شعراء کو دیکھیں تو ان کے ہاں ہمیں فارسی زبان کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی میں اقبال، ن م راشد، فیض احمد فیض کے ہاں یہ اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

''جہاں تک اسلوب نگارش اور زبان و بیان کا تعلّق ہے راشد شروع ہی سے فارسی الفاظ وتراکیب اور مفردات و مرکبات کے دلدادہ تھے۔ ایران میں اجنبی میں یہ سلسلہ کچھ پہلے سے بھی بڑھ گیا ہے اور اس میں استحکام بھی پیدا ہوا ہے۔''(۳۰)

بعض جگہ تو فارسی زبان اس قدر استعمال کی گئی ہے کہ واضح طور پر اُردو زبان میں فارسی کے پیوند لگے نظر آتے ہیں۔

''راشد کے یہاں فارسیت اس قدر ہے کہ ان کی آزاد نظموں میں بعض اوقات تصنّع اور بناوٹ کا احساس شدید سے شدید تر ہونے لگتا ہے۔''(۳۱)

راشد نے فارسی زبان اور تراکیب کی وجہ سے اردو میں نئے لفظی اور لسانی امکانات سے معنوی تنوع پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح فیض کی شاعری میں بھی فارسی روایت اپنی پوری تب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ انھوں نے کلاسیکی شعری اسلوب کو اُردو کے علاوہ فارسی اور عربی زبان لے کر اسے مغربی اسلوب کے ساتھ پیش کر کے اپنے منفرد اسلوب کو مستحکم کیا۔

اردو میں عربی فارسی کی بھرمار کی وجہ سے بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ زبان عام لوگوں کی سمجھ فہم سے دور ہونے لگی۔ سر سید اور ان کے افقاء نے اس حوالے سے آسان فہم زبان کی بات کی۔

مولوی عبدالحق نے بھی اردو زبان کو عربی فارسی تراکیب سے بچانے کی کوشش کی اور اسے آسان اردو بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ مولوی عبدالحق اپنے مضمون ''آسان اردو'' میں لکھتے ہیں:

''مشکل پسندی کا ایک دور لکھنؤ کا تھا۔۔۔دوسرا دور اس وقت آیا جب مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' اُفقِ صحافت پر نمودار ہوا اور اس کے بعد انھوں نے ''البلاغ'' جاری فرمایا ،حضرت نے صحافت کا رنگ ہی بدل دیا۔ بدل کیا دیا بگاڑ دیا۔ قیمت یا چندے کے لیے ''بدل اشتراک'' ایڈیٹر کے لیے ''مدیر مسئول'' اور اسی قسم کی ماہوار اور غیر ضروری ترکیبیں رائج فرمائیں۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے اسم شریف کو بھی عربی لباس پہنا دیا یعنی ''احمد المکنی بہ ابی الکلام الدہلوی'' لاحول ولاقوۃ۔ یہ اُردو ہے یا اردو دشمنی۔ اسے زیادہ سے زیادہ اردو نما عربی یا عربی نما اردو کہہ سکتے ہیں۔ نقالی یا تنقید انسان کی فطرت میں ہے بعض اخبار والے دوسرے لکھنے والے اس رنگ کو لے اڑے اور عجیب وغریب واہی تباہی الفاظ اور ترکیبیں لکھنی شروع کر دیں ایک دن ان کے مقلد اخبار کے ایڈیٹر نے اپنا ایک مقالہ اس طرح لکھنا شروع کیا۔

''بعد از انقصائے دہور و مرور ایام وشہود'' اس قسم کی تحریروں کو پڑھ کر بہت افسوس ہوتا لیکن یہ بہروپیہ پن زیادہ دیر تک نہ رہا۔ یہ چیز چلنے والے نہ تھی نہ چلی اور خدا کا شکر ہے نہ چلی۔''(۳۲)

اُردو خود ایک آزاد زبان ہے۔ اس میں اپنا ذخیرۂ علمی اس حد تک اکٹھا ہو چکا ہے کہ اب ہمیں عربی فارسی اور سنسکرت کے مزید بھاری بھر کم الفاظ اور تراکیب سے اُردو زبان کو ثقیل نہیں بنانا چاہئے۔

''اُردو کو آریہ زبان ہونے کے باوجود نہ سنسکرت کا حلقہ بگوش بنانا چاہیے نہ فارسی یا عربی کا دستِ نگر۔ علمی اصطلاحوں کا معاملہ دوسرا ہے۔''(۳۳)

ضروری اصطلاحات کے معاملے میں بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اگر انگریزی زبان کی اصطلاحات ہیں تو انھیں انگریزی ہی کی رہنا چاہئے نہ کہ انھیں عربی اور فارسی میں ترجمہ کر کے اور زیادہ مشکل اور پیچیدہ بنا دیا جائے۔

انگریزی زبان کے اثرات

برصغیر میں تجارت کی غرض سے مختلف قوموں فرانسیسی، برطانوی اور پرتگیریوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا، مختلف زبانوں کے الفاظ کے ساتھ ساتھ انگریزی کے الفاظ بھی یہاں کی زبانوں میں شامل

ہوتے رہے۔ پھر جب اٹھارویں صدی عیسوی میں انگریزوں کا اثر رسوخ بڑھا اور وہ برصغیر کے بیشتر علاقوں پر قابض ہو گئے تو یہ اثرات اور زیادہ گہرے ہوتے چلے گئے۔

برصغیر میں ایسٹ انڈیا اور بعد میں برطانوی قبضے کی وجہ سے اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ انگریزی اقتدار اور جدید علوم اور سائنس کی ترقی نے اردو میں بے شمار انگریزی الفاظ کو راہ دی۔ انگریزی کے ہزاروں الفاظ اردو کا حصہ بن چکے ہیں۔

برصغیر میں انگریزی تسلط مکمل ہونے کے بعد سرسید جیسے قائدین نے مسلمانوں کی پستی اور علمی پسماندگی دور کرنے کا حل یہ سوچا کہ سائنسی اور انگریزی تعلیم کے حصول کو ممکن بنایا جائے۔ سرسید کی اردو تحریروں میں جابجا انگرزی الفاظ نظر آتے ہیں۔ سرسید اور مغربی تہذیب کی مخالفت میں اکبر الہ آبادی نے جو شاعری لکھی اس میں بھی انگریزی الفاظ کا استعمال نظر آتا ہے۔

بے شمار ایسے ادارے کھولے گئے جہاں انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی، انگریزی پرستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی سرکاری اور دفتری زبان بھی انگریزی ہی قرار پائی۔ روزمرہ بول چال میں بھی انگریزی الفاظ وتراکیب اپنی جگہ بنانے لگ گئے۔ پھر جتنی بھی جدید ایجادات اور سائنسی آلات استعمال میں آتے گئے اُن سب کے نام انگریزی زبان میں رائج ہوتے گئے۔ تمام دواؤں کے نام، اظہار ابلاغ کی اصطلاحات، علمی ولسانی اصطلاحات سب انگریزی زبان سے آکر اُردو زبان کا حصہ بن گئیں۔ جس کی وجہ سے اردو زبان کا دامن لفظی پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہو چکا ہے۔

کمپیوٹر اور موبائل فون کی وجہ سے انگریزی کے بہت سے الفاظ اردو زبان میں رائج ہو گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اردو زبان کا دامن وسیع سے وسیع ہوا ہے۔ شعرا نے اپنی لسانیاتی اپج کی وجہ سے ان الفاظ کو اس طرح اردو زبان میں شاعری کا حصہ بنایا ہے جو کہ آنے والے دنوں میں ضرور نئے امکانات کا سبب بنے گا۔ جس طرح آج ہم عام بول چال میں ان انگریزی الفاظ کو بغیر کسی رکاوٹ کے استعمال کرتے ہیں، آنے والے دنوں میں ہمارے ادب کا بھی حصہ بنتے چلے جائیں گے۔ (۳۴)

عام روزمرہ بول چال کے بعد اب اکثر شعرا کی شاعری میں بھی انگریزی الفاظ نظر آنے لگے ہیں۔ فٹ پاتھ، اسکول، اسٹیشن، بور، سٹوری، لیمپ، ٹیبل، ٹیچر، ماسٹر، پروفیسر، گیلری، ایٹم بم، روڈ، سٹریٹ، ٹاؤن جیسے الفاظ تو پہلے سے اردو شاعری میں استعمال ہوتے آرہے ہیں۔ اگر ہم صرف اکبرالہ آبادی کی شاعری میں استعمال ہونے والے انگریزی لفظوں کی فہرست تیار کریں تو ان میں،

اے۔بی۔بی اے۔مسٹر،ہوٹل،پنشن،ڈبل روٹی،کونسل،کالج،انجن،نیچرل،پولیٹیکل،اسپیچ،کلرک،
پائپ،ٹائپ،ولیم،یورپ،ڈنر،سوپ،لیڈر،ووٹ،یونیورسٹی،لیکچ،کانووکیشن،گریجویٹ،پروفیسر،
ممبر،اسپیکر،کونسل،ریزولیشن،سگنل،کوٹ،بٹن،مس،لیڈر،لٹریچر،ہسٹری،فلاسفی،بائیسکل،موٹر،ایروپلین،
ڈاکٹر،سرجن،آپریشن،اسپتال،سروس،پنشن،،سوڈا،لمنڈ،وہسکی۔ٹی،جرمن،فرنچ،لیٹن،انگلش،
ووٹر،موٹر،ممبری،لیڈیاں،گزٹ۔آنز،سر۔کیک،فورس،کورس،چارج،جارج،ریلیشن،کانووکیشن،
ایمی ٹیشن،نیشن،افسر،کلکٹر،ڈپٹی کمشنر،کمشنر،لاٹ جیسے بے شمار لفظ نظر آئیں گے یہ تو سو سال پہلے کی
بات ہے۔اب اس سے بھی زیادہ اردو پر انگریزی زبان کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

ہم اگر اپنی اصناف اور مختلف قدیم وجدید تنقیدی وادبی نظریات کو دیکھتے ہیں تو انگریزی
کے اثرات واضح، گہرے اور دیرپا نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات بہت نمایاں ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزی ادب کا مزاج اردو ادب سے بالکل مختلف ہے اور اس نے ایک مد مقابل کی حیثیت میں اردو پر براہ راست اپنے اثرات ثبت کیے ہیں۔بات کو الٹ کر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی ادب نے اردو ادب کو فکر و احساس اور ترسیل و اظہار کے وہ اسالیب دیے ہیں جو انگریزی فضا میں پروان چڑھے تھے لیکن جن کا اردو میں فقدان تھا۔''(۳۵)

موجودہ دور اُردو زبان میں انگریزی کا عمل دخل زیادہ بڑھ گیا ہے۔خاص طور پر موبائل
فون اور کمپیوٹر سے متعلق ہر چیز کا نام انگریزی زبان میں رواج پکڑ چکا ہے۔

''ہماری قومی زبان اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں ،سندھی، پنجابی ،بلوچی اور پشتو پر عربی اور فارسی کا یکساں اور گہرا اثر ہے۔ساتھ ہی انگریزی زبان سے بھی کافی الفاظ لیے گئے ہیں۔کچھ تو شعوری اور غیر شعوری طور پر اور کچھ اکتسابی طور پر قبول کیے گئے ہیں۔''(۳۶)

ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جو ہماری قومی زبان اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں میں مشترک الصوت
ہیں۔الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جسے اگر بنیاد بنا لیا جائے تو ہم پاکستان میں مختلف زبانوں کا
مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔پروفیسر پریشان خٹک لکھتے ہیں:

''ہماری قومی زبان اردو اور پاکستانی زبانوں کے حروفِ تہجّی عربی، فارسی اور سندھی سے لیے گئے ہیں مگر علاقائی ضروریات اور لہجے کی بہتر نمائندگی کی وجہ سے ان میں بعض

غیر معروف حروفِ تہجّی بھی نظر آئیں گے مگر سندھی زبان میں کئی حروف ایسے ہیں جو اس شکل اور استعمال میں قومی زبان اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں میں نہیں۔ بلوچی میں تین حروف زائد ہیں جبکہ تین حروف یعنی ح، ھ، اور ی مستعمل ہی نہیں پشتو میں چار حروف تو لکھائی میں کسی حد تک مختلف ہیں جیسے ت (ٹ)، د (ڈ)۔ ر (ڑ) اور ک (گ) اور چار حروف لہجے کے ضمن میں دیگر زبانوں سے مختلف نظر آئیں گے جیسے ح، ح، ر اور نبں، البتہ پنجابی زبان میں فقط وہ حروفِ تہجّی مستعمل ہیں جو کہ قومی زبان اردو میں بعینہٖ پائے جاتے ہیں۔''(۳۷)

اردو	سندھی	پشتو	پنجابی	بلوچی
آباد	اَباد	اَباد	آباد	آبات
خوبی	خوبی	خوبی	خوبی	جوانی
سربراہ	سربراہ	سربراہ	سربراہ	سروک
لاکھ	لک	لک	لکھ	لکھ
ناپ	ماپ	ناپ (کچ)	ناپ (کچھ)	کچھ

اردو زبان کے اخذ و تصرف کی مثال ان الفاظ سے واضح ہے۔ اردو نے تصرف کیا مگر اصل ہیئت کو زیادہ نہیں چھیڑا۔

اُردو	ہندی	پنجابی	اَپ بھرنش	پراکرت	سنسکرت
چھانو	چھئیاں	چھاں	چھاؤ	چھا آ	چھایا
سچ	سانچ	سچّ	سچّ	سچم	سیتم (۳۸)

اُردو اور پشتو میں معمولی سی تفاوت معلوم ہوتی ہے جیسے اردو میں کرسی بولتے ہیں اور پشتو میں کرسئی کہتے ہیں۔ روزے کو پشتو میں روژے لکھتے ہیں، رسی کو رسئی۔ مگر یہ دیکھ کر خوشگوار حیرانی ہوتی ہے کہ اس فہرست میں کل پانچ ہزار بائیس الفاظ ایسے ہیں جو ان دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔(۳۹)

مغربی بلوچستان میں بلوچی اور پشتو، جنوبی و مشرقی بلوچستان میں سندھی اور براہوی، شمالی و مشرقی بلوچستان میں سرائیکی، بلوچی، اور پشتو تینوں بولی جاتی ہیں۔ اور کوئٹہ میں براہوی، بلوچی، پشتو، فارسی، اردو، سرائیکی اور پنجابی تمام بولیاں بولی جاتی ہیں۔(۴۰)

پنجابی زبان کے اثرات

اُردو پر پنجابی زبان کے گہرے اثرات ہیں ۔ برصغیر میں جتنے فاتحین آتے وہ پنجاب کے راستے دہلی تک پہنچتے ،محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، مغل سب اسی راستے سے وارد ہوئے ،ان کی فوجیں جب پنجاب سے گزرتیں تو بہت سے پنجابی بولنے والے ان کے لشکر میں شامل ہو جاتے ۔ کیونکہ اس سرزمین میں پانچ دریا بہتے تھے اس لیے بھی اس کی اہمیت زیادہ تھی ۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول:

> ''اردو زبان اور اس کے ادب سے پنجابی زبان اور اس کے ادب کا وہی رشتہ ہے جو دریائے سندھ سے پنجاب کے ان پانچ دریاؤں کا ہے جو پنجند کے مقام پر ایک ہی دھارے میں منتقل ہو کر بالآخر دریائے سندھ میں جا گرتے ہیں ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس طرح پنجاب پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے اسی طرح یہاں پانچ مقامی بولیاں لہندا، پوٹھوہاری، لاہوری، ہندکو، اور سرائیکی بھی ہیں جن کے رنگوں اور لہجوں کے امتزاج کا نام پنجابی ہے۔''(۴۱)

حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' لکھ کر اردو اور پنجابی کے آپس میں باہمی رشتے کے حوالے سے جو تحقیق پیش کی ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں زبانوں کا آپس میں کیا اٹوٹ رشتہ ہے ۔

صوتی لحاظ سے اردو اور پنجابی کی قرابت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ پروفیسر شیرانی نے ایسے لسانی اشتراک کی بھی نشاندہی کی ہے جو دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو اور پنجابی میں عام ہے ۔ شیرانی نے اس معاملے میں مروجہ اردو سے اعراض کر کے اردوئے قدیم خصوصاً دکنی اردو جس کے دبیات کی قدامت اردو میں مسلم ہے) سے نمونے پیش کیے ہیں ۔(۴۲) انھوں نے پرانے پنجابی شاعروں کے کلام میں اردو کے اثرات کا جائزہ پیش کیا ۔ اس کے علاوہ اردو شاعروں کے ہاں پنجابی زبان کے آثار پر بھی بحث کی ۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو میں تحقیقی کارنامے سرانجام دیے ۔ جس کو مزید آنے والے محققین نے آگے بڑھایا ۔

یہ بات طے ہے کہ اردو مختلف بولیوں اور زبانوں کے امتزاج اور اختلاط کا نتیجہ ہے ۔

مختلف سیاسی اور تہذیبی عوامل نے اس کی نشو ونما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا آغاز پنجاب کی سرزمین سے ہوا بعد میں یہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں آئی جہاں اس نے گردونواح کی بولیوں کے اثرات کی وجہ سے ایک نئی زبان کی حیثیت اختیار کرلی جو آگے چل کر اردو کہلائی۔[۴۳] برصغیر میں مختلف فاتحین کی آمد اور حکومتوں کی ردو بدل میں پنجاب کی سرزمین ہمیشہ مرکزی اہمیت کی حامل رہی ہے اس لیے یہاں پر نئی زبان کی پرداخت میں سرزمین پنجاب کے بنیادی کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔[۴۴]

اُردو اور پنجابی کے تعلّق کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی کا یہ لسانی کام کسی بھی بڑے کارنامے سے کم نہیں ہے۔اس کام کو اردو لسانیات میں ایک اہم مقام ومرتبہ حاصل ہے۔انھوں نے بڑی محنت اور تحقیق سے پنجابی اردو کی لسانی مشابہتوں کو تلاش کر کے اردو اور پنجابی کے باہمی تعلق کو واضح کیا۔

براہوی زبان

براہوی زبان کا تعلّق دراوڑی زبانوں سے ہے۔یہ پاکستان کی ایک قدیم زبان ہے۔اس زبان کے بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد بلوچستان میں رہتی ہے۔براہوی فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پہاڑی آدمی کے ہیں۔

یہ قیاس ہے کہ براہوی وادی سندھ کی قدیم تہذیب موہنجودڑو کے بانیوں میں سے ہیں۔ جسے ہم براہوی میں موننادڑو کہہ سکتے ہیں جس کے معنی پرانے ٹیلے یا کھنڈر کے ہیں۔اور وہ یہ تہذیب میسوپوٹامیہ (عراق) ایشیائے کوچک اور مشرقی بحیرۂ روم سے لائے۔وادی سندھ کی قدیم زبان اب تک مکمّل طور پر پڑھی نہیں جاسکی ہے۔ڈنمارک کے ڈاکٹر آسکو پرپولا کہتے ہیں کہ موہنجودڑو کی زبان براہوی سے ملتی ہے۔اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یہ قدیم براہوی کی شکل ہوگی۔[۴۵]

مختلف قیاس آرائیوں کے نتیجے میں یہ قرار دیا جاتا ہے کہ یہ قدیم براہوی کی شکل ہوگی۔ اور موہنجودڑو کے لوگ بھی دراوڑی بولتے تھے۔براہوی نے بلوچی، فارسی، جٹکی، سندھی الفاظ کو جذب کیا ہے۔

قدیم براہوی کا رسم الخط ہیروغلفی تھا،موہنجودڑو کے رسم الخط کا تعلّق بھی براہوی کے قدیم ترین رسم الخط سے ملتا ہے۔دو ہزار سال قبل اس کے نمونے خروشتی رسم الخط میں بھی ملے ہیں، ہم کہہ سکتے ہیں

کہ دو ہزار سال پہلے جو زبان سندھ اور جہلم کی وادی میں بولی جاتی تھی وہ براہوی زبان تھی۔ گندھارا تہذیب کا بڑا حصہ اسی زبان پر مبنی تھا۔ ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں براہوی کے زبان عربی فارسی رسم الخط میں لکھے ہوئے سکے بھی ملے ہیں۔ موجودہ دور میں یہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

براہوی زبان کے درج ذیل حروفِ تہجّی ہیں:

اب بھ	پ پھ	ت تھ		ٹ ٹھ
ج جھ		چ چھ	خ	د۔دھ
ڈ۔ڈھ	ر۔رھ	ڑ	ز	ژ
س ش	غ	ف ک۔کھ	گ۔گھ	
ل۔ل	م	ن	و	
	.	ی	ے	

(لؕ کی آواز ریڈانڈینز کے لہجے میں ہے۔ لکھتے وقت جس پر تین نقطے لگاتے ہیں۔ انگریزی لفظ Lh اس لہجے کی ترجمانی کرتا ہے۔)

عربی اور فارسی زبانوں کے زیرِ اثر براہوی میں ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق شامل ہوگئے۔(۴۶)

سندھی

صوبہ سندھ میں بولی جانے والی زبان کو سندھی کہا جاتا ہے۔ لاڑ زیریں سندھ، وچولو وسطی سندھ سرویونی بالائی سندھ میں یہ علاقہ منقسم ہے۔ سندھی میں چھ بولیاں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ سریلی (سندھ کے شمالی حصے میں)

۲۔ وچولی (سندھ کے وسطی حصے میں)

۳۔ لاڑی (سندھ کے جنوبی حصے میں)

۴۔ لاسی (ریاست لس بیلا وغیرہ)

۵۔ تھری یا تھریلی (سندھ کے مشرقی حصے میں اور سندھ وراجستھان کے سرحدی علاقوں میں)

۶۔ کچھی (سندھ کی جنوبی سرحد پر گجرات کے اوپر علاقۂ کچھ میں)

ان تمام بولیوں میں سے وچولی کو معیاری بولی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ ادب

اور پڑھے لوگوں کی زبان ہے۔ سندھی وادئ سندھ کی قدیم ہند آریائی زبان ہے۔ سنسکرت اور سندھی بلکہ تمام جدید ہند آریائی زبانوں میں گہرا تعلق ہے۔[47] ڈاکٹر بلوچ کے خیال میں سندھی سنسکرت سے براہِ راست نہیں نکلی بلکہ یہ وادئ سندھ کی قدیم زبان ہے۔ جس کا تعلق ماقبل تاریخ سے ہے جس کے باقیات موئن جودڑو کی کھدائی سے مہروں کی شکل میں حاصل ہوئے ہیں۔ ان کے خیال میں سندھ کا تاریخی رشتہ سنسکرت سے پہلے کی کسی مقبول عام پروٹو پراکرت سے ملتا ہے۔ خاص سندھ کی قدیم زبان کی تشکیل میں سمیر اور بابل کے تمدن والی زبانوں اور سامی صفت زبانوں کے اجزا شامل ہیں۔[48] یعنی سندھ کی قدیم زبان سامی صفت اور موجودہ سندھی زبان کے ہند آریائی ہونے میں کوئی تضاد نہیں۔ شرف الدین اصلاحی اردو اور سندھی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"جن عوامل نے ہندوستان کی ایک آریائی زبان کو ہماری اردو کا قالب عطا کیا، وہ سب سے پہلے سندھ میں کارفرما، جس کا نتیجہ موجودہ سندھی زبان ہے۔ سندھی اور اردو کے اشتراک وتشابہ کا ایک پہلو ایسا ہے جو صرف انھی عوامل کا مرہونِ منت ہے۔ ہماری مراد عربی فارسی اثرات سے ہے جو انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد قبول کیے۔"[49]

اردو اور سندھی دونوں آریائی زبانیں ہونے کے باوجود عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ سندھی خطِ نسخ میں اور اردو خط نستعلیق میں جس کی بنیاد بھی عربی ہے۔

رشید اختر ندوی کے مطابق سندھ میں بولے جانے والی موجودہ سندھی اور اس سے ملحقہ علاقوں میں بولے جانے والی پنجابی بھی ڈراویڈن یا تورانی الاصل ہے اور وہ زبان ہے جو ہنٹر نے موہنجوڈیرو، وادی ژوب اور بعض دوسرے مقامات سے برآمد ہونے والی مہروں پر کندہ ملی ہے۔ یہ سب زبانیں پانچ ہزار سال قبل مسیح سندھ اور بلوچستان میں آنے والے ڈراویڈن کی زبان سے نکلی ہیں۔[50] عین الحق فرید کوٹی آرین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جن قبائل سے نووارد آریاؤں کو دوچار ہونا پڑا وہ ہڑپہ اور موئن جودڑو کے باشندے تھے اور ان دونوں کی زبانوں کی باہمی آمیزش کے نتیجے میں نئی بولیوں نے جنم لیا جو کہ موجودہ زبانوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔"[51]

آریا قوم سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں کولاری اور دراوڑی اقوام کا دور دورہ رہا اور کوہ ہمالیہ کے دامن میں منگولی نسل کے قبائل آباد تھے۔ عین الحق فرید کوٹی کے مطابق دراوڑ بھی یہاں کے

باشندے نہیں تھے بلکہ وہ آرین سے ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح آئے تھے اور ان سے پہلے یہاں مُنڈا قبائل موجود تھے جو قدیم آسٹریلوی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ منڈا قبائل کو برصغیر کے قدیم ترین باشندے قرار دیا جاتا ہے۔(۵۲)

ہڑپہ اور موہنجودڑو کے آثار برآمد ہونے کے بعد مزید تحقیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی کہ ان سے پہلے بھی یہاں کوئی تہذیب موجود تھی، موہنجودڑو کے قریب واقع 'آمری' اور بلوچستان میں 'نال' کے مقام پر دریافت ہونے والے آثارِ قدیمہ اور پھر سندھ میں کوٹ ڈیجی کے کھنڈرات اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں اسے آمری نال تہذیب کا نام دیا گیا ہے۔(۵۳) ان کے آثار ۲۲۰۰ قبل مسیح تک موجود تھے پھر یہ ہڑپہ تہذیب میں مدغم ہوگئے۔ اس تہذیب کا سرا حجری عہد اور کانسی کے دور سے بھی جوڑا جاتا ہے۔

کشمیر میں کشمیری زبان بولی جاتی ہے۔ جموں وغیرہ میں ڈوگری زبان بولی جاتی رہی مگر یہ لکھنی مشکل تھی کیونکہ ڈوگری کا رسم الخط مہاجنی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے اور مشکل بھی ہے۔ کشمیر میں کشمیری بولی جاتی تھی۔ جموں میں پنجابی گوجری اور ڈوگری کا رواج تھا اسی طرح گلگت بلتستان اور لداخ میں جہاں کی زبیں شینا، بروششکی اور لداخی تھیں اردو رابطہ کی زبان بنتی چلی گئی۔ (حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء، ص ۱۷) سر فریڈرک ڈریو جو ۱۸۶۲ء میں ریاست جموں وکشمیر میں رہے ان کے بقول جموں میں لوگ ڈوگری، پنجابی اور ہندوستانی یعنی اردو کو ملا کر بولتے ہیں۔ ہندوستان سے بسلسلہ ملازمت آنے والے لوگ ہندوستانی بولتے ہیں اور مقامی لوگ اسے بآسانی سمجھ لیتے ہیں۔(۵۴)

کشمیری کے حروفِ تہجّی درج ذیل ہیں:

اب بھ پ پھ ت تھ ٹ ٹھ ث ج جھ چ چھ ح خ د دھ ڈ ڈھ ر ڑ ڑھ ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے ن ژ ژھ یعنی Ts اور Tsh۔ ژ کے حوالے سے گریرسن کے مطابق کشمیری زبان میں چ کی شکل یعنی چ کو تین نقطوں سے پُر کرنے کی جگہ چار نقطوں سے پُر کیا جاتا ہے۔ اردو اور کشمیری کے حروفِ تہجّی ایک جیسے ہیں فرق صرف فارسی کی ژ کا ہے جو لکھنے میں تو ایسے ہی ہے مگر کشمیری زبان میں اس کا تلفظ ضرورت کے مطابق بدل جاتا ہے۔

آریاؤں سے قبل برصغیر میں افریقہ سے آئے ہوئے نیگرائیڈ، فلسطین سے پروٹو آسٹرائیڈ

آسٹرک کی بولیاں رائج رہیں ان کے کچھ عرصہ بعد تین ہزار سال قبل مسیح دراوڑ آئے جو کہ بحیرۂ روم او
ایشیائے کوچک سے آئے تھے۔ ہندوستان میں آکر انھوں نے موہنجوداڑو اور ہڑپہ میں تمدن کی بنیا
رکھی۔ یہ لوگ شمالی ہندوستان میں آسٹرک سے مخلوط ہوگئے اور جب آریا آئے تو دونوں نے ایک دوسرے
کے اثرات قبول کیے۔ منگول نسل کے لوگ جو یہاں موجود تھے، ان کی یادگار آسام اور پہاڑی بولیار
ہیں۔[۵۵] یہی وجہ ہے کہ سنسکرت میں بھی صوتی لحاظ سے آریائی زبانوں قدیم فارسی، لاطینی اور یونانی کی
نسبت فرق نظر آتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سنسکرت پر اس سے پہلے یہاں بولی جانے والی
بولیوں کے اثرات مرتب ہوئے جو کہ دراوڑی بولیاں تھیں۔ مثلاً حلقی اور لثوی آوازیں۔ سلیمان ندوی
ہندوستان کی اصل زبانوں کے حوالے سے تامل، تلنگو، کنڑی وغیرہ جیسی دراوڑی زبانوں کا ذکر کرتے
ہیں۔[۵۶] جو کہ آریاؤں سے پہلے یہاں بولی جاتی تھیں۔

ڈاکٹر شجاع ناموس کے نزدیک سنسکرت میں درج معلومات کے مطابق گلگت اور کشمیر میں
قدیم زمانہ میں ناگ قوم آباد تھی۔ یہ نسل کے لحاظ سے ہُن تھے۔ اور بارہ ہزار قبل مسیح آریا نے ان کو
لڑائی کر کے میدا سے پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا انھیں کشمیر کے سنسکرت لٹریچر میں پساچہ کا نام دیا
گیا۔[۵۷] یہاں لوگوں کے باہم اختلاط سے قدیم پساچہ وجود میں آئی۔ آٹھ ہزار قبل مسیح مغربی پنجاب
سے برہمن آریہ اور دیگر کئی قومیں یہاں آئیں تو ان کے اختلاط سے جدید پساچہ کے خدوخال وجود
میں آئے۔

گریرسن کشمیر کے نے ان قدیم باشندوں کو ناگا (The Pisaca Languages of North-western India, by George Abraham Grierson, p-2) اور چیٹر جی نے
نیگرائیڈ کہا ہے۔ جو کہ بروششکی زبان بولتے تھے۔ یہ وہ قدیم لوگ تھے جنھیں جنھیں پساچہ لوگوں نے
بے خانماں کر دیا تھا۔[۵۸] یعنی یہاں کے باشندے پہلے نیگرائیڈ تھے، ان کے بعد آسٹرک آئے پھر
دراوڑ۔ اور دراوڑ کے بعد آریا۔

پساچہ لوگ ایشیائی آریاؤں کی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ایشیائی آریاؤں کی تین شاخیں
تھیں۔ انڈو آریائی، ایرانی آریائی اور پساچہ گروپ۔[۵۹]

بروششکی زبان سے جب آریا لوگوں کا اختلاط ہوا تو قدیم پساچہ وجود میں آئی۔ جب اس
زبان کا آٹھویں صدی کے برہمن آریاؤں سے واسطہ پڑا تو جدید پساچہ یعنی شینا، کھووار اور کافری

زبانیں سامنے آئیں۔ پھر جب دریائے جہلم کے پار سے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے تو ان لوگوں کی زبانوں کے اختلاط سے جدید پساچہ نے جنم لیا یہی جدید پساچہ کشمیری زبان کی شکل اختیار کرتی گئی۔

آریہ یہاں سنسکرت زبان لے کر آئے تھے جو ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت میں تقسیم ہوئی اور اس پر پورے ہندوستان کی مختلف علاقائی بولیوں کے اثرات بھی ہوئے۔ اور یہ اس وقت کی اہم ترین زبان تھی۔ مگر موہنجوداڑو کی تہذیب سے پتہ چلتا ہے کہ آریاؤں سے پہلے بھی یہاں ایک ایسی تہذیب تھی جو کسی بھی صورت آریا تہذیب سے کم رفعت کی مالک نہیں تھی۔

جہاں تک کشمیری زبان کا تعلق ہے سنسکرت کو پساچہ زبانوں کا ایک دوسرے کی ہمسائیگی حاصل رہی لہٰذا سنسکرت، پساچہ اور بروششکی زبانوں کے اختلاط سے کشمیری زبان نے ارتقائی منازل طے کیں۔

ہند کی متعدد زبانیں سنسکرت کی مرہونِ منت ہیں، شورسینی پراکرت کی پیداوار ہیں جس نے آگے چل کر شورسینی اپ بھرنش کی شکل میں بہت سی علاقائی زبانوں کو جن میں پنجابی، اردو اور کشمیری زبانیں بھی شامل ہیں، پروان چڑھایا۔ جب پنجابی اور اردو ایک ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو اور کشمیری زبان کا بھی شورسینی اپ بھرنش ماخذ زبان ہونے کی حیثیت سے قریبی رشتہ ہے۔[٦٠] الفاظ کی ایک بڑی فہرست ہے جو کشمیری اور اردو میں مشترک ہے۔ جن حالات میں اردو زبان وجود میں آئی انھیں حالات میں کشمیری زبان نے بھی جنم لیا۔ کشمیری ہندو کشمیری زبان کو شاردا یا ناگری رسم الخط میں لکھتے رہے اور مسلمان فارسی رسم الخط میں۔

حوالہ جات

۱۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی کہانی، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۵ء، ص ۳۰

2- Grierson: Linguestic Survey of India, Culcutta, I Part. I Chapter XIV P-167

۳۔ سہیل بخاری، تشریحی لسانیات، ص ۳۲

۴۔ سجاد ظہیر: اردو، ہندی، ہندوستانی، مشمولہ اردو زبان کی تاریخ، ص ۳۱۰، ۳۱۲

۵۔ خلیل احمد بیگ، مرزا: اردو کا لسانی ارتقا شمالی ہند میں، مشمولہ اردو زبان کی تاریخ، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۲۔۱۵۲

۶۔ شیرانی، حافظ محمود، پنجاب میں اردو، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۲ء، ص ۱۷

۷۔ ان کا سن وفات ۱۶۲۵ ہے۔ بحوالہ مرزا خلیل احمد بیگ، اردو زبان کی تاریخ، ص ۱۴۵

۸۔ خلیل احمد بیگ، مرزا: اردو کا لسانی ارتقا شمالی ہند میں، مشمولہ اردو زبان کی تاریخ، ص ۱۴۳

۹۔ صفوان محمد چوہان، حافظ ڈاکٹر، اردو کے نئے، اہم اور بنیادی الفاظ، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۱۱ء، ص ۸

۱۰۔ محمد نصیب، اردو میں مشرقی زبانوں کا امتزاج، اخبار اردو اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۰، ص ۱۱

۱۱۔ علی جلال پوری، خرد نامہ جلال پوری، لاہور، تخلیقات، ۲۰۰۶ء، ص ۸۴

۱۲۔ شان الحق حقی، زبان کے معیار کا مسئلہ، اخبار اردو اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ۷

۱۳۔ سعید اختر درانی، ڈاکٹر، جدید ٹیکنالوجی اور اردو زبان، اخبار اردو اسلام آباد، جولائی ۲۰۰۷ء، ص ۳۳

۱۴۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، اردو زبان کی تاریخ، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۳۱۲

۱۵۔ مسعود حسین خاں: دکنی یا اردوئے قدیم، مشمولہ اردو زبان کی تاریخ از مرزا خلیل احمد بیگ، ص ۲۱۴

۱۶۔ غلام عمر خاں، دکنی کے بعض لسانی رجحانات، مشمولہ اردو زبان کی تاریخ، ص ۲۴۰

۱۷۔ شیرانی، حافظ محمود، پنجاب میں اردو، ص ۳۳، ۳۵

۱۸۔ شان الحق حقی، نکتہ راز، کراچی، عصری کتب، ۱۹۷۲ء، ص ۳۹، ۴۰

۱۹۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی زبان، کراچی، فضلی سنز، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۸، ۱۲۹

۲۰۔ مسعود حسین خاں: اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کا مسئلہ مشمولہ اردو زبان کی تاریخ، ص ۸۴

۲۱۔ احسان الحق، ڈاکٹر، اردو عربی کے لسانی رشتے، کراچی، قرطاس، ۲۰۰۵ء، ص ۴۸
۲۲۔ جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغتہ العربیہ (دارالہلال مصر، ص ۴۲
۲۳۔ اُردو عربی کے لسانی رشتے، ص ۷۰
۲۴۔ قیوم ملک، اردو میں عربی الفاظ کا تلفظ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۵ء
۲۵۔ محمد قادری زور، سید، ارباب نثر اردو، حیدر آباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۲۷ء، ص ۱
۲۶۔ اکرام الحق یٰسین، ڈاکٹر، اردو زبان کے ذخیرے میں عربی زبان کا کردار، مشمولہ جرنل آف ریسرچ، شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، شمارہ ۱۸، دسمبر ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۱
۲۷۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ص ۴۲
۲۸۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، اردو زبان کی تاریخ، ۲۰۰۷ء، ص ۳۱۰
۲۹۔ عابد علی عابد، سید، البدیع، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۹
۳۰۔ نوری، محمد فخر الحق، ڈاکٹر، مطالعہ راشد (چند نئے زاویے) فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۹۱
۳۱۔ اشفاق حسین، شیشوں کا مسیحا۔ فیض نئی دہلی، شاہد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۸۹۴
۳۲۔ عبدالحق، مولوی، آسان اردو، مشمولہ نقش، ۹، ۶۱، کراچی، ص ۴۷
۳۳۔ برجموہن دتاتریہ کیفی، منشورات، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء، ص ۲۷
۳۴۔ اخلاق حیدر آبادی، اشرف کمال کی شاعری میں انگریزی الفاظ کا لسانی تناظر، اخبار اردو، اسلام آباد، ستمبر/اکتوبر، ۲۰۱۴ء، ص ۹
۳۵۔ وزیر آغا، نئے تناظر، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۱ء، ص ۹۶
۳۶۔ پریشان خٹک (مرتب)، لسانی رابطہ، اردو سندھی پشتو پنجابی اور بلوچی کے مشترک الفاظ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص ۶
۳۷۔ پریشان خٹک، لسانی رابطہ، ص ۷
۳۸۔ برجموہن دتاتریہ کیفی، منشورات، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء، ص ۱۸
۳۹۔ پریشان خٹک، پروفیسر، اردو اور پشتو کے مشترک الفاظ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۳
۴۰۔ انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۸ء، ص ۸
۴۱۔ وزیر آغا، نئے تناظر، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۱ء، ص ۹۳

۴۲۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، پنجاب تحقیق کی روشنی میں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۳۵

۴۳۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، لسانیات زبان اور رسم الخط، ص ۵۶

۴۴۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، حافظ محمود شیرانی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۲

۴۵۔ عبدالرحمٰن براہوی، ڈاکٹر، براہوی زبان وادب کی مختصر تاریخ، لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۸۲ء، ص ۴۶

۴۶۔ عبدالرحمٰن براہوی' ڈاکٹر، براہوی زبان وادب کی مختصر تاریخ، ص ۵۳

۴۷۔ شرف الدین اصلاحی، اردو سندھی کے لسانی روابط، لاہور، نیشنل بک فاؤنڈیشن، بار دوم، ۱۹۷۶ء، ص ۵۵

۴۸۔ نبی بخش خاں بلوچ، ڈاکٹر، سندھی بولی جی مختصر تاریخ، حیدر آباد سندھ، ۱۹۶۲ء، ۱۸ ص ۶۲

۴۹۔ شرف الدین اصلاحی، ص ۴۰، ۴۱

۵۰۔ رشید اختر ندوی، ارض پاکستان کی تاریخ، اسلام آباد، ص ۱۷

۵۱۔ عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور، اورئینٹ ریسرچ سنٹر طبع سوم ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۲

۵۲۔ ایضاً، ص ۹۶

۵۳۔ اُردو زبان کی قدیم تاریخ، ص ۹۷

۵۴۔ سر فرانسس ڈریو، The Jammu and Kashmir Territories، ایڈورڈ سٹیفورڈ لندن

۵۵۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، از جان بیمز، ترجمہ مع حواشی ومقدمہ سید احتشام حسین، لکھنؤ، ۱۹۳۷ء، ص ۲۹

۵۶۔ سلیمان ندوی، سید، نقوش سلیمانی، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۲۹ء، ص ۳۴۷

۵۷۔ شجاع ناموس، ڈاکٹر، گلگت اور شنا زبان، بہاولپور، اردو اکادمی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۰۹

۵۸۔ Indo-Aryan and Hindy, by S.K. Chatterji, p-37

۵۹۔ محمد یوسف بخاری' ڈاکٹر سید، کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ، لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۸۲ء، ص ۲۵

۶۰۔ ایضاً، ص ۷۰

لسانیات

زبان زندگی کی علامت ہے ۔جس کی زبان نہیں وہ زندہ نہیں۔ قبرستان کو اسی لیے شہرِ خموشاں کہا جاتا ہے کہ وہاں کا کوئی مستقل باسی ایسا نہیں جو آواز نکال سکے، جو اشارہ کر سکے، جو کسی قسم کے ردعمل کا اظہار کر سکے۔ انسان گونگا ہے یا بہرا، پاگل ہے یا ذی شعور کسی نہ کسی قسم کی آواز، اشارہ، یا حرکت سے کام لے کر اپنی زندگی کا ثبوت دے سکتا ہے۔

زبان آوازوں سے عبارت ہے اگر آواز نہیں تو زبان کا عمل رک جائے گا۔ کیونکہ آواز ہی حروف اور لفظوں کو اعتبار بخشتی ہے۔ زبان کے بغیر حروف اور لفظ آڑی ترچھی لکیروں کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لیے جب ایک رسم الخط سمجھنے والے کسی ایسے رسم الخط کو پڑھتے ہیں جس سے وہ ناواقف ہوں تو انھیں یہ تحریر صرف ٹیڑھی میڑھی لکیروں کا ترتیب دیا گیا ایک نظام معلوم ہوتا ہے۔ جو دائیں سے بائیں بھی ہوسکتا ہے، بائیں سے دائیں بھی، اوپر سے نیچے بھی۔

اگر ہم غور کریں تو سب زندگی رکھنے والے کسی نہ کسی صورت میں آواز کا استعمال کرتے ہیں۔ نباتات، حیوانات، چرند پرند سب زبان رکھتے ہیں، آواز نکالتے ہیں، آواز سنتے ہیں۔ نباتات میں یہ عمل اور انداز سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کلی چٹکنے کی آواز، آندھی اور تیز ہوا میں سائیں سائیں کرتے درخت اور گھاس۔ پتے ٹوٹنے کی آواز، پتے جھڑنے کی آواز، مگر یہ سب آوازیں آوازوں

کے عام نظام سے مختلف ہیں۔ بعض اوقات صرف خوردبین کے ذریعے اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

حیوانات، چرند پرند میں آواز پیدا کرنے کی صلاحیت کسی حد تک انسانوں سے ملتی جلتی ہے۔ بعض گھروں میں اب بھی بولنے والے طوطے موجود ہیں۔ لوگ انھیں سکھاتے ہیں اور لوگوں کی مرضی کے مطابق وہ کچھ نہ کچھ الفاظ ادا کرسکتے ہیں یا اشاروں کے ذریعے اپنی بات اپنے مالک تک پہنچا سکتے ہیں۔ بعض پالتو کتے، بلیاں، شیر، ریچھ، بندر وغیرہ اپنی خواہشات کو مخصوص آوازوں کے ساتھ ادا کرتے ہیں جنھیں ان کے مالک بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

انسان نے آواز کو اپنی من مرضی کے مطابق ڈھال کر اسے تراش خراش کر معنی پہنانے کا نظام وضع کرلیا ہے۔ جبکہ حیوان عقل اور شعور نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کرنے سے قاصر رہے۔ انسان شعوری آوازوں پر قادر ہے جبکہ حیوان اور پرندے شعوری آوازوں پر قادر نہیں ہیں۔ حیوان کسی درد، خوشی بھوک پیاس، خوف یا کسی وجہ سے اضطراری آوازیں نکال سکتے ہیں۔ جبکہ انسان ان فطری اور اضطراری آوازوں کے ساتھ ساتھ مصنوعی آوازیں نکالنے والے نظام "زبان" کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے۔

انسانوں اور حیوانوں میں ایک بڑا فرق خود کلامی کا بھی ہے۔ بعض اوقات حیوان بھی بیٹھے بیٹھے یا مستی میں کچھ آوازیں نکالتے رہتے ہیں، جو لمبی آہوں، یا ہنکارنے، شونکنے کی آوازیں کہی جاسکتی ہیں۔ انسان میں بھی یہ آوازیں ہوتی ہیں اور بعض اوقات انسان بھی سردی میں ٹھٹھرنے، درد میں کراہنے، سوتے میں خراٹے لینے، یا سانس لینے کی آوازوں میں اسی قسم کی آوازوں کا اظہار کرتا ہے۔ مگر خود کلامی بامعنی آوازوں کا مجموعہ ہے جس میں انسان خود اپنے آپ سے باتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ آج کے دور نفسا نفسی میں یہ سلسلہ زیادہ بڑھ گیا ہے۔ کیونکہ آج کل کسی کے پاس کسی دوسرے کے غم کو سننے یا اس کا دکھ بانٹنے کا وقت یا شعور نہیں ہے۔

لسانیات میں اصولوں، ضابطوں اور قاعدوں کی مدد سے تجرباتی بنا پر زبان، اصوات اور الفاظ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ پہلے زیادہ تر زبان اور انسان کے مطالعات میں اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ اس کی سوچ اور فکر کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے۔ مگر جدید لسانیات نے اس کے برعکس زبان کے مطالعہ اور اس کی ہیئت پر توجہ مرکوز کی۔ زبان کو ذہنی، نفسیاتی، معاشرتی، سماجی اقدار سے الگ کرکے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ الفاظ و حروف کے معانی کے گورکھ دھندے میں پھنسے بغیر ان کی ساخت، بناوٹ اور فنکشن پر غور کیا جائے۔ یعنی جدید لسانیات پہلے کی طرح انسانی تحریر کو مقدم نہیں سمجھتی بلکہ

تقریری شکل کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ پہلے زبان میں قواعد، املا اور تلفّظ کے حوالے سے غلط یا درست کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ لسانیات غلط یا درست کا جائزہ نہیں لیتی بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ زبان حقیقت میں ہے کیا۔ مختلف زمانوں کے فریم ورک میں رہتے ہوئے قدیم زبانوں کا جائزہ لیتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عصری زبان کا مطالعہ بھی کرتی ہے۔

لسانیات کیوں؟

زبان اور زبان کا علم انسان اور انسانی معاشرے کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے اور لسانیات کا شعبہ کیوں وجود میں آیا ہے اور لسانیات کا دائرہ کار کیا ہے؟ اگر لسانیات نہ ہو تو زبان پر کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ کیا زبان پہلے ہے یا لسانیات، زبان اہم ہے یا لسانیات۔ زبان کے ہوتے ہوئے لسانیات کی کیا ضرورت ہے؟ کیا لسانیات زبان کی وضاحت کرتی ہے۔ تشریح کرتی ہے یا زبان کے مختلف لہجوں اور بولیوں کے درمیان فرق کو واضح کرتی ہے۔ کیا لسانیات کا علم زبان کے دائرہ کار، طریقہ کار یا قاعدے، اصول وضوابط کا احاطہ کرتا ہے یا یہ صرف ایک پیچیدہ اور گنجلک علم ہے جس کا مقصد زبان کو فروغ دینا نہیں بلکہ اس حوالے سے مسائل اور ابہام کو جنم دینا ہے کیا زبان اور لسانیات کا دائرۂ کار الگ الگ ہے۔ زبان اور لسانیات حقیقت میں کیا ہیں اور ان میں کس قدر مماثلت یا مطابقت پائی جاتی ہے۔ کیا زبان ایک فرد سے دوسرے فرد تک تبدیل ہوتی ہے یا یہ کسی ایک گروہ، قوم، ملک، شہر یا سماج کی نمائندگی کرتی ہے؟

انسان نے اپنے آواز کو بامعنی اکائیوں میں تقسیم کرکے اسے مختلف مفاہیم سے آراستہ کرنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ انسان کے مقابلے میں جانور، حیوانات اپنی آواز کو صرف چیخنے چنگھاڑنے اور مہمل آوازیں نکالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

لسانیات یا علم زبان میں سب سے اہم آوازیں ہیں جنھیں ہم صوتیات کا نام دیتے ہیں۔ صوتیات کے ضمن میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ یہ آوازیں پیدا کیسے ہوتی ہیں۔ کون کون سے اعضاء آوازوں کو پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ آواز پیدا کرنے میں گلا، نرخرہ، زبان، ہونٹ اور سانس اہم کرادر کے حامل ہیں۔ اور آواز کو مزید صاف کرنے میں دانت اور ناک بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

لسانیات اور سائنس

لسانیات پر کام کرنے کے لیے لسانی دلچسپی کا ہونا ضروری ہے کیونکہ لسانی دلچسپی کے ہوتے ہوئے ماہر لسانیات صحیح طور پر تجزیاتی عمل سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔لسانی عمل سے یہی لطف اندوزی اسے مزید مطالعات اور لسانیات کے حوالے سے نئی دریافتوں ، نئے سانچوں اور نئے نظریات سے آگاہی ممکن ہے۔اور ایسا کرنا لسانی عمل کے لیے نہایت مفید ہے۔لسانیات زیادہ تر عملی تجزیوں پر انحصار کرتی ہے۔زبان اور صوتیات کا عملی تجزیہ لسانی مسائل کو حل کرنے میں مدد دیتا ہے اور لسانیاتی نظریے کو ٹھوس بنیادیں فراہم کرنے کا سبب بنتا ہے۔

زبان کا جائزہ لیتے وقت ہم درج ذیل حوالوں سے جائزہ لیتے ہیں:

لسانیات ایک سرگرمی اور ذہنی مہارت کا نام ہے۔جس میں اپنے موضوع کے حوالے مطالعہ تربیتی انداز میں کیا جاتا ہے۔لسانیات کو سیکھنے کے لیے دوسرے مضامین کے برعکس صرف مطالعہ، تعلیم اور تدریس ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے تربیت بھی ضروری ہے۔عملی کام بھی کرنا پڑتا
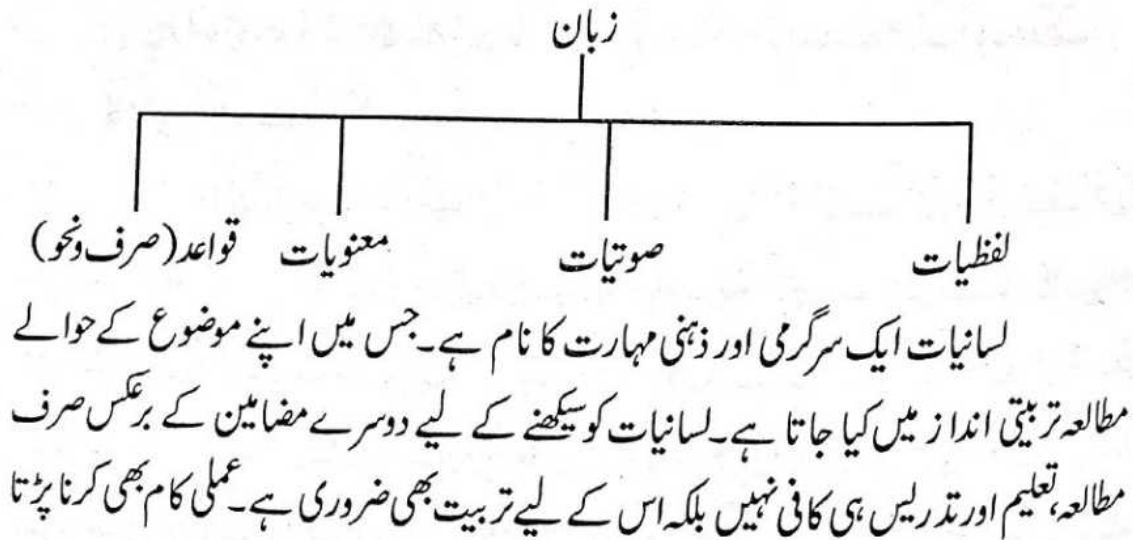
ہے جب کہیں جا کر لسانیات میں مہارت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی مہارت ہے جو براہِ راست انسان اور اس کی زبان، سماج اور ثقافت سے متعلّق ہے۔ مختلف انسانوں کی بولیوں، سماج میں ان بولیوں کے اثرات اور اس ثقافت میں ان بولیوں کے فنکشنز (تفاعل) پر غور و خوض لسانی حوالے سے نئی معلومات کی دستیابی کا باعث بنتا ہے۔

باریک بینی اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو سمجھنا، لسانی مواد کو مختلف لسانی کسوٹیوں پر پرکھنا، جانچنا بہت ضروری ہے۔ لسانیات کے جس موضوع پر کام کیا جا رہا ہو اس موضوع کے بارے میں بہت گہری معلومات حاصل کرنا اور صحیح سمت میں مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ صرف زبان سیکھنے کا جذبہ اور قواعد سے دلچسپی اس حوالے سے کافی نہیں ہوگی۔ جدید زبانوں کے حوالے سے مطالعات کرتے وقت قدیم زبانوں کا مطالعہ بھی کیا جائے۔ تقابلی مطالعہ کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ بقول ڈیوڈ کرسٹل: لسانیات اپنی مختلف خصوصیات کے اعتبار سے ایک سائنس ہے۔ اور اسے لسانیاتی سائنس کا نام دیا جا سکتا ہے۔[۱]

لسانیات اُن معنوں میں سائنس نہیں ہے جن معنوں میں فزکس، ریاضی یا دوسرے خالص سائنسی مضامین ہیں بلکہ لسانیات کا طریقہ کار سائنسی طرز کا ہے۔ تقابلی لسانیات میں تو واضح طور پر لسانیات کا کام سائنسی کام ہوتا ہے جبکہ تاریخی لسانیات میں زیادہ تر زبان کے حوالے سے قیاس آرائیوں اور مفروضوں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ مگر سائنس بھی ساتھ ساتھ اپنا عمل دخل رکھتی ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ''زبان میں سائنس کی سی قطعیت، وضاحت اور جبریت کی تلاش غلط ہے البتہ علم زبان (لسانیات) کے مطالعے میں سائنس طریق کار (استقراء) سے صرف ایک حد تک کام لیا جا سکتا ہے۔''[۲]

لسانیات چونکہ بیک وقت ادب اور سائنس دونوں شعبوں سے تعلّق رکھتی ہے۔ اس کا دائرۂ کار زیادہ تر ادب ہوتا ہے مگر یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے سائنسی ہے۔ اس کے تمام تجزیے اور مطالعے سائنسی نوعیت کے ہوتے ہیں اس لیے دونوں شعبوں سے تعلّق رکھنے والے لوگ اس حوالے سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ مگر صرف ادبی تخیلاتی دعوے اور شعری مبالغے بھی بعض اوقات اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ لسانی کام خالصتاً سائنسی ہے اس لیے اس میں کسی قسم کے مبالغے

نہیں کام کرتے، جو بھی کام کیا جاتا ہے وہ خالص سائنسی طرز پر مشاہدوں اور تجزیوں کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ سائنس اور تحقیق کے مدارج کو ذہن میں رکھتے ہوئے لسانی نظریوں کو تجربوں کی روشنی میں آگے بڑھایا جاتا ہے۔

لسانیات کا دائرۂ کار بہت وسیع ہے اتنا ہی جتنا کہ خود انسان کا۔ اطلاقی لسانیات کے حوالے سے بہت سے شعبوں میں تحقیقاتی کام ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پڑھے لکھے لوگ زبان کیسے استعمال کرتے ہیں۔ ان پڑھ لوگوں کے ہاں زبان کی کیا کیفیت ہے۔ نابینا لوگوں کو کیسے زبان سکھائی جائے، جو بچے ذہنی معذور ہیں انھیں کس طرح زبان کے زیور سے لیس کیا جائے۔

آج کل کمپیوٹر نے زبان کے حوالے سے مہارتوں کے بے شمار لسانی امکانات پیدا کر دیے ہیں۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی وجہ سے مختلف زبانیں، بولیاں اور لہجے رکھنے والے لوگ نزدیک سے نزدیک آتے جا رہے ہیں، اس حوالے سے تحقیقاتی منصوبے لسانیات ہی کی مدد سے پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتے ہیں۔ آج کل مختلف زبانوں سے ترجمے کا رواج بڑھ گیا ہے۔ مشینی ترجمے نے اس حوالے سے زیادہ کردار ادا کیا ہے۔ اس سے معانی و تفہیم کے مسائل لسانیات ہی کی مدد سے حل کیے جا سکتے ہیں۔ لسانیات مختلف تکنیکوں، اصولوں اور تجزیوں کو بروئے کار لا کر اس صورتحال اور زبانوں کے ترجمے کے مسائل کا حل پیش کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ، تدریس، نفسیات اور بشریات کے شعبے میں بھی لسانیات سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اطلاقی لسانیات کو ان تمام مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے جن میں زبان کا کوئی نہ کوئی عمل دخل ہے۔

زبانوں اور خاص طور پر غیر ملکی زبانوں کی کی تعلیم و تدریس میں بھی لسانیات اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ لسانیات ہی کے ذریعے اُن زبانوں کو اس آسان اور معیاری طریقے سے پیش کیا جا سکتا ہے جو کہ مطالب کی تفہیم کے لیے ضروری ہے۔ زبانوں کی تدریس کا عمل اسی وقت بہتر اور معیاری ہو سکتا ہے جب کہ تربیت یافتہ اور لسانی مہارت رکھنے والے افراد یہ فریضہ سرانجام دیں۔ مہارت نہ رکھنے والے اساتذہ بہت سی لسانی الجھنوں کو سلجھانے میں کامیاب نہیں ہوں گے جس کی وجہ سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکیں گے۔

پاکستان میں یونیورسٹی کی سطح پر تو لسانیات کی تعلیم کسی نہ کسی حد تک جاری ہے۔ انگریزی میں تو الگ سے لسانیات کے شعبے موجود ہیں مگر ابھی اردو میں لسانیات کے الگ سے شعبہ جات کے

قیام کے منصوبے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے صرف اردو ہی کے شعبہ میں لسانیات کو بطور مضمون کے روشناس کرایا جاتا ہے۔ وہاں بھی اگر کسی کو اختیار مضمون لینے کا اختیار ہو تو وہ لسانیات کے بجائے کوئی دوسرا مضمون لینا پسند کرتا ہے کیوں کہ لسانیات کی اردو کی کتابوں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور اگر ہیں بھی تو ان میں سے بعض گنجلک اور پیچیدہ ہیں جس کی وجہ سے اس مضمون میں نمبر زیادہ نہیں آتے اسی لیے زیادہ تر طلبہ وطالبات لسانیات کا رخ نہیں کرتے۔ اسی طرح عربی، فارسی اور دوسری زبانوں کی تدریس میں بھی لسانیات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ مختلف اسالیب اور بولیوں کے متعلق آگاہی اور بنیادی معلومات لسانیات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ نصاب بناتے وقت لسانیات کے شعبہ کو مدنظر رکھا جائے۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس کی پرائمری تعلیم سے لے کر جامعات کی تعلیم تک ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی علم چاہے وہ سائنس کا ہو یا دینیات کا، جغرافیے کا ہو یا سیاسیات کا، اسے زبان کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی سرگرمی زبان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور زبان کا فصیح اور درست علم بغیر لسانیات کے ممکن نہیں ہے۔ لسانیات اور سائنس کے حوالے سے ڈاکٹر اقتدار حسین خان لکھتے ہیں:

''لسانیات بھی ایک سائنس ہے کیونکہ لسانیات میں زبان کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جو کچھ انسان واقعی بولتا ہے صرف اسی کا مطالعہ کیا جاتا ہے نہ کہ اس بات کا کہ کسی کو کیسے بولنا چاہیے۔ لسانیات میں عارضی نتائج کی تصدیق کی جاتی ہے۔ یہاں تجربہ گاہ دو طرح کی ہوسکتی ہے۔ ایک کوئی باقاعدہ تجربہ گاہ جیسے فونیٹیک لیب یا لینگوئج لیب۔ دوسرے کوئی بھی مخصوص لسانی گروہ (speech- commutity) جہاں لوگوں کو واقعتاً بولتے ہوئے سنا جائے۔''(۳)

موجودہ دور میں جب کہ انسانوں کے ایک دوسرے سے فاصلے بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ ذہنی ہم آہنگی کم سے کم ہوتی جارہی ہے، زبان کا کردار اور زیادہ ضروری ہوگیا ہے ایسی زبان جو انسان کے پیچیدہ، گونا گوں اور متنوع مسائل اور مقاصد کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ لسانیات جہاں زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے اور مختلف بولیوں میں تفہیم کے لیے مؤثر کردار ادا کرتی ہے وہاں یہ زبانوں میں ترقی اور ارتقا کے امکانات کو بھی بڑھاتی ہے۔ لسانیات کے حوالے سے منشی چرنجی لال لکھتے ہیں:

''فلولوجی یعنی علم زبان وہ علم ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زبان کیا چیز ہے۔

علم زبان، جاننے والے الفاظ ہی سے جن سے زبان بنتی ہے، بحث نہیں کرتا اور نہ صرف اس کے معنی ہی جاننا چاہتا ہے بلکہ ان کی تواریخ دریافت کرتا ہے۔الفاظ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہی معلوم کرتا ہے کہ کون سے حصے سے کون سا لفظ بنتا ہے یا بنا ہے اور وہ ٹکڑے آپس میں ایک دوسرے سے کیا نسبت رکھتے ہیں۔"(۴)

لسانیات کسی دوسرے علم کے تابع نہیں ہے بلکہ یہ ٹھوس اصول، اور قواعد وضوابط کی مدد سے آگے بڑھتا ہے۔موجودہ دور میں لسانیات نے بہت ترقی کر لی ہے۔ پہلے یہ علم صرف زبان کے قواعد تک ہی محدود تھا۔مگر آج کل اس میں جدید طریق کار بالکل سائنسی طرز کا ہے۔لسانی عمل ایک سائنٹفک طریقے سے آگے بڑھتا ہے۔اس میں مشاہدات اور تجربات کو بنیادی اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔ اب یہ علم تحریری علامتوں سے آگے بڑھ کر آوازوں کے طلسم کو کھوجتا اور جانچ پڑتال کرتا نظر آتا ہے۔ تحقیقی عمل کے ذریعے لسانی مفروضہ کو ثابت کرنے کے لیے سابقہ حقائق کو سامنے رکھ کر ایک منظّم انداز میں زبان کے نشیب وفراز اور آوازوں کے تغیّر وتبدل کا معائنہ اور مطالعہ کیا جاتا ہے۔

لسانیات میں سائنس ہی کی طرح ہزاروں سال پہلے کی تحریروں کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے اور ان کی پڑھائی کو ممکن بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔لسانیات سائنس کی طرح تحریر شناسی اور زبان شناسی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ لسانیات کیا ہے؟ ص ۱۱۱

۲۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، فضلی سنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۳۲

۳۔ اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵

۴۔ منشی چرنجی لال، رسالہ "ہندوستانی فلولوجی"، طبع اول پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۸۸۶ء، مقدمہ، ص ۲

تاریخی لسانیات

انیسویں صدی میں تاریخی لسانیات نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ مغربی ماہرین لسانیات یہ یہ سوچنا شروع کیا کہ زبان کیا ہے، زبان کا انسان اور اس کی زمین سے کیا تعلّق ہے۔ یہ کب، کہاں اور کیسے وجود میں آئی، اس کے ارتقاء کے کیا کیا مراحل رہے ہوں گے؟ سر ولیم جونس جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں بنگال میں جج کے عہدے پر فائز تھا، اس نے سنسکرت کا اور دوسری زبانوں کا مطالعہ کیا تو ۱۷۸۶ء میں یونانی، لاطینی اور سنسکرت زبانوں کے حوالے سے کچھ انکشافات کیے اور یہ نتیجہ نکالا کہ شروع ہی سے زبان کا رویہ تبدیلی کی طرف مائل رہا ہے۔ زبانیں وقت کے ساتھ ساتھ مختلف حوالوں سے بدلتی رہی ہیں۔ بقول ڈاکٹر اقتدار حسین خاں:

> ''تاریخی لسانیات میں ہم ان اصولوں اور قاعدوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن کے ماتحت زبانوں میں مختلف قسم کی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اس کے علاوہ تاریخی لسانیات میں مختلف زبانوں میں آپسی رشتہ اور تعلّق کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔''(۱)

یہ تبدیلیاں صوتی، لفظی، قواعدی، مافوفونیمک اور معنوی ہوسکتی ہیں، بعض اوقات یہ تبدیلیاں آوزدں کے بدلنے سے اور بعض اوقات مستعار لیے گئے لفظوں کی وجہ سے بھی ممکن ہیں۔

قدیم اور جدید زبانوں کی اصطلاح وضع کی گئی، قدیم زبان اسے کہا گیا جواب متروک ہو چکی ہو۔ زبانوں کے بارے میں یہی تصور کیا جاتا ہے کہ یہ تاریخ کی پیداوار ہیں۔ تاریخ کے ساتھ

ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں کچھ مردہ ہوتی جاتی ہیں اور کچھ نئی زبانیں وجود میں آتی رہتی ہیں۔

ماہرینِ لسانیات نے زبان کا تاریخی لسانیات کے حوالے سے مطالعہ کرتے وقت، ان کی پیدائش، دوسری قریبی زبانوں سے تعلق، اور پڑوسی زبانوں سے اشتراکات، اس زبان کی عمر، اس کے مردہ ہونے کے اسباب، زبان کے وراثتی اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اور یہ سب تجزیہ قیاس آرائیوں سے شروع ہوتا ہے۔ اور تاریخی لسانیات ماضی سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کرتی ہے۔ کہ کس طرح زبان متروک ہو کر دوسری زبانوں میں ڈھل گئی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

"زبانوں کا تجزیہ، ان کی تاریخ، ان کے باہمی نقاطِ ارتباط، ان کی معنوی ساخت اور ان کی ظاہری تقسیم وگروہ بندی پر غور وخوض کرنا لسانیات کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ چونکہ زبان لفظوں سے بنتی ہے اس لیے لسانیاتیوں کا تعلق بالعموم لفظوں ہی سے ہوتا ہے وہ ان پر اس لیے غور نہیں کرتے کہ ان کے معانی ومطالب دریافت کریں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی تاریخ معلوم کریں۔"(۲)

ویسے یہ بات ایک خواب ہی لگتی ہے کہ تمام زبانیں کسی ایک زبان سے نکلی ہوں گی۔ تاریخی لسانیات میں یہی مفروضہ پیش نظر رہتا ہے کہ آج بولے جانے والی مختلف زبانوں میں جو مشترک خصوصیات پائی جاتی ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ زبانیں کسی مورث زبان کی موجودہ شکل ہیں جو کہ اب ختم ہو چکی ہے یا تاریخ کے پردوں میں چھپ گئی ہے۔ اور وہ تاریخ کے کسی سانحے یا مسلسل تبدیلی کی وجہ سے آگے مزید زبانوں میں منتقل ہوگئی۔ یہ سانحہ کسی حملہ آور یا فاتح قوم کی زبان کے اس زبان پر غالب آجانے کا بھی ہو سکتا ہے جس نے بتدریج اُس زبان کو ختم کر دیا یا اس کے چلن میں تبدیلی پیدا کر دی، اور کوئی دوسری وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ زبانیں ہمیشہ مختلف اثرات قبول کرتی رہتی ہیں۔ ان میں مختلف حوالوں سے تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے اور یہی تاریخی سچائی ہے۔

ایڈورڈ ساپر کے بقول: تاریخی لسانیات کا محور ومرکز یہی نکتہ ہے کہ زبان میں تدریجی صوتی تبدیلی ہوتی رہتی ہے، لسانیات زیادہ تر مواد انھیں صوتی تبدیلیوں سے لیتی ہے۔ اور یہی لسانیاتی تاریخ کا بنیادی حصہ ہیں۔(۳)

تاریخی لسانیات میں زبانوں کے موازنے سے تبدیلی کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ پرانی تحریروں کو دیکھا جاتا ہے ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ بہت پرانے ادیبوں کی تحریروں کو اب صرف لغت کے ذریعے

ہی سمجھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔ہم جیسے جیسے کسی زبان کا اس کے ماضی میں جا کر تاریخی حوالے سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی نامانوس بولی سے واسطہ پڑ گیا ہو۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ زبانیں مسلسل بدل رہی ہیں۔

تاریخی لسانیات میں پرانے متون کا مطالعہ کیا جاتا ہے انھیں متون کی درست پڑھائی سے تلفّظ اور آوازوں کا پتہ چلتا ہے۔تحریری شکل کو ہی اہمیت دی جاتی ہے۔اگر تحریر پڑھ لی جائے تو اس زبان میں ہونے والے لفظی اور صوتی تبدیلیوں کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔

تاریخی لسانیات ہمیں زیادہ سے زیادہ چھ ہزار سال پیچھے تک رہنمائی کرتی ہے اس سے پیچھے تاریخی لسانیات خاموش ہے یا پھر زیادہ تر قیاس آرائیوں پر مبنی ہے۔جس میں سچائی کم اور مفروضات زیادہ ہیں۔ایک ہی زبان مختلف علاقوں میں مختلف روپ رکھتی ہے۔سب جگہ ایک ہی طرح نہیں بولی جاتی بلکہ ہر علاقے میں بولے جانے والی زبان میں کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور ہوتا ہے۔بعض علاقوں میں ایک ہی زبان پر اس علاقے کی بولیوں اور زبانوں کے اثرات ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس میں تبدیلی آجاتی ہے۔

بقول بلوم فیلڈ تاریخی لسانیات میں سب سے پہلے صوتی تبدیلیوں اور مشابہتوں کو تلاش کیا جاتا ہے یہ مشابہتیں ہی دراصل تبدیلی کا سراغ دیتی ہیں۔[۴]

صوتی تبدیلیاں اچانک رونما نہیں ہوتیں نہ ایسا حادثاتی ہوتا ہے بلکہ بتدریج لسانی عمل سے تبدیلی واقع ہوتی ہے جو آہستہ آہستی اصوات کو تبدیل کرتی چلی جاتی ہے۔اور یہ تبدیلی معنی کے تغیّر کا بھی باعث بنتی ہے۔صوتی قوانین ہر زبان میں باقاعدہ ہوتے ہیں۔

لسانیات زبان کے بارے میں مستقل غور وفکر میں مصروف ہے کہ زبان کیا ہے، کس طرح زبانوں کا آغاز ہوا اور مختلف عہد میں لوگ کس طرح زبانوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے رہے۔انیسویں صدی عیسوی میں تاریخی لسانیات کے حوالے سے زیادہ کام ہوا۔

زبانیں وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔زبان کے تاریخی مطالعے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ زبانوں میں مستقل نوعیت کا بدلاؤ دیکھنے میں آتا ہے۔کل کی زبان آج ایک تاریخ کا درجہ حاصل کر چکی ہے جس کا مطالعہ تاریخ کے طور پر کیا جاسکتا ہے۔

''تاریخی لسانیات میں تقابلی طریقے سے مطالعہ کرنے کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ

جب ایک زبان وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جاتی ہے تو ایک موڑ ایسا آجاتا ہے جہاں وہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں میں تقسیم ہوکر خود مٹ چکی ہے چنانچہ تاریخی لسانیات کا موضوع خاص یہ ہوگیا کہ زبانوں کی تبدیلی کا طریق کار اور تبدیلی کا سراغ لگائے۔"(۵)

زبان کسی بھی عہد یا وقت کے دھارے میں ایک جیسی نہیں رہتی بلکہ یہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک ایک عہد سے دوسرے عہد تک مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ ایڈورڈ ساپر لکھتے ہیں:

"زبان کے تاریخی مطالعے نے ہمارے لیے حتمی طور پر یہ ثابت کردیا ہے کہ زبان نہ صرف رفتہ رفتہ بلکہ مسلسل بدلتی رہتی ہے۔"(۶)

تاریخی لسانیات میں زبانوں کا مطالعہ اور تقابل ان تبدیلیوں کو سامنے لاتا ہے جو ایک زبان کو مزید زبان در زبان میں تبدیل کردیتی ہیں۔ چاہے یہ عمل صدیوں میں ہی کیوں نہ واقع ہوا ہو۔ اور زبانوں میں مشترک خصوصیات ہمیں ان نتائج تک پہنچاتی ہیں کہ کبھی وہ ایک تھیں، یا کسی ایک زبان سے نکلی ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ تاریخی لسانیات کا فنکشن کیا ہوگا۔ تاریخی لسانیات تاریخ کے حوالے سے زبان کی تبدیلی پر غور کرتی ہے کہ یہ تبدیلی کن وجوہات سے پیدا ہوئی اور کون کون سی زبانیں اور واقعات و حالات اس سلسلے میں کام آئے۔ وہ کون سے عوامل رہے ہوں گے جن کی بدولت تبدیلی نے جنم لیا۔ بعض اوقات یہ بات بھی ہوئی کہ تمام زبانیں کسی ایک زبان سے نکلی ہیں۔

تاریخ ایک ایسی شے ہے جسے آہستہ آہستہ کھوجا جاتا ہے، یہ اتفاق کی بات ہے کہ کچھ علاقوں سے پرانے کھنڈرات اور زبان کی لکھائی مل گئی وگرنہ یہ ممکن نہیں کہ ہزاروں سال پیچھے جا کر اشیاء کو تلاش کرکے سامنے لایا جاسکے۔ سہیل بخاری لکھتے ہیں:

"بولی تاریخ کے گھیرے سے باہر ہے۔ جیسے تاریخ میں دنیا جہان کی اور باتیں مل جاتی ہیں ایسے ہی لوگ بولی کا حال بھی اس میں ڈھونڈنا چاہتے ہیں اور جب کوئی بولی کی بات چھیڑتا ہے تو جھٹ اس سے تاریخ کی گواہی مانگنے لگ جاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ تاریخ میں تو وہی کچھ لکھا گیا ہے جو پرکھوں نے آنے والوں کے لیے لکڑی اور پتھر اور دھات کے روپ میں چھوڑا ہے۔ جیسے حویلیاں، مورتیں، تصویریں، لکھاوٹیں اور دوسری

چیزیں اور یہ سب کی سب کوئی آج کوئی کل ایک ایک کر کے مٹ جاتی ہیں اس لیے جو مٹ چکا ہے اور ایسا مٹا ہے کہ اب دھرتی کی کھدائی سے بھی ہاتھ نہیں آتا اس کا حال تاریخ میں کیسے لکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تاریخ کچھ ہزار برس پہلے تک پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اس سے آگے وہ بولی تو بولی کسی کا بھی حال نہیں بتا پاتی۔''(۷)

تاریخ اس بارے میں خاموش ہے کہ شروع میں زبان اور بولی کا آغاز کیسے ہوا۔ تاریخ ہمیں صرف اتنا بتاتی ہے موجودہ زبانوں میں سے کون سی زبان کب اور کیسے کیسے بدلی ہے اور نئی زبانیں کیسے وجود میں آئیں۔ اس حوالے سے بھی بہت سا کام قیاس آرائیوں سے لیا جاتا ہے اور کچھ کام تحقیق اور لسانی تجزیے کے بعد نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔

تاریخی لسانیات میں اس بات کو اہم دی جاتی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ زبانیں کیوں اور کس طرح خود کو بدلتی ہیں۔ کبھی یہ نظریہ سامنے آیا کہ تمام زبانیں ایک ہی زبان سے نکلی ہیں۔ اور بعد میں مختلف علاقوں میں جانے کی وجہ سے ان میں بدلاؤ آتا گیا۔ اور بعض اوقات یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ ہر جگہ زبان کو انسان کی فطری آوازوں کے حوالے سے وضع کیا گیا۔

برصغیر میں سنسکرت کو تمام زبانوں کی ماں کہا گیا۔ اردو کے بارے میں بھی کئی ماہرین یہی کہتے ہیں کہ اس کے بہت سے لفظ سنسکرت کے لفظوں سے مشتق ہیں۔ پھر کچھ زبانوں کو دراوڑی زبانیں اور کچھ کو آریائی کہا گیا۔ موہنجوڈرو کی دریافت کے بعد زبانوں کے حوالے سے کئی ایک سوال پیدا ہوئے جن کا جواب ماہرین لسانیات کو تلاش کرنا ہے۔

اُردو میں قدیم اردو اور موجودہ اردو کے حوالے سے ایک بحث موجود ہے تو وہاں دکنی، کھڑی، پراکرتی اور اپ بھرنش زبانوں کے مباحث بھی موجود ہیں۔ انیسویں صدی میں زبانوں کے حوالے سے لسانی تبدیلیوں کے بارے میں مختلف زبانوں کا تقابلی مطالعہ اور موازنہ سامنے آیا۔ اس حوالے سے جونز شمٹ (۱۸۴۳ء۔۱۹۰۱ء) کا نام اہم ہے۔ اس کے علاوہ ایڈورڈ ساپر نے بھی اپنی کتاب لینگوئج میں زبانوں کے تاریخی پس منظر کی بات کی ہے۔ زبانیں لسانی تقسیم کی وجہ سے مختلف بولیوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ اور کبھی کبھی مختلف زبانیں بولنے والوں کے مسلسل ملاپ اور تعلقات سے نئی زبانیں بھی جنم لیتی ہیں۔ ہر زبان اپنا تاریخی پہلو رکھتی ہے۔ کسی بھی زبان کو اس کے ماضی کی تاریخ میں تلاش کیا جاسکتا ہے اور اس کے ارتقائی مراحل کو دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جونز لیونز بھی

تاریخی لسانیات پر بات کرتے ہوئے تمام زبانوں کے ماخذ کے بارے میں بات کرتا ہے۔اس کے خیال میں کہ شاید ایسا ہو لاکھوں سال پہلے یہ سب زبانیں کسی ایک ہی ماخذ زبان سے تعلق رکھتی ہوں۔

تاریخی لسانیات کا آغاز

سب سے پہلے ۱۷۸۶ء کا زبانوں کے تقابلی مطالعہ شروع ہوا اور تاریخی لسانیات کی ابتدا ہوئی۔ایک محقق سر ولیم جونز کی تحقیقات کی وجہ سے زبانوں کی تبدیلی کے بارے میں معلومات ملیں اور اس بات کا پتہ چلا کہ سنسکرت، یونانی اور لاطینی سے مشابہ زبان ہے۔

اس تقابلی مطالعے میں مختلف زبانوں کے الفاظ اور ان کے صوتی اختلافات اور مترادفات پر غور کیا گیا اور صوتی تبدیلیاں نوٹ کی گئیں کہ فلاں زبان کے فلاں لفظ کی فلاں آواز دوسری زبان کے اس لفظ میں اس آواز سے بدل گئی ہے۔مراد یہ ہے کہ زبان کی تبدیلی کے نظریے کی ابتدا صوتی تبدیلیوں کے مطالعے سے ہوئی۔اس حوالے سے ایڈورڈ سپیر، اوٹو یسپرسن، بلوم فیلڈ، جیمس اینڈرسن، اسٹیفن الیمن اور جیکب گرم نے صوتی تبدیلیوں کے حوالے سے کام کیا۔(۸)

زبان دراصل تاریخی رویہ رکھتی ہے تاریخ کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے اور نشو ونما کرتی ہے۔

بہت سی ہند آریائی زبانیں گریرسن کے بقول رگ وید اور سنسکرت سے نہیں نکلیں مگر پھر بھی ان کا تاریخی جائزہ لینے کے لیے ہمیں ویدک اور سنسکرت زبانوں کا جائزہ لینا پڑے گا۔زبانوں کا یہ جائزہ زیادہ تر برصغیر کی قوموں کی تاریخ پر رکھا جاتا ہے جس میں سچائی سے زیادہ ابہام موجود رہتا ہے۔

تاریخی لسانیات میں زبان کی تاریخی تبدیلیوں کا جائزہ زیادہ تر مکانی حوالے تک محدود رہتا ہے جس کی وجہ سے لسانی وسیع امکانات کا حصول مشکل ہو جاتا ہے۔زبانوں کی رنگارنگی اور بوقلمونی وقتی ہوتی ہے جب کہ زبان کی تبدیلی ایک ہمہ وقت عمل ہے۔(۹) یعنی ہم زیادہ تر تشریحی لسانیات کے تابع لسانی سرگرمی میں مصروف رہتے ہیں۔زبان پر بات کرتے ہوئے ہم آوازوں، آوازوں کے لیے وضع کیے گئے حرف، نحو اور معنیات پر غور و فکر کرتے ہیں۔یعنی اصوات کے علاوہ فونیم کا علم اور صرف ونحو کے ساتھ ساتھ معنیاتی نظام زبان کے مطالعے کے حوالے سے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔آواز اور اس کے لیے مختص کیا گیا حرف ایک حوالے سے زبان کی بنیادی اکائی کا درجہ رکھتے ہیں۔

زبانوں کے حوالے سے تاریخی لسانیات میں زیادہ بات مفروضوں پر مشتمل ہے کسی ایک

دور کی زبان کا کسی ایک کلیے کی مدد سے جائزہ لینا ممکن نہیں۔ گزرے وقتوں میں ایک ہی وقت میں ایک ہی زبان کا اسلوب شاعری میں الگ ہوسکتا ہے اور نثر میں جدا، اب یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی زبان اُس دور کی نمائندگی کرتی ہے کافی دشوار ہوگا۔ تاریخی لسانیات میں صرف دستیاب نمونوں پر کام کیا جاتا ہے یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس وقت کی جو نمائندہ زبان ہو وہ تحریری شکل میں اس وقت موجود ہی نہ ہو، یا وہ مواد ضائع ہوگیا ہو۔

تاریخی لسانیات سے پتہ چلتا ہے کہ چاہے وہ زبان آج کی ہو یا صدیوں پہلے کی کسی بھی دور میں زبان کبھی ایک جیسی نہیں رہی۔ زبان میں تنوع پایا جاتا ہے، چند میل کے فاصلے کے بعد لب ولہجہ بدل جاتا ہے۔ کچھ علاقائی اور جغرافیائی اثرات بھی زبانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ زبانیں جب دوسری زبانوں سے ملتی ہیں تب بھی ان میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں موجود مختلف طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زبان بھی ایک جیسی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

''زبان کی تاریخ میں ایسا کوئی دور اور اس کے سفر میں ایسی کوئی منزل نہیں آتی جسے انقلابی کہا جاسکے اور جو اس کے مسلسل خط کو دو مختلف حصوں میں قطعیت کے ساتھ تقسیم کردے، زبان کے نامیاتی ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہم ہر قدم پر اس کے واضح ٹکڑوں کی نشان دہی کرسکیں۔ اور انھیں قدیم وجدید کے ناموں سے موسوم کرنے میں حق بجانب ہوں۔''(۱۰)

کسی زبان کی بولیوں میں اگر فرق واقع ہوگا تو وہ فرق تاریخی جائزے سے سامنے آجائے گا مگر یہ فرق ایک دو سال کے عرصے پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس فرق میں سینکڑوں سال لگے ہوں تب کہیں جا کر زبان کی دو بولیوں میں فرق واقع ہوا۔

فرڈی نینڈ ڈی ساسر نے اپنی کتاب کورس ان جنرل لینگوسٹکس میں تشریحی اور تاریخی لسانیات کی بات کی۔

سر ولیم جونز اور جیکب گرم، جرمنی کے فرانکس بوپ (franz bopp) (۱۷۹۱۔۱۸۶۷ء) کی وجہ سے تاریخی لسانیات کی نشو ونما ہوئی۔ تاریخی حوالوں سے مختلف زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا گیا۔ جس نے زبانوں کی تاریخ کے حوالے حوصلہ افزا معلومات اور نتیجہ خیز مواد سامنے آیا۔ انھوں نے

زبانوں پر جس انداز میں کام کیا اُس کی وجہ سے لسانیات ایک سائنس کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

اردو میں تاریخی لسانیات کا آغاز اردو کے مولد وارتقا کے نظریات سے ہوتا ہے۔

اردو کی ابتدا کے حوالے سے میر امن نے باغ و بہار کے دیباچے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ لسانی نوعیت کے تو نہیں مگر اس سے اردو زبان کے بارے میں کچھ پتہ چلتا ہے۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر، حضور میں آ کر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔(۱۱)

سرسید اور مولوی عبدالغفور نساخ، امام بخش صہبائی، سید احمد دہلوی، گریرسن کے ہاں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا۔ مگر ان کے ہاں ایک بات مشترک رہی کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ جس نے آگے چل کر بہت سے لسانی مغالطے بھی پیدا کیے۔ بعض ماہرین نے اسے مخلوط زبان قرار دیا مگر کچھ نے اس کے مخلوط ہونے سے انکار کیا اور اسے ایک ایسی زبان قرار دیا جس کی اساس صرف ایک زبان پر رکھی گئی ہے جس کا اپنا ڈھانچہ ہے۔ ان میں مرزا خلیل بیگ شامل ہیں۔

محمد حسین آزاد نے اردو کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے اپنی کتاب ''آبِ حیات'' میں اسے برج بھاشا کی بیٹی قرار دیا۔ جسے بعد میں ماہرین لسانیات نے رد کر دیا۔

ایک اہم تاریخی لسانیات کے حوالے سے پیش رفت حافظ محمود شیرانی کی طرف سے ہوئی انھوں نے پنجابی زبان کا تاریخی اور سماجی مطالعہ کر کے یہ نظریہ پیش کیا کہ اردو زبان پنجاب میں بنی ہے موجودہ پنجابی اور اس کے قریبی زبانوں کا اُردو کی ابتدا میں بنیادی ہاتھ ہے۔ وہ پنجاب ہی کی کسی زبان کو اردو کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔

حافظ محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' کے ذریعہ تحقیق کر کے محمد حسین آزاد کی بات کو چیلنج کیا اور اُردو زبان کے ڈانڈے پنجابی زبان سے ملا دیے۔ یہ بات طے ہے کہ برج بھاشا نے شورسینی کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور یہ گنگا و جمنا کے دوآبہ سے نکل کر آگرہ، بھرتپور، گوالیار، جے پور، گڑگاؤں، بدایوں بریلی، اور علی گڑھ کے علاقوں میں بولی جانے لگی۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے وقت اسی زبان کی مقبولیت تھی۔ جب ہم اردو کا برج بھاشا اور پنجابی زبان سے موازنہ کرتے ہیں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مصدر کا قاعدہ، صرف و نحو، تذکیر و تانیث اور گرائمر کے اصولوں میں اردو زبان

برج بھاشا کی بجائے پنجابی زبان سے زیادہ قریب ہے۔ پنجابی اور اُردو زبان نے ایک ہی جگہ پرورش پائی ہے۔ دونوں کا جنم بھومی ایک ہی ہے بعد میں یہ زبانیں الگ ہوگئیں اور دوسری زبانوں کے اثرات اردو زبان نے قبول کرنا شروع کردیے۔(۱۲)

حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' لسانی حوالے سے اہمیت کی حامل ہے انھوں نے اس کتاب میں فرمایا ہے کہ اردو زبان صرف ونحو کے حوالے سے پنجابی اور ملتانی زبان سے مشابہ ہونے کی وجہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اردو پنجابی زبان سے نکلی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر شوکت سبزواری، گیان چند نے شیرانی کے نظریے سے اتفاق نہیں کیا۔

شیرانی کے نظریے سے اتفاق کرنے والوں میں گراہم بیلی نے (وفات۱۹۴۲ء) اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور (۱۹۰۵ء۔۱۹۶۲ء) ہیں ان کے خیال میں اُردو کا آغاز تو پنجاب میں ہوا مگر اس کی تکمیل دکن اور دہلی میں ہوئی۔ یہ بات بھی کی جاتی ہے کہ دہلی میں اُردو نے کھڑی بولی، بانگڑو اور ہریانوی سے بھی استفادہ کیا۔ ڈاکٹر زور نے ہندوستانی لسانیات، اور ''اردو کی ابتدا'' جیسے مقالات میں تاریخی حوالے سے اردو کا لسانی جائزہ لیا۔ انھوں نے اردو اور پنجابی کے حوالے سے ایک مضمون نقوش میں بھی لکھا جو کہ نقوش ادب عالیہ نمبر میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق اردو کا سنگِ بنیاد مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے رکھا جاچکا تھا۔ اردو اس زبان سے پیدا ہوئی ہے جو نئے ہند آریائی دور میں شمالی سرحدی صوبہ اور الہ آباد کے درمیانی علاقے میں بولی جاتی تھی۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ''اردو زبان کا ارتقاء'' میں پالی کو اردو زبان کا ماخذ قرار دیا ہے لیکن انھوں نے اپنی دوسری کتاب ''داستان زبان اردو'' میں خود اس بات کی تردید کردی ہے۔

شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ اردو نے جس قدیم اپ بھرنش سے ارتقاء پایا اس کی شکل موجودہ اردو سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔(۱۳)

عین الحق فرید کوٹی اردو کو ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی مقامی بھاشا کا تسلسل قرار دیتے ہیں اور اسے دراوڑی زبان کی باقیات میں سے شمار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے نظریہ میں ہریانی کو اردو زبان کا ماخذ قرار دیا ہے۔ جو کہ اپ بھرنش کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

مولوی عبدالحق کے بقول عربی اور ہندی ثقافت کے اشتراک سے سندھ میں جو ایک نئی تہذیب وثقافت وجود میں آئی ہماری یہ قومی زبان اُردو اسی تہذیب وثقافت کا شاہکار ہے اور اس کی زندۂ جاوید یادگار ہے۔(۱۴)

سید سلمان ندوی (۱۸۸۴ء۔۱۹۳۵ء) اپنے مقالہ ''اردو کیونکر پیدا ہوئی'' (نقوش سلیمانی) میں اردو کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے اسے سندھ کی سرزمین پر تلاش کرتے ہیں۔انھوں نے پنجابی اور ملتانی پر بھی گہری نظر رکھی۔ان کے ہاں تضاد کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔اختر اورینوی نے بھی کسی حد تک سلیمان ندوی کی تائید میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ان کے خیال میں تمام صوبوں میں کسی نہ کسی حد تک اردو کی ابتدا میں حصہ ڈالا ہے۔انھوں نے اس کی بناوٹ میں ترکی،عربی فارسی زبانوں اور مقامی اثرات کی بات کی ہے۔حسام الدین راشدی بھی سندھ میں اردو کا سراغ لگاتے ہیں۔ڈاکٹر روبینہ ترین کے بقول:

> ''سید سلیمان ندوی، حافظ محمود خان شیرانی، حبیب الرحمان، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر مہر عبدالحق، پیر حسام الدین راشدی، ابوظفر ندوی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اور دیگر محققین کا یہ کہنا بے جا نہیں کہ اُردو کا پہلا گہوارہ وادیٔ سندھ اور ملتان کی سرزمین ہے۔اس کے بعد لسانی تشکیلات کا یہ عمل دوسرے علاقوں میں پھیلتا چلا گیا۔''(۱۵)

نصیرالدین ہاشمی کے خیال میں اردو پر عربی کی نسبت فارسی کے اثرات زیادہ ہیں۔وہ دکن کو اس حوالے سے اہمیت دیتے ہیں کہ اردو کی نشو ونما یہاں ہوئی۔

برجموہن دتاتریہ کیفی اپنی کتاب ''کیفیہ'' میں اردو زبان کی ابتدا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اردو زبان پر شمال اور شمال مغربی ہند کی زبانیں اپنے اثرات مرتب کرتی رہی ہیں۔دتاتریہ کیفی اردو کا وطن دوآبہ گنگا و جمنا کو ٹھہراتے ہیں۔احتشام حسین نے جان بیمز کی کتاب کا ترجمہ ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' کے نام سے ۱۹۴۸ء میں کیا تو اس کے مقدمہ میں اردو کی ابتدا کے بارے میں مختلف باتیں کرتے ہوئے پنجابی زبان کو اہمیت دی کہ جہاں دوسری زبانوں ہریانی، برج بھاشا، کھڑی بولی کا بھی ہاتھ ہے وہاں پنجابی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

پروفیسر کمار چٹرجی نے بھی اس نظریہ کی تائید کی ہے کہ مسلمانوں نے جو زبان اپنائی وہ اس دور میں پنجاب میں مروّج تھی۔وہ پنجابی اور اردو کے مابین مضبوط رشتے کے قائل ہیں اور وہ پنجابی کے ساتھ ساتھ دہلی کے گردونواح میں بولے جانے والی زبان کھڑی بولی کو بھی اردو کے قریب سمجھتے

ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین بھی اردو کا ماخذ کھڑی بولی ہی کو قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری مہاراشٹر کے مشرقی علاقے کو اردو کی جائے پیدائش قرار دیتے ہوئے اردو کو مرہٹی کی سگی بہن کے نام سے موسوم کیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اُردو اور یہاں کی بولیوں کا تعلق آریائی کے بجائے دراوڑی زبانوں اور موہنجوداڑدو، ہڑپہ کی تہذیبوں اور ان سے بھی پہلے یہاں آباد اقوام کے ساتھ جوڑا ہے۔ ان کے خیال میں آریاؤں کی آمد سے قبل سارا افریشیا ارضی تہذیبوں کا گہوارہ تھا جس میں فرد زمین سے وابستہ تھا اور اور زبان بھی رسم الخط سے وابستہ ہو چکی تھی۔ اشوک کے کتبوں کا رسم الخط برہمی کے ساتھ ساتھ کھروشٹی میں بھی ملتا ہے جو کہ آرامی رسم الخط سے ماخوذ ہے اور کی جہت بھی دائیں سے بائیں جانب کو ہے۔[16] اس وقت کی تمام لپیاں دائین سے بائین کو لکھی جاتی تھیں۔ آریاؤں کی آمد کے بعد یہ جہت اُلٹی اور اس نے بائیں سے دائیں جانب والی جہت کو اپنایا۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے سات سو صفحات پر مشتمل اپنے مقالہ ''ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلق'' میں لسانیات کے اصولوں کے مطابق سرائیکی اور اردو کے تعلق کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے زبانوں کی عالمی تقسیم، ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی، پراکرتوں کی ماہیت، پنجابی، لہندا اور سرائیکی کے فرق پر روشنی ڈالتے ہوئے قدیم اُردو اور سرائیکی کا موازنہ دونوں زبانوں کے اصولِ وقواعد پر مفصّل روشنی ڈالی ہے، مختلف علاقوں کی بولیوں کے نمونے اکٹھے کر کے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ اُردو نے سرائیکی زبان سے جنم لیا ہے۔[17]

برصغیر میں اگر تاریخی لسانیات کے حوالے سے زبانوں کا مطالعہ کیا جائے اور مختلف علاقوں میں بولے جانے والے زبانوں کا آپس میں باہمی ربط وضبط زیرِ بحث لا کر اس حوالے سے تحقیق کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی علاقے میں بولے جانے والی بہت سی زبانوں میں زیادہ فرق یا حدِ فاصل نہیں تھی۔ ان زبانوں میں بہت سے الفاظ ایک جیسے تھے اور اگر کوئی فرق تھا بھی سہی تو وہ بہت معمولی، زبانوں کے آپس میں باہمی میل جول کی وجہ سے ایک دوسرے سے الفاظ کا تبادلہ کوئی بڑی بات نہیں۔ بلکہ یہ لسانی عمل کا ایک حصہ ہے جو ہر دور اور زمانے میں وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۵ء، ص ۱۱۸

۲۔ محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، ہندوستانی لسانیات، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء، ص ۱۷، ۱۸

۳۔ ایڈورڈ ساپر، لینگوئج، ص ۱۷۳

۴۔ اسٹرکچرل آسپکٹس، ص ۱۷

۵۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، لاہور فضلی سنز، ۱۹۹۸ء، ص ۴۵

2- Adwer sapir, Language, Harcourt Brace & Co, New yark 1921, P 21

۷۔ سہیل بخاری ڈاکٹر، اردو کا روپ، لاہور، آزاد بک ڈپو، ۱۹۷۱ء، ص ۱۰، ۱۱

۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، لاہور فضلی سنز، ۱۹۹۸ء، ص ۵۰

۹۔ جون لیونز، لینگوئج اینڈ لنگوسٹکس، ص ۵۸

۱۰۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی زبان، لاہور، فضلی سنز، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۷

۱۱۔ دیباچہ، باغ و بہار، میر امن دہلوی

۱۲۔ شیرانی، حافظ محمود، پنجاب میں اردو، حصہ اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء، ص ۸۶

۱۳۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، داستان زبان اردو، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۰ء، ص ۱۱۱

۱۴۔ عبادت بریلوی مرتبہ، خطبات عبدالحق،، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۶

۱۵۔ روبینہ ترین، ڈاکٹر، ملتان میں لسانی تشکیلات کا عمل اور دوسرے مضامین، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۴ء، ص ۳۴

۱۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۷

۱۷۔ شبیر حسن اختر، ملتان اردو کی جنم بھومی، ملتان، بزم ثقافت، ۲۰۰۵ء، ص ۳۱

گرِم کا قانون

(Grimm's law)

لسانیات کے حوالے سے زبانوں کا جائزہ لینے اور ان زبانوں میں ہونے والی تبدیلیوں اور مختلف الفاظ کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ردو بدل کا آپس میں باہمی موازنہ کرنے کا عمل انیسویں صدی میں شروع ہو چکا تھا۔

لسانیاتی تلفّظ قوانین ۱۸۸۲ء میں وضع ہو گئے تھے جنھیں گرم کا قانون (Grimm's law) کہا جاتا ہے۔ ورنر (Verner) کا قانون، سٹیمبو (Stammbau) کا نظریہ، ویلنی (Wellen) کا نظریہ اور فرڈی نینڈ ڈی ساسر، نوم چومسکی (Noam Chomsky)، ڈیلگ ہیرس (Zellig Harris)، لیونارڈ بلوم فیلڈ، ہالیڈے (Halliday)، ڈیل ہائمز (Dell Hymes)، جارج لیکوف (George Lakolf)، ٹامی گیون (Talmy Givon)، رابرٹ وین ویلن (R. Van valin) وقوفی اور عملی وعادی لسانیات پر کام کر چکے ہیں۔[1]

گرم کا قانون جو کہ گریمن فراسٹ جرمینک ساؤنڈ شفٹ یا راسک کا قانون کے نام، سے یاد کیا جاتا ہے۔ جیکب گرم کے نام پر رکھا گیا۔

گرم کا قانون جو کہ فرسٹ جرمینک ساؤنڈ شفٹ یا راسک کے اصول سے بھی جانا پہچانا جاتا ہے۔ گرم کا قانون Indo-EUROPEAN IANGUAGES (ہندی۔ یورپین زبانوں) میں باقاعدہ

تعلّقات یا روابط کو بیان کرتا ہے۔اس قانون کو جیکب گرم نے اپنی کتاب Deutsche Grammatik جس کا انگریزی نام Germani Grammar ہے، میں پیش کیا۔گرم ۴ جنوری ۱۷۸۵ء میں پیدا ہوا اور ۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء میں اس کی وفات ہوئی۔

Deutsches Worterbuch(German Dictionary) پہلی ڈکشنری ہے جسے سائنسی انداز میں تیار کیا گیا۔اس ڈکشنری میں جرمن ادب میں شامل نئے الفاظ کا تلفظ اور تاریخ حوالہ جات کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔اس کتاب میں مارٹن لوتھر (۱۵۰۰ ق م) سے لے کر جے ڈبلیو وان گوئٹے (وفات ۱۸۳۲ء) تک زبان کو عہد بہ عہد اس کی بولیوں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ بولیوں کے علامتی الفاظ کا ان کی بناوٹ اور ساخت کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کتاب میں گرم نے Indo-European vowel altenation کے ضمن میں انڈو یورپین زبانیں، اور سنسکرت زبان کے مطالعہ کو اس کے اثرات کے حوالے سے پیش کیا ہے۔۱۸۱۴ء میں جرمینک لاطین، یونانی۔سلیوک، اور بالٹک زبانوں کے درمیان ایک باقاعدہ طریق کار کے ذریعہ رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔راسک نے کچھ سال بعد کیلٹک کو بھی اس مطالعے میں شامل کر دیا ۔۱۸۲۲ء میں پہلی جلد (Deutsches Grammatik یعنی Germanic Grammer کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔اس ایڈیشن میں گرائمر کو انڈو یورپین زبانوں میں واول کے تبادل کا خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا اور اسے Ablaut by Grimm کا نام دیا گیا۔

یہ کتاب ۱۸۱۹ء سے ۱۸۳۷ء کے درمیانی عرصہ میں لکھی گئی۔یہ قانون جرمنی اور دوسری ہندیورپی زبانوں اور مغربی ایشیا کی زبانوں کے درمیان باہمی تعلّق کی نشاندہی کرتا ہے۔یہ قانون ایک منظّم اور مربوط شکل میں ہے اس کی مثالوں کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے۔یہ قانون تاریخی ماہرین لسانیات کے لیے دلچسپی اور اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ اس اصول کو واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ آواز کی تبدیلی (Sound Change) ایک مستقل عمل ہے نہ کہ اچانک یا حادثاتی عمل۔

گرم حروف صحیحہ کے حوالے سے دو قسمیں (two constant shifts) بیان کرتا ہے اور اس حروف صحیحہ کی تبدیلی میں ۹ حروف شامل ہیں۔اس کے خیال میں پہلی تبدیلی، جو کہ غالباً قبل مسیح دور سے چند صدیوں پہلے واقع ہوئی، یہ تبدیلی ہندیورپی زبانوں پر اثر انداز ہوئی اور حروفِ صحیحہ کی اس تبدیلی کو انگریزی، ولندیزی (Dutch)، دوسری نچلی جرمنی زبانوں (Low German Languages) اور

قدیم نارس (old norse) میں دیکھا جاسکتا ہے۔

جبکہ دوسری تبدیلی، جو کہ چھٹی صدی عیسوی میں ہوئی اور جو اپنی وسعت (scope) کے لحاظ سے کم انقلابی تھی، اس نے جرمنی کے حروفِ صحیحہ کو متاثر کیا اور یہ تبدیلی قدیم اعلیٰ جرمنی (Old High German) اور اس کے بعد میں آنے والی زبانوں میں واضح ہے جیسا کہ درمیانی اعلیٰ جرمنی (Middle High German) اور جدید اعلیٰ جرمنی زبانیں۔

اس قانون کے مطابق قدیم زبان بغیر آواز والے حروف پی، ٹی، کے (The Ancient unvoiced p, t, k) انگریزی بغیر آواز والے حروف t, the, h اور قدیم اعلیٰ جرمنی t, d, h بن گئے اور یہ ایسے باہمی تعلّقات کو جنم دیتے ہیں جیسا کہ یونانی کے ابتدائی صحیحہ pod، انگریزی کے tod اور قدیم اعلیٰ جرمنی کے tuo کے درمیان ہے۔ یہ قانون مزید واضح کرتا ہے کہ قدیم آوازیں b, d, g انگریزی کے بغیر آواز والے (un voiced p, t, k) بن گئیں اور قدیم اعلیٰ جرمنی t, ts, kh وقفے بن گئے۔ (old high German spirant stops)۔ اسی طرح ابتدائی آوازیں bh, dh, gh انگریزی کی b, d, g آوازیں بن گئیں اور قدیم اعلیٰ جرمنی کی p,t,k۔ ذرا سنسکرت کی آواز Dharati انگریزی کی آواز bear اور قدیم جرمنی کی اوپر والی جرمنی علاقائی زبانوں کے ki-peran سے موازنہ کریں جو کہ بعد میں معیاری جرمنی میں ge-beran بن گئی۔

قدیم اعلیٰ جرمنی کی مثالیں پہلی تبدیلی کے سلسلے میں دوسری تبدیلی کو واضح کرتی ہیں جو کہ انگریزی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ بقول سہیل بخاری:

”جیکب گرم نے ۱۸۱۹ء میں جرمانی بولیوں کی تقابلی گرائمر ترتیب دی۔ ۱۸۲۲ء میں اس کی دوسری اشاعت میں اس نے جرمانی اور دوسری ہند آریائی بولیوں کی آوازوں (اُسرُ وں) کے ملان کے کچھ اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنی تحقیق پیش کی۔ اس کو گرم کا قانون کہا گیا۔ ب، پ ت اور د۔ گ اور ک کا بدلاؤ۔ فارسی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ آریائی بولیوں کے بدلاؤ کی بہت سی مثالیں انجو کی فرہنگ جہانگیری میں گرم سے سینکڑوں سال پہلے لکھے جاچکے تھے اس لیے گرم کے اصولوں کو جب اس تناظر میں لیا گیا تو بات بن گئی۔ مگر جب گرم نے سنسکرت کے مہا پرانوں کو یونانی آوازوں کے برابر دکھانے کی کوشش کی تو یہاں وہ بھٹک گیا کیونکہ مہا پران تو ہندوستان کی دراوڑی بولیوں

سے لیے گئے ہیں۔''(۲)

الفاظ کا تلفّظ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے مگر جب زبانیں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپناتی ہیں پھر اس حوالے سے مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

ہر زبان کی ضرورت کے مطابق اس کی بنیادی آوازوں (Phonemes) کی ایک خاصی تعداد ہوتی ہے۔ جو دوسری زبانوں سے مختلف ہوتی ہے۔ ویسے ایک زبان کے بولنے والے بھی اپنے فونیم کو پوری طرح یکساں طور پر ادا نہیں کرتے بلکہ ہر دو بولنے والوں کے تلفّظ میں، بہت قلیل سہی، فرق ضرور ہوتا ہے۔ مگر ایک زبان کے بولنے والوں کے اس قلیل سے فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔(۳) فونیم کی اپنی جگہ اہمیت ہوتی ہے کیونکہ فونیم ہی کی مدد سے کسی زبان کو سیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ زبان میں صوتی تبدیلیوں کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

''اس سلسلے میں ایک ماہر لسانیات جیکب گرم نے بڑا کام کیا اور صوتی تبدیلیوں کے کچھ اصول دریافت کیے۔ جنھیں بعض ان کے مداحوں نے ''گرم کے قوانین'' کا نام دے دیا مثلاً یہ کہ ان زبانوں میں سے ایک زبان کے لفظ کی گ دوسری زبان میں ک، ایک کی ب دوسری زبان میں پ اور ایک کی د کی آواز دوسری زبان میں ت ہو گئی یعنی گ، ب، د کی آوازیں بالترتیب ک، پ، ت سے بدل گئی ہیں۔ گرم کی اس تحقیق کے بعد بھی کچھ ایسے الفاظ رہ گئے جن کی صوتی تبدیلی ان قوانین سے تشریح نہیں ہو سکی تو پھر ورنر نامی ایک اور محقق نے دوسرے قوانین دریافت کر کے پیش کیے اور جب کچھ روپوں کی وہ بھی تشریح نہ کر سکا تو کوئی اور محقق اٹھا اور پھر اس نے اپنی بساط بھر ان گتھیوں کی سلجھانے کی کوشش کی۔''(۴)

صوتی تبادل جہاں بہت سی زبانوں میں ہوتے ہیں وہاں ایک زبان میں بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ آریائی خاندان سے تعلق رکھنے والی فارسی زبان میں چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

(ب پ) آب آپ، جسبیدن جسپیدن، تاب تاپ۔ (ت د) بارود باروت، زرتشت زردشت، (ج چ) زیج زیچ۔ (ف پ) فارسی پارسی، پیروزی فیروزی، اسپند اسفند، سپید سفید۔ (ک گ) شکوفہ شگوفہ، شکفتن شگفتن، کشادن، گشادن، کشودن گشودن۔ (ب و) نبرد ناورد، اوزار ابزار، نابدان ناودان، نبشتن نوشتن۔ (ت ذ) آتربان آذربان۔ (چ ش) چلتوک شلتوک۔ (ج ژ) کژ کج۔ (ر ل) جرنگ جلنگ۔ (خ ق) چخماق، چقماق۔ (ق غ) مقناطیس مغناطیس، چقندر

چغندر، چغ چغ، چق چق۔ (ج غ) شالجم شلغم۔ (ج گ) زنجاب زنگاب۔ (ق گ) زرقوں زرگوں۔ (س ہ) آماس آماہ، ماس ماہ، روپاس روباہ۔ (ش خ) افراشت افراختن وغیرہ۔ اس کے علاوہ فارسی زبان کا لغت فرہنگ جہانگیری میں لغت نگار نے جیکب گرم سے کہیں زیادہ صوتی تبادل کی مثالیں دی ہیں۔ (۵) صوتی تبدیلیاں اور صوتی تبادل کئی دوسری زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جن میں آریائی زبانوں کے علاوہ خالص ہندی زبانیں (غیر آریائی) بھی شامل ہیں۔ آریائی زبانوں کے صوتی تبادل ہندوستان کی غیر آریائی زبانوں کے صوتی تبادل میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔

آریائی صوتی تبادل	ہندوستانی صوتی تبادل
ک = گ	ک = گھ
	گ = کھ
ت = د	ت = دھ
	د = تھ
پ = ب	پ = بھ
	ب = پھ

اس نقشے سے ظاہر ہے کہ آریائی زبانوں میں مصیت اور غیر مصیت آوازوں کا تبادل ہوتا ہے لیکن ہندوستانی زبانوں میں ہلکی (الپ پران) اور بھاری (مہا پران) آوازوں کا تبادل ملتا ہے اور بھاری آوازیں آریائی زبانوں میں سرے سے نہیں ملتیں۔ (۶)

جب زبان کسی دوسری زبان کے لفظ کو مستعار لیتی ہے تو کبھی بعینہٖ لے لیتی ہے کبھی اس میں کچھ تبدیلی کے بعد اپنایا جاتا ہے۔ اور اس کے تلفّظ اور مزاج کو اپنی زبان کے مطابق بنانے کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے۔ سید خیال بخاری کے بقول:

''اردو نے صرف مشرقی زبانوں جیسے فارسی، عربی اور ترکی، پشتو وغیرہ کے الفاظ کو ہی نہیں اپنایا بلکہ انگریزی (اور چند دوسری مغربی زبانوں) کے الفاظ بھی مستعار لیے ہیں۔ ان مستعار الفاظ میں جو الفاظ اس کے مزاج اور طبیعت اور خصوصیات کے مطابق تھے انھیں جوں کا توں لے لیا۔ مگر بہت سے دوسرے الفاظ میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کر لیں۔ ایسے الفاظ کا اصل زبان کے تلفّظ کے مطابق تلفّظ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' (۷)

کسی ایک زبان کے اصول وقواعد کی پابندی یا لفظی وصوتی پابندی دوسری زبان میں ممکن نہیں ہوتی، ہر زبان دوسری زبان کے الفاظ کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالتی چلی جاتی ہے۔

عربی کے بہت سے الفاظ اردو میں عام بول چال میں آکر بدل جاتے ہیں۔ مثلاً خَبَر کی جمع خَبریں، بَرَکت کی جگہ بَرکت وغیرہ۔ شاعری میں تو کسی حد تک تلفّظ کا خیال رکھا جاتا ہے مگر عام بول چال میں شَرم کو شَرَم اَمن کو اَمَن وغیرہ بولتے ہیں۔

اگر چہ زبانوں کی فطرت کے مطابق کسی زبان کے عام بولنے والوں کے تلفظ کو کوئی طاقت بھی زبردستی نہیں بدل سکتی۔ زبانوں میں تبدیلیاں خود بخود لاشعوری طور پر وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ (۸)

زبانوں میں مختلف الفاظ کا تلفّظ علاقے اور وقت کے حوالے سے تبدیل ہوتا رہتا ہے اسی تبدیلی کو ماہرینِ لسانیات مختلف قوانین کے تحت سمجھنے اور قابوں میں لانے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔

گرم کے اصولوں سے باہر نکلے ہوئے بہت سے بولوں کو گراس مین نے قابو میں لانے کی کوشش کی اور ان کے لیے کچھ نئے اصول گھڑ ڈالے پر بہت سے بول ان اصولوں کے چنگل سے بھی بچ رہے تو دوسروں نے ان کی گتھی سلجھانا چاہی اور یہ ریت آج تک چلی آرہی ہے۔ (۹)

جب تمام بولوں کا بدلاؤ ماہرینِ لسانیات کی سمجھ کے مطابق کسی اصول کے تحت نہیں آسکا تو یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کے بدلاؤ یا آپس میں ملنے کی وجوہات کوئی اور ہی ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان بولوں میں اُن زبانوں کا ہاتھ جو کہ اس وقت علاقائی اثرات رکھتی ہوں اور کسی نہ کسی طور ان زبانوں پر اثر انداز ہوئی ہوں۔ بقول ڈاکٹر محی الدین قادری زور:

> ”گرم کی اساسی خدمتوں کی وجہ سے آج لسانیات اہم ترین علوم میں شمار کیا جانے لگا ہے اس نے السنہ سے متعلق اپنے زمانے کی خام اور غیر منظّم معلومات کی تنقیح اور تشریح کی اور لسانیات کا ایک ایسا قاعدہ اپنی یادگار چھوڑ گیا، جو ہمیشہ اُس کے نام سے منسوب رہے گا اور جس نے زبانوں کی حکمی تحقیقات میں جہاں تک ٹیوٹونی زبانوں کا تعلّق ہے، ایک انقلاب پیدا کردیا۔ ”گرمس لا“ پر آج تک متعدد رسائل ومقالات لکھے جاچکے ہیں۔ واقعہ یہ کہ اس قابلِ قدر محسن کے اس انکشاف نے لسانیاتی مسائل کی گہری اور باضابطہ تحقیقات کا دروازہ کھول دیا۔ اور لسانیات کے لیے دوسرے علوم وحکمیات کی طرح معین اور خاص خاص ضوابط مقرر کردیے۔“ (۱۰)

گرم کے بعد کئی لوگوں نے اس حوالے سے اصول وضوابط مقرر کیے۔ اوٹو یسپرسن (Otto Jespersen) نے ''فلاسفی آف گرائمر'' نامی کتاب لکھ کر مزید اس علم کو آگے بڑھایا۔ اُن کی ایک اور کتاب '' زبان، اس کی نیچر اور ماخذ اور ارتقا'' میں لسانی حوالے سے کئی مفید باتیں شامل ہیں۔ انھوں نے یورپی زبانوں کو لسانی مطالعے میں پیش نظر رکھا۔ ساپر (E. Sapir) اپنی کتاب

''Language . An introduction to the study of speech''

میں امریکی انڈین زبانوں کے حوالے سے اپنی لسانی تحقیق کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ لکھنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ اس میں زیادہ تر ہاتھ املا کا ہوتا ہے، ایک ہی لفظ کا املا چند سو برسوں میں کئی بار بدلتا رہا ہے۔ جیسے پاؤں کو پہلے پانوں بھی لکھا جاتا تھا اور پانو بھی۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ عطش درانی، اخبار اردو اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۶، ۱۷

۲۔ سہیل بخاری' ڈاکٹر، اردو کا روپ، لاہور، آزاد بک ڈپو، ۱۹۷۱ء، ص ۱۶۷، ۱۶۸

۳۔ ہمارے لسانی مسائل، ص ۶۸

۴۔ تشریحی لسانیات، ص ۵۱

۵۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، ص ۵۴

۶۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، ص ۵۵

۷۔ خیال بخاری، سید، ہمارے لسانی مسائل، لاہور، بساط ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۰

۸۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۹۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کا روپ، لاہور، آزاد بک ڈپو، ۱۹۷۱ء، ص ۱۶۸، ۱۶۹

۱۰۔ محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، ہندوستانی لسانیات، ص ۲۳

لسانی اصطلاحات

اصطلاحات عموماً مشکل اور پیچیدہ ہوتی ہیں۔عام قاری کے لیے انھیں سمجھنا اس لیے بھی مشکل ہوتا کہ لغوی معنوں کے بجائے یہاں اصطلاحی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ جہاں تک مختلف سائنسی اصطلاحات کا تعلق ہے تو وہ کافی پیچیدہ ہوتی ہیں اور عام آدمی یا جس آدمی نے سائنس نہ پڑھی ہو اس کے لیے تو سائنسی اصطلاحات کو سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔اسی طرح ادبی اور تنقیدی اصطلاحات کو ادیب اور ناقدین ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔جن لوگوں کا تنقید یا ادب سے تعلق نہیں انھیں یہ اصطلاحیں سمجھ نہیں آتیں۔مگر جہاں تک لسانی اصطلاحات کا تعلق ہے یہ مشکل ضرور ہیں مگر چونکہ یہ زبان سے متعلّق ہیں اور زبان ہر انسان بولتا اور سمجھتا ہے اس لیے انھیں تھوڑی سی محنت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔چونکہ یہ اصطلاحات انگریزی سے آئی ہیں اور اگر ان کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے تو وہ بھی قدرے مشکل ہے۔مگر پھر بھی یہ زبان کے حوالے سے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے ہم معمّہ یا کوئی انوکھی چیز قرار دے سکیں۔

صوتیات: (Phonetics)

اصوات کی تخلیق، ترسیل اور ادراک کا مطالعہ، تجزیہ، حکمت اور زمرہ بندی

ا۔ سمعی صوتیات — اصوات کی تخلیق اور ترسیل کا مطالعہ

۲۔ آلیاتی صوتیات آلات کے ذریعے اصوات کا مطالعہ

۳۔ علم الالصوات، کسی خاص زبان کی اصوات اوران کے باہمی ارتباط کا مطالعہ

صوتیات کا تعلق تکلّم سے ہے۔ جس میں مختلف اصوات کی ادائیگی کا مطالعہ عمل میں لایا جاتا ہے۔ جب آدمی بولتا ہے تو سننے والا فوری طور پر اس کی آواز کو سن کے اس کے بارے میں پہلی رائے قائم کر لیتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ زبان ایک انسان کے جذبات کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج، تہذیب وتمدن کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ بولنے والا اپنے آپ کو زیادہ دیر تک چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔

(صوتیات لسانیات کا وہ شعبہ ہے جس میں آوازوں کا لسانی اور علمی بنیاد پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔)

انسان کا مزاج، ماحول، تعلیم اور تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ اس کے اعضائے اصوات بھی زبان کی تشکیل میں کارفرما ہوتے ہیں۔ زبان میں انسان کے صوتی اعضاء کے علاوہ بطور میڈیم ہوا بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ سننے والے کے اعضائے سماعت بھی۔ یہ تینوں ہی زبان کے نظام کی بنیادی کڑی سمجھے جاتے ہیں۔ بقول فہمیدہ بیگم:

''اپنے ہی دہن کا مشاہدہ اور آوازوں کو نکالنے کی مشق صوتیات کے طالبِ علم کا بہترین استاد ہوگا اور مددگار ہوگا۔ کسی زبان کی نئی آواز کو سیکھنے کے لیے بھی اس سے مدد لی جاسکتی ہے۔''(۱)

انسان جب بولتا ہے تو اس کے لیے میڈیم یا ذریعے کا ہونا ضروری ہے جو سننے والے تک اس کی آواز کو پہنچادے، اسی طرح اگر ہوا بھی ہے، اعضائے اصوات بامعنی آوازیں بھی پیدا کر رہے ہوں مگر سننے والے کی سماعت کے اعضا ناکارہ ہوں تو آوازیں ہوا میں تحلیل ہو جائیں گی۔

''ہم کہہ سکتے ہیں کہ صوتیات انسان کی تکلیمی آوازوں کی سائنس ہے۔ اس میں انسان کے منہ سے ادا ہونے والی آوازوں کی امتیازی خصوصیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ خصوصاً ان آوازوں پر توجہ دی جاتی ہے جو تمام دنیا کی زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ لوگوں کی اُن مختلف آوازوں میں فرق کرنا اور اُن کو پہچاننا سکھاتی ہے جو کسی بھی بولی جانے والی زبان میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ صوتیات اُن آوازوں کی ادائیگی بھی سکھاتی ہے۔''(۲)

انسان سماجی زندگی گزارتا ہے اور زبان کا تعلق سماج سے ہے۔ سماج کے ساتھ ساتھ انسانی لب ولہجہ اور زبان بھی بدلتی رہتی ہے۔ نشوونما کا یہ عمل فطری ہے۔ بقول احتشام حسین:

''ہر زبان میں کچھ آوازیں بدل جاتی ہیں ان کے بدلنے سے لفظوں کا تلفظ بدل جاتا ہے۔

لب و لہجہ میں فرق ہو جاتا ہے کبھی ایک زبان دوسری کا اثر قبول کر لیتی ہے کبھی اپنے ماضی کی واپس جانا چاہتی ہے یہ تمام اسباب زبان کا ڈھانچہ بدلتے ہیں کہ جتنی تبدیلیاں ہوتی ہیں فطری اصول کے تحت ہوتی ہیں۔صوتی تبدیلیوں کی وجہ عضویاتی بتائی جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نسل دوسری نسل کے لیے جو ورثہ چھوڑ جاتی ہے وہ بالکل ایک ہی طرح کا نہیں ہوتا بلکہ آوازوں میں کچھ فرق ہو جاتا ہے۔''(۳)

زبان کا تعلق وراثتی لسانیات سے ہے۔انسان جس معاشرے میں جنم لیتا ہے اسی سے زبان کے اثرات قبول کرتا ہے۔بہت سی آوازیں انسان صرف اس لیے نکال سکتا کہ اسے وہ آوازیں نکالنے کی عادت نہیں۔نہ کہ اس کی وجہ ان کی جسمانی اور عضویاتی بناوٹ ہے۔ہم ورثے میں ملنے والی زبان کو قبول کرتے ہوئے اسی تلفّظ اور لہجے کو استعمال کرتے ہیں جو کہ پہلے سے استعمال ہوتا آرہا ہو۔لیکن اگر انسان کوشش کرے تو وہ اُن آوازوں کو بھی ادا کر سکتا ہے جو کہ اسے ورثے میں ملنے والی زبان میں موجود نہیں ہوتیں۔

صوتی تغیّر کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ہمیں معلوم ہے کہ آریائی زبانوں میں اکثر و کی آواز ب میں تبدیل ہوئی ہے۔جیسے وہار۔بہار،اسی طرح یمنا جمنا میں بدل گیا۔اس میں آواز کی خصوصیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔زبان کی صوتیاتی اجزا کو دیکھا جاتا ہے۔صوتیات میں اس حوالے سے سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے کہ زبان، ہونٹ، تالو، مسوڑھے، دانت، گلا، حلقوم وغیرہ اصوات کی ادائیگی میں کیا کردار ادا کرتے ہیں۔

''صوتیات میں یہ مشاہدہ اور مطالعہ کیا جاتا ہے کہ جو آوازیں ہونٹوں کے اتصال سے پیدا ہوتی ہیں وہ کیا ہیں اور جو آوازیں دانتوں اور تالو کی مدد سے پیدا ہوتی ہیں ان کی کیا صورتِ حال ہے۔بولتے وقت پیدا ہونے والی آوازوں کے صوتی تجزیے سے ماہرین صوتیات نتائج اخذ کرتے ہیں اور تکلمی جملوں کا تجزیہ کر کے لسانیاتی اور صوتیاتی تجربات کو سامنے لاتے ہیں اور اصوات پیدا کرنے والے مختلف اعضاء پر بات کرتے ہیں اور صوتی عمل میں ان کے فنکشن کا جائزہ لیتے ہیں۔اس میں سانس بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

سید احمد دہلوی لکھتے ہیں:

''سانس بذاتِ خود پانے مخارج یعنی ناک، گلے یا منہ میں آنے جانے سے ایک آواز پیدا

۲۔ آلیاتی صوتیات آلات کے ذریعے اصوات کا مطالعہ
۳۔ علم الاصوات، کسی خاص زبان کی اصوات اور ان کے باہمی ارتباط کا مطالعہ

صوتیات کا تعلق تکلّم سے ہے۔ جس میں مختلف اصوات کی ادائیگی کا مطالعہ عمل میں لایا جاتا ہے۔ جب آدمی بولتا ہے تو سننے والا فوری طور پر اس کی آواز کو سن کے اس کے بارے میں پہلی رائے قائم کر لیتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ زبان ایک انسان کے جذبات کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج، تہذیب وتمدن کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ بولنے والا اپنے آپ کو زیادہ دیر تک چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔

صوتیات لسانیات کا وہ شعبہ ہے جس میں آوازوں کا لسانی اور علمی بنیاد پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔

انسان کا مزاج، ماحول، تعلیم اور تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ اس کے اعضائے اصوات بھی زبان کی تشکیل میں کارفرما ہوتے ہیں۔ زبان میں انسان کے صوتی اعضاء کے علاوہ بطور میڈیم ہوا بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ سننے والے کے اعضائے سماعت بھی۔ یہ تینوں ہی زبان کے نظام کی بنیادی کڑی سمجھے جاتے ہیں۔ بقول فہمیدہ بیگم:

''اپنے ہی دہن کا مشاہدہ اور آوازوں کو نکالنے کی مشق صوتیات کے طالبِ علم کا بہترین استاد ہوگا اور مددگار ہوگا۔ کسی زبان کی نئی آواز کو سیکھنے کے لیے بھی اس سے مدد لی جاسکتی ہے۔''(۱)

انسان جب بولتا ہے تو اس کے لیے میڈیم یا ذریعے کا ہونا ضروری ہے جو سننے والے تک اس کی آواز کو پہنچا دے، اسی طرح اگر ہوا بھی ہے، اعضائے اصوات بامعنی آوازیں بھی پیدا کر رہے ہوں مگر سننے والے کی سماعت کے اعضا ناکارہ ہوں تو آوازیں ہوا میں تحلیل ہو جائیں گی۔

''ہم کہہ سکتے ہیں کہ صوتیات انسان کی تکلیمی آوازوں کی سائنس ہے۔ اس میں انسان کے منہ سے ادا ہونے والی آوازوں کی امتیازی خصوصیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ خصوصاً ان آوازوں پر توجہ دی جاتی ہے جو تمام دنیا کی زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ لوگوں کی اُن مختلف آوازوں میں فرق کرنا اور اُن کو پہچاننا سکھاتی ہے جو کسی بھی بولی جانے والی زبان میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ صوتیات اُن آوازوں کی ادائیگی بھی سکھاتی ہے۔''(۲)

انسان سماجی زندگی گزارتا ہے اور زبان کا تعلق سماج سے ہے۔ سماج کے ساتھ ساتھ انسانی لب ولہجہ اور زبان بھی بدلتی رہتی ہے۔ نشو ونما کا یہ عمل فطری ہے۔ بقول احتشام حسین:

''ہر زبان میں کچھ آوازیں بدل جاتی ہیں ان کے بدلنے سے لفظوں کا تلفّظ بدل جاتا ہے۔

لب ولہجہ میں فرق ہو جاتا ہے کبھی ایک زبان دوسری کا اثر قبول کر لیتی ہے کبھی اپنے ماضی کی واپس جانا چاہتی ہے یہ تمام اسباب زبان کا ڈھانچہ بدلتے ہیں کہ جتنی تبدیلیاں ہوتی ہیں فطری اصول کے تحت ہوتی ہیں۔صوتی تبدیلیوں کی وجہ عضویاتی بتائی جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نسل دوسری نسل کے لیے جو ورثہ چھوڑ جاتی ہے وہ بالکل ایک ہی طرح کا نہیں ہوتا بلکہ آوازوں میں کچھ فرق ہو جاتا ہے۔"(۳)

زبان کا تعلق وراثتی لسانیات سے ہے۔انسان جس معاشرے میں جنم لیتا ہے اسی سے زبان کے اثرات قبول کرتا ہے۔بہت سی آوازیں انسان صرف اس لیے نکال سکتا کہ اسے وہ آوازیں نکالنے کی عادت نہیں۔نہ کہ اس کی وجہ ان کی جسمانی اور عضویاتی بناوٹ ہے۔ہم ورثے میں ملنے والی زبان کو قبول کرتے ہوئے اسی تلفّظ اور لہجے کو استعمال کرتے ہیں جو کہ پہلے سے استعمال ہوتا آ رہا ہو۔لیکن اگر انسان کوشش کرے تو وہ اُن آوازوں کو بھی ادا کر سکتا ہے جو کہ اسے ورثے میں ملنے والی زبان میں موجود نہیں ہوتیں۔

صوتی تغیّر کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ہمیں معلوم ہے کہ آریائی زبانوں میں اکثر و کی آواز ب میں تبدیل ہوئی ہے۔جیسے وہار۔بہار،اسی طرح یمنا جمنا میں بدل گیا۔اس میں آواز کی خصوصیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔زبان کی صوتیاتی اجزا کو دیکھا جاتا ہے۔صوتیات میں اس حوالے سے سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے کہ زبان، ہونٹ، تالو، مسوڑھے، دانت، گلا، حلقوم وغیرہ اصوات کی ادائیگی میں کیا کردار ادا کرتے ہیں۔

"صوتیات میں یہ مشاہدہ اور مطالعہ کیا جاتا ہے کہ جو آوازیں ہونٹوں کے اتصال سے پیدا ہوتی ہیں وہ کیا ہیں اور جو آوازیں دانتوں اور تالو کی مدد سے پیدا ہوتی ہیں ان کی کیا صورتِ حال ہے۔بولتے وقت پیدا ہونے والی آوازوں کے صوتی تجزیے سے ماہرین صوتیات نتائج اخذ کرتے ہیں اور تکلمی جملوں کا تجزیہ کر کے لسانیاتی اور صوتیاتی تجربات کو سامنے لاتے ہیں اور اصوات پیدا کرنے والے مختلف اعضاء پر بات کرتے ہیں اور صوتی عمل میں ان کے فنکشن کا جائزہ لیتے ہیں۔اس میں سانس بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

سید احمد دہلوی لکھتے ہیں:

"سانس بذاتِ خود پانے مخارج یعنی ناک، گلے یا منہ میں آنے جانے سے ایک آواز پیدا

کرتا ہے اور یہ بات بتاتا ہے کہ اگر مجھ کو ذرا زور سے بولو گے تو کچھ بڑی آواز جو سینے پر زیادہ دباؤ ڈال کر کھینچو گے تو اس سے بھی بڑی صدا پیدا کر دوں گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان یا حیوان کے بولنے کا پہلا سبب یا اس کے نطق کا پہلا اُستاد سانس ہے۔"(۴)

لسانیات میں آوازوں اور آوازوں کو پیدا کرنے والے اعضاء کا خصوصی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ان اعضاء میں ناک، زبان، گلا، ہونٹ، دانت، مسوڑھے، حلقوم، صوت تانت (ووکل کارڈز)، سانس وغیرہ شامل ہیں۔

ہونٹوں کی مدد سے تین قسم کی آوازیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

جب دونوں ہونٹ سختی سے بند ہوں تو ایسے میں جو آواز پیدا ہوگی اسے plosive (بندشی) آوازیں کہتے ہیں اور اگر ہونٹ سختی سے بند ہوں اور سانس منہ کے بجائے ناک سے خارج ہو تو ایسی آوازوں کو انفی (nasal) آوازیں کہا جاتا ہے۔ اگر ہونٹ بند ہوں مگر سختی سے بند نہ ہوں تو جو آوازیں نکلیں گی انھیں fricative صفیری آوازیں کہا جاتا ہے۔

کچھ آوازوں میں لفظ کے اختتام پر لب بند ہو جاتے ہیں جیسے جیم، لام، میم، کچھ حروف کی ادائیگی میں دونوں ہونٹ بند ہو کر کھلتے ہیں ب پ، حمزہ، کچھ حروف میں ادائیگی کے وقت آخر دونوں ہونٹ بند ہوتے ہیں مگر بند ہونٹوں کے بیچ میں سے سانس خارج ہوتی ہے۔ مثلاً الف۔ ص، کچھ حروف کی ادائیگی میں ہونٹ تھوڑے کھلے رہتے ہیں اور شروع میں سانس خارج ہوتی ہے۔ مثلاً! س، ش، ظ، ۔خ، ع، غ۔

صوتیات دراصل بولتے وقت، سنتے وقت یا ہوا کے دوش پر آواز کے مطالعہ کے نام ہے۔ کہ انسان کس طرح آوازوں کو تلفّظ کے ذریعے ادا کرتا ہے۔ صوتیات ہی میں تمام ممکنہ تکلمی آوازوں کے لیے تحریر کا امکان پیدا کیا جاتا ہے۔ تاکہ تمام آوازوں کے لکھنے کا انتظام ہو سکے۔ اسے ہم صوتیاتی ٹرانسکرپشن (Phonetic Transcription) کہتے ہیں یعنی آوازوں کو تحریری روپ۔ زبان میں ایک ایک مصوتے کو کئی کئی طرح سے استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ مصوتے طویل آواز کی ادائیگی میں کام آتے ہیں اور کچھ مختصر آواز کی ادائیگی میں۔ صوتیات جہاں توضیحی علم ہے وہاں یہ ایک عمومی علم بھی ہے کیونکہ یہ تمام انسانوں کی آوازوں سے متعلّق ہے۔ اس کا دائرہ کار کسی ایک زبان کی صوتیات تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسانی زبان کی کسی بھی شاخ کا مطالعہ کر سکتی ہے اسے عمومی صوتیات کا نام دیا جاتا ہے۔

آوازیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک بے قاعدہ، بے ہنگم، بکھری ہوئی، الٹی سیدھی، غیر منظم، جیسے شور، گونگوں کی زبان سے ادا ہونے والی آوازیں، بہت چھوٹے بچوں کی زبان سے بولی جانے والی آوازیں۔ اس میں ہم بے ہنگم آوازوں کا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ منظم اور بامعنی زبانوں اور آوازوں کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ زبان ہر قسم کی آوازوں کے مجموعے کو نہیں کہتے بلکہ زبان صرف منظم آوازوں کا مجموعہ ہے۔ جنھیں سمجھا جا سکے جن کا تجزیہ کیا جا سکے، جن کی معانی کے حوالے سے تفہیم ہو سکے۔

اردو میں ایک اہم مسئلہ عربی سے لیے گئے ا، ع۔ ث، س، ص۔ ذ، ز، ض، ظ۔ ہ، ح۔ ت، ط ہیں۔ ان سے بنے ہوئے الفاظ ہم نے اردو میں جوں کے توں اپنا لیے جن کی وجہ سے ہم اصوات الفاظ کی ادائیگی اور صوتیوں کی ترتیب کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ یہ الفاظ زائد ہیں جنھیں اردو زبان اپنے ساتھ ساتھ لے کر آگے بڑھ رہی ہے۔ ان الفاظ کی وجہ سے اُردو پڑھنے اور سیکھنے والوں کو بھی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے طالب علم ذ اور ز کے فرق کو نہیں سمجھ پاتے ایک کی جگہ غلطی سے یا نہ جانتے ہوئے دوسرا حرف استعمال کر لیتے ہیں اور جیسا کہ آج کل موبائل اور نیٹ پر رومن میں اردو لکھنے کا رواج ہے تو لکھتے وقت وہاں انگریزی حرف z ذ ز ض ظ سب کے لیے لکھ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے بقول:

> ''عربی کے یہ کلمات اردو کے تت سم یعنی مستعار (Loanword) الفاظ ہیں جو اپنی موجودہ صورت میں اردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ یہ زبان کے رائج اور چالو الفاظ ہیں اس لئے زندہ ہیں اور زندہ الفاظ کے اجزا زندہ ہوا کرتے ہیں۔ جب تک یہ الفاظ اردو میں رائج ہیں ان کے لئے علاحدہ تحریری علامات برقرار رکھنی ہوں گی۔''(۵)

ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ حرف اور ان سے بنے ہوئے الفاظ کو اپناتے وقت کوئی لسانی کام کر لیا جاتا، کوئی ایسی لسانی سرگرمی جس کے نتیجے میں ہم ان ہم صوت الفاظ کے لیے کوئی ایک حرف رائج کر لیتے اور الفاظ مستعار لیتے وقت ان میں اپنی ضرورت کے مطابق رد و بدل کر لیتے یوں ہماری زبان میں حروفِ تہجّی کا سلسلہ اتنا طویل نہ ہوتا۔ شان الحق حقی لکھتے ہیں:

> ''اول یہ کہ اس کی صوتیات (Phonetic range) عربی فارسی، انگریزی ہر زبان سے بڑھ کر ہیں اور زیادہ جامع۔ چنانچہ یہ اکثر دوسری زبانوں کے الفاظ کو جوں کا توں اپنا سکتی ہے۔ تعریب اور تفرلیس کی چنداں ضروری نہیں ہوتی۔ اب تو پڑھے لکھے لوگ سکون اول پر بھی قادر ہوتے جاتے ہیں جو ایک نئی تبدیلی ہے (جیسے سپیشل، سپوتنک وغیرہ)۔''(۶)

اُردو میں رائج آوازیں چونکہ مختلف زبانوں سے لی گئی ہیں اس لیے ان آوازوں کے لیے رائج نشانات بھی کئی زبانوں کے رسم الخط سے تعلق رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

"اُردو نے تمام آوازیں پراکرت سے ورثے میں پائی ہیں البتہ اس میں صرف ایک ہی نون (دندانی) پایا جاتا ہے اور یہی ن چھتیس گڑھی، صوبہ متوسط کی مرہٹی، تلگو، بنگالی، آسامی، برج بھاشا، اودھی اور بہاری میں ملتا ہے۔ ݨ پنجابی، ہریانی گجراتی، راجستھانی اور مرہٹی کی معیاری بولی (نواح پونا) میں پایا جاتا ہے لیکن مرہٹی، گجراتی اور راجستھانی میں ں ط لفظ کے درمیان صرف اس وقت آتا ہے جبکہ یہ مفرد ہو ورنہ لفظ کی ابتدا اور درمیان میں اس وقت جبکہ مشدد ہو یا کسی قدیم مشدد کی نمائندگی کرنے والا مفرد ہو ہمیشہ دندانی ن ہی استعمال ہوتا ہے۔"(۷)

دنیا میں بولے جانے والے اسروں کی تعداد ایک دوسرے سے جدا ہے، ہر زبان میں مختلف اسر بولے جاتے ہیں مختلف اسر کا انتخاب کر کے لوگوں نے اپنی اپنی زبان کے مطابق اپنی زبانیں وضع کر لیں۔ اردو اور اس کی مختلف معاصر زبانوں کا اسروں کا ایک نقشہ یوں بنایا جا سکتا ہے۔

مقدار	الپ پران	مہاپران	الپ پران	مہاپران	الپ پران	مہاپران	کل تعداد
مخرج							
حنجری	ء (ہمزہ)	ہ					۲
حلقی	ک	کھ	گ	گھ			۴
حنکی	چ	چھ	ج	جھ	ر	رھ	۶
منخی	ٹ	ٹھ	ڈ	ڈھ	ڑ	ڑھ	۶
دندانی	ت	تھ	د	دھ	ل	لھ	۶
شفوی	پ	پھ	ب	بھ			۴
انفی	م	مھ	ن	نھ	ن (حلقی نون)		۵
صفیری	س						۱
کل تعداد							۳۴

(۸)

یہ تقسیم مخارج کے حوالے سے کی گئی ہے۔ جس میں لب، دانت حلق، اور تالو وغیرہ کی مدد سے ادا ہونے والی زبانوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

صوت: (Phone)

صوت یا آواز کو انسانی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ زبان کا سارا جادو اسی سے تشکیل پاتا ہے۔ اسی کو محفوظ کرنے کے لیے الفاظ بنائے جاتے ہیں جو زبان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جس کی مدد سے نہ صرف انسان کے جذبات کی ترسیل ممکن ہوتی ہے بلکہ انسان اور کائنات کی تاریخ بھی مرتب کی جاتی ہے۔ علم الاصوات کو Phonology کا نام دیا گیا ہے۔ جس میں زبانوں کی تاریخ وارتقا میں نطقی تبدیلیوں کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ اور ہر نطقے کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ نطقی صوت کی تحریری علامت کو صوت ترسیم (Phonogram) کہا جاتا ہے۔ تمام ممالک اور ان کی زبانوں کے رسم الخط میں پائے جانے والے حروف الگ الگ ہیں۔ جو کہ کسی نہ کسی آواز کی تصویری علامت ہے۔ یہ حروف اور ان کا تلفّظ ان لوگوں کے علاقے کی آب وہوا پر منحصر ہے۔ بہت سے لوگ دوسری زبانوں کے کئی حروف اور الفاظ کا تلفّظ اپنی زبان میں ادا نہیں کر سکتے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''یہ حروف جو ہر ملک کے ساتھ مخصوص کیے گئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آوازیں آب وہوا وغیرہ کے اثر سے اس ملک والوں کے گلوں سے بآسانی نکلتی ہیں مگر دوسرے ممالک کے لوگ اسی وجہ سے ان کو ادا نہیں کر سکتے، یا بدقت ادا کر سکتے ہیں۔ انسان کا گلا آلۂ موسیقی کے اصول پر بنا ہوا ہے اور اسی طور پر اس میں تار بھی بندھے ہوئے ہیں سانس کے ہوا میں ملنے سے زبان، تالو، ہونٹ، دانت اور خلائے دہن کی مدد سے آواز میں مختلف قسم کی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔''(۹)

انسان کے مختلف اعضا باہم مل کر اپنی مختلف حرکات کی مدد سے صوت پیدا کرتے ہیں۔ صوت ہوا کے دوش پر آگے بڑھتی ہے اور کانوں سے، سماعت سے ٹکراتی ہے۔

صوتیہ: نطقہ (Phoneme)

فونیم:۔ صوتیہ کو کہتے ہیں۔ نمایاں صوتی خصوصیات رکھنے والی چھوٹی سے چھوٹی اکائی کو نطقہ یا صوتیہ کہا جاتا ہے۔

یہ اتنی نئی اصطلاح نہیں بلکہ اسے phone سے ممتاز کرنے کے لیے ۱۸۷۹ء میں وضع کیا

گیا۔[۱۰] یہ بات ذہن نشین رہے کہ صوتیوں کا تعلق آوازوں (sounds) سے ہے الفاظ کے ہجوں (spellings) سے نہیں ہے۔[۱۱] یعنی فونیم میں معنوی اختلاف صوتی اختلاف سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں کہ صوتیہ کا تعلّق انسانی آواز سے ہے۔ صوتیہ کے معنی ہیں صوت کی طرف منسوب اور اس سے متعلّق۔ صوتیہ بے شبہ صوتی اکائی (Phonological unit) ہے جسے مزید اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا لیکن صوتیہ کے تصور کی بنا صوتی اکائی کی ماہیت یا اصلیت پر نہیں اس کے استعمال یا منصب function پر ہے۔ الفاظ آوازوں سے ترکیب پاتے ہیں آوازیں مختلف ہوتی ہیں۔ الفاظ میں اختلاف یا تعدد مختلف آوازوں کی وجہ سے ہے۔ آوازوں میں کیا اختلاف ہے اور کس نوعیت کا اختلاف ہے؟ اس مسئلے کا تعلق صوت (آواز) سے ہے یا یوں کہیے اس علم وفن سے ہے جس کا موضوع صوت ہے اور جسے علم الاصوات (Phonetics) کہتے ہیں۔''[۱۲]

صوتیہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں دو حرف یا آوازوں کو دیکھنا ہے مثلاً ب ت یہ اردو زبان کی دو مختلف آوازیں ہیں۔ ان میں اصوات کا اختلاف معلوم کرنا ہو تو بول کر پتہ چلے گا کہ کیا فرق ہے یا نہیں مختلف الفاظ میں استعمال کرنے سے فرق معلوم ہوگا۔ مثلاً باب۔تاب، بال۔تال، وغیرہ

یعنی جب ایک صوتیہ دوسرے کی جگہ لیتا ہے تو وہ معنویاتی تبدیلی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ یعنی جب صوتیہ بدلے گا تو لفظ بھی بدل جائے گا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دو آوازیں دو مختلف انداز رکھتی ہیں لہٰذا وہ مختلف صوتیوں پر مشتمل ہوں گی۔

اُردو میں وہ حروف جو ایک جیسی آواز دیتے ہیں انھیں ایک صوتیہ مانا جاتا ہے مثلاً:

ا، ع

ت، ط

س، ث، ص

ذ، ز، ظ، ض

ہ، ح

ک، ق

مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

''صوتیے کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے علمائے صوتیات نے لکھا ہے کہ صوتیوں کی دریافت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو زبانیں لکھی نہیں جاتیں، صرف بولی جاتی ہیں، ان کو تحریر میں لا کر ان کی بنیادی آوازوں کے لیے علامات یعنی حروف وضع کیے جائیں۔ یہ اہلِ علم صوتیات کی مدد سے ایک ترقی یافتہ تحریری زبان کے حروف کم کرنا چاہتے ہیں۔''(۱۳)

عام بول چال میں لوگ الف اور ع، ک اور ق، کے الگ تلفظ کو ادا نہیں کرتے۔ کچھ ماہرینِ لسانیات ان حروف کو الگ الگ صوتیے کی حیثیت دینے کے حق میں ہیں اور بعض حق میں نہیں ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ق کو ک کی ذیلی صوت ماننے کو تیار نہیں کیونکہ دونوں کے مخرج میں بہت فرق ہے۔ ان کے خیال میں ک غشائی آواز ہے جبکہ ق کوے سے ادا ہونے والی لہاتی آواز ہے۔

فونیمکس کو تجزیاتی صوتیاتی یا تجصوتیاتی کہتے ہیں۔ اسے اردو میں فونیمیات ہی کہنا چاہیے۔

صوتیات ایک علم ہے اور صوتیہ جدید لسانیات کی ایک فنی اصطلاح ہے۔ نطق مخرج اور نظر کے لحاظ سے اگر صوتیوں کے باریک سے اختلاف کو ملحوظ رکھا جائے تو ہر زبان میں ان کی تعداد سو سے زیادہ تک نہیں پہنچ سکتی ہے۔ مثلاً (کل) اور (کس) میں ک کی دو مختلف آوازیں ہیں یہ سماعت کے لحاظ سے نہیں بلکہ مخرج کے لحاظ سے (ک) کی آواز میں زبان کا آخری حصہ نشیبی رہتا ہے اور (ک) کی آواز میں زبان کا وہی حصہ کچھ اوپر آ کر نرم تالو کے نزدیک ہو جاتا ہے۔ لیکن سننے میں یہ ایک آواز معلوم ہوتی ہے۔(۱۴)

ہر زبان کی کچھ بنیادی آوازیں ہوتی ہیں اور کچھ ذیلی آوازیں جن سے وہ زبان تشکیل پاتی ہے۔ اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازوں کے عنوان سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''فونیم زبان کی وہ بنیادی صوتی اکائیاں ہیں جو معنی کا فرق قائم رکھنے میں مدد دیتی ہیں اور زبان کی تمام دوسری اصوات سے متضاد ہوتی ہیں۔ اس نظریے کی مدد سے کسی بھی زبان میں آوازوں کی پریشان کُن کثرت کی درجہ بندی سائنسی صحت سے اس انداز پر کی جا سکتی ہے کہ نہ صرف آوازوں کا ظاہری انتشار، گنتی کی چند منظم اکائیوں کی صورت اختیار کر لے، بلکہ مختلف اصوات کے باہمی رشتوں کا بھی پتہ چل جائے۔ زبان میں اصوات کی

اصوات کے مقابلے میں کم ہوگی۔''(۱۵)

بنیادی آوازوں کے علاوہ کسی بھی زبان میں مقرر کردہ یا مخصوص فونیم بھی بنیادی اہمیت کے حامل ہوتی ہیں۔فونیم ہی کی مدد سے مختلف آوازوں کو دوسری آوازوں سے الگ کیا جاتا ہے۔

جو آوازیں معنوی طور پر اپنی الگ شناخت کرالیتی ہیں انھیں کو فونیم کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔یعنی اردو کے ذ، ز، ض، ظ، اور ت، ط؛ ث، س، ص وغیرہ کو الگ الگ علامتوں سے ظاہر کیا جاتا ہے مگر آواز ایک ہی ہے۔اس لیے انھیں الگ الگ فونیم نہیں سمجھا جائے گا۔کیونکہ معنوی تضاد پیدا نہیں ہو تو ان کی ایک جیسی آواز اور معنوی تضاد نہ ہونے کی وجہ سے الگ الگ فونیم کا درجہ نہیں دیا جائے گا جیسے: طوطا، توتا۔راز، راض، ماز، ماذ۔صدا، سدا۔مصلوب، مسلوب (سلب کیا ہوا)۔عاصم، آثم۔صورت، سورت، ظرف، ثرف، مزہ، مژہ۔نصب، نسب۔قمر، کمر۔قاری، کاری۔قال، کال۔قصر، کسر۔عقل، اکل۔قاش، کاش۔قد، کد۔زن، ظن۔نظر، نذر، نظیر، نذیر۔طابع، تابع۔حال، ہال۔کاش، قاش۔باز، بعض۔باد، بعد۔کیونکہ یہ الفاظ ہمارے رسم الخط کا حصہ ہیں انھیں الگ نہیں کیا جاسکتا اور الگ کریں تو بہت سے دورے مسائل پیدا ہوں گے۔یہ صورتحال دیگر زبانوں میں بھی موجود ہے۔ڈاکٹر شوکت سبزواری انھیں الگ سے فونیم کا درجہ دینے کے حق میں ہیں:

''صوتیے کے باب میں تلفّظ کی یکسانی اور اختلاف کی کوئی قیمت نہیں۔دو ہم آواز حروف اگر زبان کے دو کلموں میں امتیاز کا باعث ہوں تو وہ دو مختلف صوتیے شمار ہوں گے۔''(۱۶)

مگر ماہرِ لسانیات ہم تلفّظ ہم آواز حروف کو الگ صوتیے کا درجہ نہیں دیتے۔بلکہ یہ ایک ہی صوتیہ تصور کیا جائے گا۔

الف اور زبر بھی وہ مصوتے ہیں جن کی وجہ سے معنوی تضاد سامنے آتا ہے مثلاً زر، زار؛ سر، سار؛ در، دار؛ بر، بار؛ ڈر، ڈار۔ملاحظہ کیجئے کہ کس طرح مصوتوں کے استعمال میں ان سب الفاظ میں معنی بدلتے چلے گئے۔بر کے الگ معنی ہیں اور بار کے الگ۔اسی لیے زبر اور الف الگ الگ فونیم قرار دیے جاتے ہیں۔اسی طرح زبر اور امالہ دار زیر کو ایک ہی فونیم سمجھا جائے گا۔جیسے رحمت میں ر کو زبر سے پڑھیں یا امالہ دار زیر سے معنی میں فرق نہیں آتا۔معنوی طور پر ایک دوسرے سے امتیاز رکھنے والی آوازیں فونیم کہلاتی ہیں۔پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی لکھتے ہیں:

''وہ تحریری شکلیں جو حدامکان تک آواز کی پوری نمائندگی کریں اور ان میں مزید اختصار کی گنجائش نہ ہو، انھی کے مجموعے کو حروفِ تہجّی کہتے ہیں۔''(۱۷)

ڈینیل جونز اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"A phoneme is a family of sounds, in a given language which are related in character and are used in such a way that no one member ever occurs in a world in the same phonetic context as any other member."(18)

وہ آوازیں جو انسان بے ساختہ اور غیر دانستہ طور پر نکالتا ہے وہی اصل آوازیں ہیں جو انسان شروع میں نکالتا ہوگا۔شروع میں انسانی اور حیوانی آوازوں میں زیادہ فرق نہیں رہا ہوگا۔یہ آوازیں انسان کے گلے سے برآمد ہوتی ہیں جہاں رگیں شریانیں اور پٹھے ان آوازوں کو سانس کی شراکت سے بناتے ہیں۔بقول چارلس ایف ہاکٹ: جب سانس ہوا کے تناؤ کی وجہ سے انسانی جسم میں مختلف اعضاء سے ٹکراتی ہے تو اس سے مختلف نوعیت کی آوازیں بنتی ہیں۔اور یہ پیدا ہونے والی آوازیں ۱۱۰۰ فٹ پر سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں۔(۱۹)

ڈبلیو اے اکن، بلوم فیلڈ، جان پیل، سی ایف ہاکٹ اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے آوازوں کا تعین کرنے کے لیے صوتیات کی جو درجہ بندی کی ہے ان میں سے صرف ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی درجہ بندی پیش خدمت ہے جو کہ اردو حروف کے حوالے سے ہے جبکہ باقی ماہرین لسانیات کی درجہ بندی انگریزی حروف سے متعلّق ہے۔

بندشی سادہ ہکار	لبی	نوکیلی	تالوئی	غشائی	حلقی
(plosive)	(Ladbial)	(apical)	(palatal)	(velar)	(glottal)
	ب پ	ت د ٹ ڈ	ج چ	ک گ	ق
	بھ پھ	تھ ٹھ دھ ڈھ	جھ چھ	کھ گھ	-
انفی (ناک کی)	م	ن	-	-	-
صفیری	ف و	س ز	ش ژ	خ غ	ہ
پہلوی	-	ل	-	-	-
تھپک دار	-	ر ڑ	-	-	-

(۲۰)

(آوازوں کی دو قسموں میں ت اور د سادہ آوازیں کہلاتی ہیں۔ جبکہ ٹ ڈ ٹھ ڈھ معکوسی (کوزی یا ملفوظی) کہلاتی ہیں۔

درس وتدریس کے لیے کسی زبان میں میرے خیال میں سب سے پہلا کام اس زبان کی بنیادی آوازیں یعنی صوتیے (Phonemes) کی دریافت ہے۔ کیونکہ کسی زبان کے صوتیے ہی وہ بنیاد ہے جس پر اس زبان کی چھوٹی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔(۲۱)

صوتیہ ہی کی بنیاد پر زبان اور لسانیات کے مباحث کو آگے بڑھاتا جاتا ہے۔

صوت اور صوتیہ میں فرق

ہم صوت sound کو کہتے ہیں اور صوتیہ phoneme کو ہم صوت کو مختلف حروف کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں بعض اوقات ایک ہی آواز کے لیے مختلف حروف مختلف الفاظ میں استعمال ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان علامتوں کے اختلاف کے باوجود صوتیہ ایک ہی تصور کیا جائے گا۔

ڈاکٹر خلیل احمد بیگ کے بقول:

>''صوتی اعتبار سے دو آوازوں والے حروف ایک صوتی سیاق میں واقع نہ ہوں تو انھیں دو مختلف صوتیے نہیں کہا جا سکتا مثلاً جاپانی NANA (پھول) کا 'H' جاپانی Hito (نوع انسانی) کے H سے صوتی طور سے مختلف ہے پہلے H کی آواز انگریزی House کے H کے مشابہ ہے اور دوسرے H کی جرمن 'Ch' کے۔ لیکن جاپانی زبان میں کوئی دو لفظ ایسے نہیں جن میں صرف اس H کے بدلنے سے ان کے معنی بدل جائیں اس لیے یہ دو آوازوں والا H جاپانی میں ایک صوتیہ (Phoneme) ہے۔''(۲۲)

مرزا خلیل احمد بیگ اردو کے ہم آواز الفاظ کو الگ الگ صوتیہ کا درجہ دیتے ہیں۔

الم	علم
داعی	دائی
ضیاع	ضیاء
عام	آم
ہال	حال

اشباہ	اشباح
تابع	طابع
تائی	طائی

ان کے خیال میں یہ دو الگ الگ صوتیے ہونے چاہئیں۔(۲۳)

اقلی جوڑا: (Minimal pair)

زبان میں جب آواز الگ الگ فرق محسوس ہو تو انھیں دو علیحدہ صوتیے کہا جاتا ہے۔ یہ آوازیں جب کسی دو صوتیوں سے تعلق رکھتی ہیں تو وہ دو لفظ جو ان میں امتیاز پیدا کرتے ہیں وہ دو صوتیے کہلائیں گے مثلاً بال اور دال۔ بقول ڈاکٹر سید محمد یوسف بخاری

''زبان کے جن دو مماثل سے الفاظ میں صرف ایک ایک آواز کے اختلاف کی وجہ سے معنی تبدیل ہو جائیں، ہم انھیں لسانیات کی اصطلاح میں اقلی جوڑا کہتے ہیں اور انگریزی میں minimal pair کہیں گے۔''(۲۴)

دال اور مال میں صرف د اور م کا فرق ہے اسے minimal pair (اقلی جوڑا) کم فرق والا الفاظ جوڑا کہا جائے گا کیونکہ اس میں صرف ایک حرف کا فرق ہے۔ اسی قسم کے فرق کے جوڑوں کو فونیم کہا جاتا ہے جس کی وضاحت کر کے معنی کا فرق معلوم کیا جاتا ہے۔

ڈینیل جونز (Danial Jonnes) لکھتے ہیں:

"When a distinction between two sequences occuring in a language is such that any lesser degree of distinction would be inadequate for clearly differentiating words in that language, the distinction is termed "minimal one."(25)

جہاں تک اردو مصوتوں کا تعلق ہے تو اس حوالے سے کچھ آوازیں سادہ ہیں اور کچھ ناک سے ادا ہونے والی جنھیں ہم انفی کا نام دیتے ہیں۔ سادہ اور انفی مصوتوں کے اقلی جوڑوں کو ہم اس طرح پیش کر سکتے ہیں:

انھی	انھیں
کھائے	کھائیں
آدھی	آندھی

بالی	بالیں
چاس	چانس
باس	بانس
مے	میں
بوئے	بوئیں
سوئے	سوئیں
کھوئے	کھوئیں
کھوئی	کھوئیں
سوئے	سوئیں
سوئی	سوئیں

حروفِ علت: (مصوتے:Vowels)

زبان سے جو اصوات خارج ہوتی ہیں وہ دو اقسام کی ہیں ایک کو ہم مصوتے کہتے ہیں اور دوسری قسم کو مصمتے کہا جاتا ہے۔

زبان سے جب اصوات خارج ہوتی ہیں یا جب ہم بولتے ہیں تو اصوات بنانے میں جہاں زبان، تالو، مسوڑھے، دانت، ہونٹ نرخرہ، گلا، پھیپھڑے وغیرہ اہم کردار ادا کرتے ہیں وہاں سانس بھی بنیادی کردار کی حامل ہوتی ہے۔ کیونکہ آواز ہوا کے دوش پر چلتی ہے، ہوا کی کمی بیشی، تناؤ اور رکاوٹ بھی اصوات میں اہم کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ جن آوازوں کو ادا کرتے ہوئے ہوا رگڑ پیدا نہیں کرتی بلکہ بلکہ آواز کے ساتھ ہوا بھی منہ سے آسانی کے ساتھ نکلتی ہے ان آوازوں کو مصوتے کہا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں آٹھ مصوتے ہیں: u،o،a،e،i، اس کے علاوہ w اور y نیم مصوتے ہیں کیونکہ مصوتوں کے مقام پر آتے ہیں۔ یہ بعض اوقات دوسرے حروف کے ساتھ مل کر مصوتے بن جاتے ہیں۔ اردو میں: و، ا، ی، زیر زبر پیش کی حرکت کو کہتے ہیں۔ ان کی مدد سے حرکت کو طول دیا جاتا ہے۔

''مصمت کو صحیح اور مصوت کو حرکت وعلت (یا اعراب) کہتے ہیں۔''(۲۶) انھیں سنسکرت میں سور کہا جاتا ہے۔

اردو میں مصمت آوازیں بالکل واضح اور دوسری آوازوں الگ ہیں جنھیں ادا کرنے میں

کسی قسم کا کوئی ابہام پیدا نہیں ہوتا۔ ہر آواز اپنا الگ الگ تلفظ رکھتی ہے۔

اردو میں حرکات زبر زیر پیش، تنوین ً ٍ ٌ، جزم، مد وشد (ٓ ، ّ) ،اور حروف علت (ا و ی) رائج ہیں۔

اردو میں حرکات وسکنات گیارہ ہیں انھیں مستقل الفاظ کا مرتبہ حاصل نہیں ہے بلکہ یہ تلفظ میں مدد دیتی ہیں۔ یہ محض اصوات کے اتار چڑھاؤ اور لب ولہجہ بنانے میں مدد دیتی ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نزدیک اردو کے دس مصوتے صوتی نظام کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور چار ذیلی یا ضمنی ہیں۔ اردو کے صوتی نظام کا گہرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ مصوتے چودہ ہیں۔[۲۷]

خاص طور پر شاعری کرنے والے حضرات کا روزانہ ان حرکات وسکنات سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیونکہ شاعری میں وزن، بحر اور عروض کے مباحث کا تعلق براہِ راست انھیں حرکات سکنات سے ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بقول اردو کے مصوتے درج ذیل ہیں:

''َ ا ِ ی ُ اَو ِ ے ِ ُ و َ و''[۲۸]

جن آوازوں کے لیے منہ کو کشادہ کر کے کھولنا پڑتا ہے وہ صوتیے کہلاتی ہیں ان کی ادائیگی کے وقت ہوا کو صاف اور زیادہ راستہ مل جاتا ہے جیسے الف اور واؤ۔ مصوتے زیادہ تر آواز دار یعنی voiced ہوتے ہیں جنھیں مسموع کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی لفظ میں دو مصوتے ایک ساتھ آ جائیں تو ان میں سے ایک مصوتہ آواز دار (voiced) یعنی مسموع اور دوسرا بے آواز (voiceless) یعنی غیر مسموع ہوگا۔ ان بے آواز مصوتوں کو نیم مصوتے کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اردو میں ی اور و اس کی مثالیں ہیں۔ یہاں اور وہاں میں ی اور و نیم مصوتے ہیں۔

انفی آوازیں

ناک سے نکلنی والی آوازوں کو انفی آوازیں کہا جاتا ہے۔

اُردو میں مصوتوں کو انفیایا جا سکتا ہے:

باٹ	بانٹ
باس	بانس
چاٹ	چانٹ

ڈاٹ ڈانٹ

ساس سانس

رگ رنگ

سگ سنگ

نگ ننگ

جگ جنگ

ساگ سانگ

راگ رانگ

بامعنی انفیت سے زبان میں خوبی پیدا ہوتی ہے۔

غیر ملفوظ

جو لکھنے میں تو آتا ہے مگر پڑھنے میں نہیں آتا۔ اسے لفظ کو پڑھتے وقت نہیں پڑھا جاتا مثلاً خواب کا 'و' پڑھا نہیں جاتا۔ اسی طرح انگریزی میں often میں t پڑھا نہیں جاتا۔ اسی قسم کے اور بہت سے لفظ ہیں۔ یہاں 'و' کو واؤ معدولہ کہیں گے۔ جو واؤ زیادہ نہ پڑھا جائے اسے وائے مجہول کہا جاتا ہے جیسے غور کا واؤ، اسی طرح جو واؤ خوب پڑھا جاتا ہے اسے واؤ معروف کہا جاتا ہے مثلاً مجبور، نور، مسرور میں واؤ۔

سُر اور اسُر

زبان میں آوازیں تو بہت سی ملتی ہیں لیکن ان کی بڑی قسمیں صرف دو ہیں۔ ایک سُر اور دوسری اسُر۔ عربی میں ان کا نام حروف پر رکھا گیا ہے۔ اور انھیں بالترتیب حروفِ علت اور حروفِ صحیحہ کہتے ہیں اردو والوں نے بھی عربی ہی سے ان کے نام مستعار لیے ہیں سنسکرت میں انھیں سُر اور ویّنجن کہتے ہیں اور انگریزی میں واول (Vowel) اور کانسونینٹ (Consonant).. ان آوازوں کی پھر اور بھی قسمیں کی گئی ہیں لیکن ان میں سروں کی تعداد کم اور اسروں کی تعداد زیادہ ہے۔[۲۹]

کسی بھی زبان میں سر اور اسر ہی اصوات اور معانی کی تشکیل کا باعث ہوتے ہیں۔

حروفِ صحیحہ: (مصمتے: Consonants)

حروف وہ غیر مستقل الفاظ ہیں جو تنہا بولنے سے کوئی معنی پیدا نہیں کرتے۔ انھیں جب

دوسرے الفاظ کے ساتھ ملا کر استعمال کیا جاتا ہے تو یہ معنی پیدا کرتے ہیں۔ حروف صحیحہ مستقل حروف کہتے ہیں۔ انگریزی میں حروف صحیحہ کی تعداد ۲۱ ہے۔ انھیں non vowel letter بھی کہا جاتا ہے۔ سنسکرت میں انھیں و ینجن کہا جاتا ہے۔ جس سے مراد الفاظ کے معانی کی تشریح و توضیح کے ہیں۔ مصمت سے مراد ٹھوس یا بھرا ہوا کے ہیں۔ بقول ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان:

''ایسی صوت جو اس طرح پیدا کی جائے کہ پھیپھڑوں سے نکلنے والی ہوا کا راستہ منہ کے جوف میں روک دیا جائے یا کسی اور طرح سے اس میں رکاوٹ حائل کر دی جائے۔''(۳۰)

مصمتوں کو بولتے وقت مصوتوں کی نسبت فرق ہوتا ہے۔ مصمتوں کو بولتے وقت تیزی بھی ہوتی ہے اور کم سے کم منہ کھول کر مصمتوں کو بولا جا سکتا ہے۔ زبان میں حروف صحیحہ ہی زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔

''وہ آوازیں جو تیز ہوں اور ارتعاش پیدا کریں اور جنھیں ادا کرتے وقت دہن یا منہ کو زیادہ نہ کھولنا پڑے انھیں مصمتے کہتے ہیں۔ اردو کا واحد مخصوص مصمتہ 'ژ' ہے جو فارسی سے ماخوذ ہے۔ بعض ماہرین اسے اردو سے خارج کرنے کی بات کرتے ہیں۔ یہ گنے چنے چند الفاظ میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ژالہ، مژدہ، مژگاں، مژہ، ژولیدہ، ارژنگ، ژند، پاژند، ژوف، اژدر، اژدہا۔''(۳۱)

ہر زبان دو پہلو رکھتی ہے ایک معنویاتی (Samentical) اور بصریاتی (Visual) ان کا صوتیات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ زبان کا ایک رخ بولنے کے حوالے سے اور دوسرا سننے کے حوالے سے۔ جب ہم بول رہے ہوتے ہیں تو اس میں مخارج اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ عام بول چال میں بہت سے الفاظ کے مخارج دوسرے الفاظ کے مخارج سے مل جاتے ہیں۔ بصری حوالے سے ایسا نہیں ہوتا کیونکہ پڑھنے والا مخارج خود پڑھ کر وضع کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری:

''زبان الفاظ کا ڈھیر کا نہیں بامعنی کلیات کا ذخیرہ ہی ہے یہاں آوازوں کے بامعنی جوڑوں کو صحت کے ساتھ تحریر میں منتقل کیا جاتا ہے۔ صحت کا مطلب یہ نہیں کہ آوازوں کا عکس اتار لیا جائے؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ آوازوں کے بامعنی جوڑوں کو کس طرح متشکل کیا جائے کہ ان نقوش ذہنوں میں مرتسم ہو جائیں اور جب جوڑوں کا یہ مجموعہ الفاظ و کلیات ایک عام قاری کے سامنے آئیں تو وہ ان کی تہہ تک پہنچ جائے۔''(۳۲)

جس طرح سنسکرت سے ہم نے ن کی صورت شکل میں غنہ آوازیں لی ہیں، سنسکرت میں یہ
ڑ کی صورت میں تھی مگر اردو نے اسے اپنے مزاج کے مطابق ڈھالا اور کہیں ن اور کہیں ں کی شکل میں
ختیار کیا مگر آواز ایک ہی رکھی غنہ کی۔ جیسے: چھاؤں، کھڑاؤں، کنایوں، بہاروں، بھنگ، رنگ، وغیرہ۔

حروفِ صحیح (مصمتہ) سے مراد زبان کی وہ آوازیں ہیں جنھیں ہم بنیادی آوازیں کہتے ہیں۔
یہ کسی زبان کی اصلی آوازیں ہوتی ہیں۔ان سے انسان مدعا نگاری کا کام لیتا ہے اور جہاں تک حرکت
وعلت (مصوتہ) کا تعلق ہے حرکتیں خارج سے ہیں، یہ اصل آوازوں کو حرکت میں یا لانے کا سبب بنتی
ہیں۔ یہ دونوں جدا نہیں ہوتیں جیسے پھول کے ساتھ رنگ، جب تک رنگ نہ ہو پھول وجود میں نہیں
آتا۔ پھول کا کوئی نہ کوئی رنگ ضرور ہوتا ہے اسی طرح صحیح آواز اور حرکت کا ایک دوسرے کے ساتھ
تعلق ہے۔ جس طرح پھول رنگ کا محتاج ہے اسی طرح آواز بھی حرکت کے بغیر اپنی شناخت نہیں
رکھتی یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی بنیاد اور ذات کے حوالے سے اپنا وجود رکھتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ
حرکتیں صحیح آوازوں کو جوڑ کر اور انھیں حرکت میں لا کر آوازوں کا ایک ترتیب شدہ نظام وضع کرتی
ہیں۔ یہ حرکتیں زبر زیر، پیش کھڑا پیش، کھڑا زبر، کھڑی زیر، الٹا پیش۔ ان میں اصلی اور اولین مصوتے
صرف زبر زیر پیش ہیں علتوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ جن میں ''ا'' ساکن الف جو یعنی فتح کے
اشتباع سے وجود میں آیا (َ + َ = ا) 'ی' (یائے معروف) یہ کسرے (ِ) کے اشتباع سے
بنی (َ + َ = ی)، 'ؤ' (واؤ معروف) یہ ضمہ (ُ) کی تمدید سے (ُ + ُ = و) حاصل ہوا، کہیں دو
مختلف حرکتوں کی ترکیب سے۔ یہ دو ہیں۔ ُ و 'ضمہ و فتحہ کی ترکیب کا نتیجہ ہے اور 'ے' کسرے و فتح'
کی ترکیب کا۔ ان علتوں کو اصطلاحاً 'مد' کہا جاتا ہے۔[۳۳] اردو اور فارسی میں زیر زبر پیش اور عربی میں
حرکتوں کو کسرہ فتحہ ضمہ کہا جاتا ہے۔

مد، واؤ معروف۔ 'ؤ' کہیں دو پیش کی آواز دیتا ہے اور کہیں یہ پیش اور و کے ساتھ مرکب
آواز دیتا ہے۔ جیسے ہم بوجھ (bojh) بمعنی بھاری، وزن، اور بوجھ (boojh) سمجھ بوجھ کے۔ یہ
حرکتیں سمعی حوالے سے تو فوری سمجھ میں آجاتی ہیں کہ مصوتے حروفِ صحیح کے ساتھ مل کر آواز کا روپ
دھارتے ہیں مگر جب ہم انھیں لکھا ہوا دیکھتے ہیں یا پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس وقت یہ حرکت یا
علت حروف صحیح کے ساتھ موجود نہیں ہوتی جس کی وجہ سے یہ پتا لگانا مشکل ہے کہ یہ بوجھ کون سا ہے،
سمجھ بوجھ والا یا بوجھ بمعنی وزن۔ انگریزی میں انھیں ہم vowels کہتے ہیں۔ سید احمد دہلوی ان حرکتوں

کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”دنیا کے ابتدائی دھندے سب ان تین آوازوں یعنی اَ، اِ، اُ میں موجود تھے اور ہر ایک کیفیت انہیں کے گھٹانے بڑھانے سے حاصل ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جب لوگوں میں اوّل اوّل تمدنی مادہ پیدا ہوا۔ گھر بار بسا کر رہنے، مل جل کر ایک جگہ بیٹھنے اُٹھنے لگے تو انہوں نے اپنے مخاطبوں حاضر اور سامنے کے لوگوں سے خطاب کرنے کے لیے اَ، اشارۂ قرب کے واسطے اِ، کنایہ بعید کے ملے اُ۔ بشرکت اعضائے جسمانی یعنی (سر، انگشت، پا، چشم وغیرہ) سے کام لینا شروع کیا۔ اظہارِ درد، اظہارِ خوشی، ندا ندبہ میں یہی خطابی اَ، کام دیتا رہا۔“(۳۴)

حرفِ اَسب زبانوں میں پہلا حرف یا اعراب پایا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جب منہ سے آ۔ نکالتے ہیں تو سانس کو نکال کر روک لیتے ہیں اور جب اِ۔ نکالتے ہیں تو ذرا زیادہ فاصلہ تک لے جا کر سانس روکتے ہیں اور اُ۔ کو اس سے بھی پرے تک لے جاتے ہیں سب سے زیادہ آسانی حرفِ اَ کے نکالنے میں پائی جاتی ہے فرض کرو کہ ایک دریا کسی مقام سے نکلا ایک بند اُس کے منبع کے قریب لگایا دوسرا اُس سے آگے تیسرا اُس سے بھی آگے پس یہی باعث ہے کہ اَ کا اشارہ سامنے یا نہایت پاس کے واسطے۔ اِک کا اشارہ صرف قریب کے لیے اُ۔ کا اشارہ بعید کے واسطے قرار پایا اس کی مثال لفظ اپنا۔ اِس کا۔ اُس کا سے بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔(۳۵)

صوتیات کے دو پہلوؤں کے بارے میں بات ہوئی تھی ایک بصری اور دوسرا سمعی۔ بصری میں حرکت حروفِ صحیح کے ساتھ نہیں ہوتی مگر سمعی میں اسے حروف سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

منفوس مصمتے (Aspirated)

جن مصمتوں کو سانس کھینچ کر بولا جاتا ہے۔ ان میں زیادہ تر وہ ہیں جن میں دو چشمی ھ موجود ہوتی ہے مثلاً چھ، دھ، ڑھ، لھ، مھ، نھ، ٹھ، کھ، گھ۔ ان مصمتوں کا تقابلی مطالعہ بغیر دو چشمی ھ کے حروف سے ایسے کیا جا سکتا ہے:

چ۔ چھ: چابی۔ چھابی

ڈ۔ ڈھ: ڈال۔ ڈھال

ڑ۔ ڑھ: گڑ۔ گڑھ

د۔دھ: دود۔دودھ

ک۔کھ: آنک۔آنکھ،لاک۔لاکھ

انفی مصمتے

وہ مصمتے جنھیں بولتے وقت ناک سے آواز آئے۔ان کو انفی مصمتے کہتے ہیں،اردو میں انفی مصمتے دو ہیں۔ابواللیث صدیقی کے مطابق تین ہیں۔اردو میں نگ ایک زائد انفی مصمتہ ہے۔ ابواللیث صدیقی اور گوپی چند نارنگ دونوں نے نگ کو ایک خاص صوتیہ قرار دیا ہے لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے مرکب انگریزی قواعد دان اور سنسکرت قواعد دانوں کی پیروی میں مرتب کیا ہے۔(۳۶)

صوت رکنی:(Syllable)

نطقوں کے مجموعہ کو کہتے ہیں جو مصوتے یا متماد (طویل،دراز) پر مبنی ہو یا جس میں مصوتے کے ساتھ مصمتہ یا مصمتے بھی شامل ہوں جو ایک مکمل نطق ہو جو لفظ سازی کرے۔اسے رکن کہتے ہیں۔رکن ہجی کے حروف کو کہا جاتا ہے۔بول کو کہا جاتا ہے۔ایسا رکن ہجی جو اپنا تلفظ لکھتا ہو۔جو ایک مصوتہ (vowel) بھی رکھتا ہو۔جیسے بابا میں با صوت رکنی ہے اس میں ایک حرف ب ہے اور ایک مصوتہ الف ہے۔

زبان کی ادائیگی کے وقت سانس کی ہوا ایک دم سے باہر نہیں نکلتی ، بلکہ زبان کی آوازوں کے ٹکڑے اور سانس کی ہوا کی نکاسی دونوں میں ایک ربط رہتا ہے۔یہ گروہ صوت رکن کہلاتے ہیں۔کسی بھی تقریر کو صوت رکن میں تقسیم کی جا سکتا ہے۔(۳۷)

صوت رکن مختلف زبانوں کے مختلف ہو سکتے ہیں۔کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ایک سانس میں جتنے بول ادا ہوں انھیں صوت رکن کہا جاتا ہے مگر بعض اوقات ایک سانس میں کئی بول ادا ہو جاتے ہیں۔بعض صوت رکن اس طرح آپس میں ملے ہوتے ہیں کہ انھیں الگ کرنا مشکل ہوتا ہے ان کی حدوں کا تعین آسان نہیں۔بقول ڈاکٹر گیان چند:

> ”لفظ میں صوت رکنوں کی حدیں اکثر واضح ہوتی ہیں لیکن بعض صورتوں میں نہیں ہوتیں مثلاً انگریزی لفظ coming میں دو صوت رکنوں کا وجود یقینی ہے لیکن ان کی فصیل کہاں ہے۔m پہلے صوت رکن کا جزو ہے کہ دوسرے کا؟ یہ پہلے صوت رکن کا اخیر یہ اور دوسرے کا مبدا معلوم ہوتا ہے۔ایسی صورتوں میں صوت رکنوں کی تقطیع ناممکن ہے۔ہاکیٹ نے

اس m کو دخلیہ (interlude) نام دیا ہے۔"(۳۸)

سزا میں بھی دو صوت رکن ہیں ۔س + زا۔صوت رکن میں مصمتے تین طرح سے تقسیم ہوتے ہیں اگر پہلے ہوں تو مبدا کہلاتے ہیں، اگر درمیان میں ہوں تو چوٹی، آخر والے اخیر کہلاتے ہیں بعض میں دو صوت رکن ہوتے ہیں اور بعض میں یہ تینوں یعنی مبدا، چوٹی اور اخیر۔ بعض میں مبدا، چوٹی اور اخیر مرکب بھی ہوتے ہیں: مثلاً مرکب مبدا یوں ہوں گے: کرم، عرب، سلیٹ۔مرکب مبدا میں دوسرا مصمتہ ر،ل، و، ی ہوسکتا ہے۔

مرکب چوٹی میں رائگاں، فائدہ،

مرکب اخیر یہ میں ہجر، دوست، گوشت،

با، کھا، سو میں مبدا اور چوٹی ہے۔

چوٹی اور اخیر کی مثال والے صوت رکن یہ ہیں: کب، آس

صرف چوٹی والے صوت رکن درج ذیل ہیں: آ، چھا

گردن، سردی وغیرہ میں دو دو صوت رکن ہیں۔

بعض زبانوں میں کھلے صوت رکن ہوتے ہیں اور بعض میں بند صوت رکن۔

بل (stress)

الفاظ کے تلفّظ میں بل (stress) اہمیت رکھتا ہے۔کون سا لفظ کھینچ کر اور طول دے کر پڑھنا کون سا بغیر طول دیے یہ اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔جن صوت رکنوں کے پڑھنے میں ذرا سا وقت لگتا ہے انھیں طول دے کر پڑھنا پڑھتا ہے تو انھیں بل کہتے ہیں ۔یعنی بل کا تعلّق طویل صوت رکن سے ہے۔ جیسے پرہیز میں ہیز پر طول دینا پڑتا ہے۔جس مصوتے میں بل ہوتا ہے وہ طویل ہوتا ہے۔اور اسی طرح بل دار صوت رکن کا مصمتہ بھی طویل ہوتا ہے۔بل کی اہمیت اس وقت زیادہ اہم ہوجاتی ہے جب موسیقی میں لفظوں کو کبھی کھینچ کر اور کبھی طول دے کر ادا کیا جاتا ہے۔کبھی لفظ اوپر اٹھایا جاتا ہے کبھی دھیمے لہجے میں ادا کیا جاتا ہے۔

سُر (pitch)

اسے tone بھی کہا جاتا ہے۔ہم عام طور پر دوسروں کے بارے میں یہ بات کرتے ہیں کہ وہ اونچی ٹون میں بات کرتا ہے اسے دھیمے لہجے میں بات کرنی چاہیے۔ٹون دراصل صوتی تاروں

کی کپکپاہٹ یا تھرتھراہٹ کو کہا جاتا ہے۔صوتی تاروں میں تناؤ اور اکڑاؤ آواز میں کمی بیشی کا سبب بنتا ہے۔اونچی نیچی اور سطحی آواز ٹون کی تبدیلی کا سبب بنتی ہے۔اوران کی آمیزش سے مرکب سُر ایجاد ہوتے ہیں۔مرکب سروں میں کبھی آواز گراؤ کی طرف آتی ہے اور کبھی چڑھاؤ کی طرف۔سُروں کی تبدیلی سے لفظ کے مفاہیم میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے۔

نطقیات: (فونیمیات:Phonemics/Phonology)

فونیمکس یا فونیمیات وہ علم ہے جو کسی زبان کے فونیم دریافت اور متعین کرے اور اس کی ذیلی اقسام کا مطالعہ کرے۔بعض فونیمکس کو فونالوجی بھی کہتے ہیں۔نطقیات کے حوالے سے ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان لکھتے ہیں:

''نطقیات:نطقوں کا مطالعہ، تجزیہ اور درجہ بندی، ان کے باہمی تعلّقات اور تبدیلیوں کا علم۔''(۳۹)

صوتیات ہمیں ضروری اور غیر ضروری ہر قسم کی متعدد تفصیلات سے دوچار کردیتی ہے۔ہمیں ان سے سروکار رکھنا چاہیے جو مفہوم کی ترسیل میں اہم ہیں۔بقیہ کو نظرانداز کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

فونیمیات یہی کام سرانجام دیتی ہے۔یہ ایک آواز کی تمام ذیلی اصوات کو سمیٹ کر ایک گروہ میں رکھ دیتی ہے اور اسے فونیم کا نام دیتی ہے۔فونیمیات میں صوتیات کے برعکس بہت سی زبانوں کا مطالعہ کرنے کے بجائے کسی ایک زبان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

بقول ڈیوڈ کرسٹل: ''فونیمیات میں ایک خاص زبان کو لے کر اس کی مخصوص آوازوں کا ہی مطالعہ کیا جاتا ہے اس مطالعے میں آوازوں کے تفاعل کا بیان بھی شامل ہے۔یہ علم الفاظ اور الفاظ کے مجموعوں کی پہچان بتاتا ہے اور معنی کے اعتبار سے انھیں ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔مثال کے طور پر جب ہم انگریزی کے مصوتی نظام (vowel system) یا جرمن کے مصمتی آوازوں (consonant sound) یا عربی کے سرلہر (intonation) پر گفتگو کرتے ہیں تو گویا ہم فونیمیاتی (phonological) اقوال کی بات کرتے ہیں۔''(۴۰)

ہم اسے چند آوازوں کے ذریعے مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ کس طرح ہوتا ہے۔مثال کے طور پر دو لفظ ہیں ''گال'' اور ''لاگ'' دونوں میں لام مختلف انداز تلفّظ کیا جاتا ہے۔گال میں ''لام'' کی ادائیگی کے وقت زبان کی نوک اوپر کے دانتوں کے پیچھے مسوڑھوں کو مس کرتی ہے۔تالو اور زبان کا

پچھلا حصہ ایک لمحے کے لیے مل کر جدا ہو جاتے ہیں۔ جبکہ لاگ میں جب لام کو تلفّظ کیا جاتا ہے تو زبان کی نوک اوپر کے دانتوں سے مل کر نیچے دانتوں کے پیچھے مسوڑھوں سے آ کر مل جاتی ہے۔ اور زبان کا پچھلا حصہ اوپر تالو کی طرف اٹھتا ہے تالو اور زبان کے درمیان سے آواز پیدا ہو کر باہر کی طرف سانس کے ساتھ جاتی ہے۔

فونیمیات کے حوالے سے ان آوازوں کا گہرا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ دونوں آوازیں ایک جیسی ہیں مگر ان کی ادائیگی میں آواز پیدا کرنے والے مختلف اعضاء مختلف قسم کے عمل سے گزرتے ہیں۔ لفظوں کی ادائیگی اور معانی کی ترسیل یہاں متاثر ہوتی نظر نہیں آتی۔ اصل فرق اس میں اس لیے پیدا ہوا کہ ایک جگہ لام کی حرکت شروع میں ہے اور دوسری جگہ لفظ کے آخر میں۔ لاگ میں لام مصوتے سے پہلے آتا ہے جبکہ گال میں لام مصوتے کے بعد آ رہا ہے۔ یہاں بولتے وقت ظاہر ہے مصوتے بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ لام یہاں محض ایک فونیمیائی اکائی کے طور پر اپنی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی طرح اگر ہم دو لفظ ''گل'' اور ''لگ'' دیکھیں تو جب ہم کل کو تلفّظ کرتے ہیں زبان نچلے دانتوں کے پیچھے مسوڑھوں سے اٹھ کر اوپر کے دانتوں کے پیچھے مسوڑھوں سے جا کر ملتی ہے۔ زبان کا پچھلا حصہ اوپر کو اٹھتا ہے مگر تالو اور اس کے درمیان اتنا فاصلہ رہتا ہے کہ سانس آسانی سے باہر کی طرف خارج کو مگر جب ہم ''لگ'' کے تلفّظ کو ادا کرتے ہیں تو اس کے الٹ ہوتا ہے۔ زبان سامنے کے دانتوں کے پیچھے مسوڑھوں سے ایک بار مس ہو کر نیچے دانتوں کے پچھلے مسوڑھوں کے ساتھ آلگتی ہے اور زبان کا پچھلا حصہ تالو کے پچھلے حصے کا ساتھ جا ملتا ہے۔

زبان میں اس قسم کے تغیّرات اور لسانی تبدیلیوں کا جائزہ کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ بہت پیچیدہ اور پر پیچ ہے۔ اس میں کئی لسانی مغالطے بھی ہو سکتے ہیں مگر یہی جائزہ اور فونیمی تجزیہ زبان کو سمجھنے اور بہت سے الفاظ کے تلفّظ کے میکینزم کو جاننے اور حل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے ان اصولوں کو جانیں جو کسی زبان کے فونیم کی حرکت اور ادائیگی کے مطالعہ میں معاون ثابت ہو سکیں۔ اسی طرح ایک ہی لفظ کی ادائیگی یکساں طور پر بعض اوقات ایک ہی شخص کے لیے بھی مشکل ہو سکتی ہے اور اگر دو شخص کسی ایک لفظ کو تلفّظ کے ذریعے پیش کرتے ہیں تو اس میں بھی لازمی بات ہے کہیں نہ کہیں اور کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور ہو سکتا ہے۔

تشکیلیہ یا صرفیہ: (اقل ترین معنوی اکائی:Morpheme)

صرفیہ morpheme کو کہتے ہیں۔morph اس کا مخفف ہے جسے مرکبات میں استعمال کیا جاتا ہے۔اسے تشکیلیہ بھی کہا جاتا ہے اور اسے "لفظ" بھی کہا جا سکتا ہے۔اسے لغویہ (lexeme) بھی کہا جاتا ہے۔ جو کہ لغوی طور پر اپنا الگ وجود رکھتا ہو۔ بعض اردو میں اسے مارفیم ہی کہتے ہیں۔یہ وہ معنوی جزو ہے جسے مزید تقسیم نہ کیا جا سکے مثلاً حرف، زبان، کار، سڑک، چھت، وغیرہ

صرفیہ morpheme ایک ایسی چھوٹی سے چھوٹی اکائی ہے جسے مزید چھوٹے پیکروں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ جو ایک واضح لسانی پیکر رکھتی ہے۔اور دوسرے متشابہ صوتیاتی یا لسانیاتی پیکر سے معنیاتی طور پر مختلف ہوتی ہے۔اسے ہم زبان کی سب سے چھوٹی معنیاتی اکائی قرار دے سکتے ہیں۔
صرفیوں اور صرفی قواعد سے متعلّق لسانیات کے شعبے کو morphemics کہا جاتا ہے۔اسے صرفیات بھی کہتے ہیں۔

ان صرفیوں کو تحریر میں لانے کے علم کو علم صرف ترسیمی یا morphography کہا جاتا ہے۔اصول صرف کے حوالے سے ان صرفیوں کو مختلف گروہوں میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

تشکیلیات: (مارفیمیات: morphology)

علم صرفیہ کو morphology کہتے ہیں ۔ مافولوجی میں الفاظ کی ساخت،نوعیت اور تغیّر و تبدل کے علاوہ ان سے مختلف کلمات بنانے کے طریقوں پر غور کیا جاتا ہے۔

مارفیمیات دراصل لفظوں کے ساتھ ساتھ مارفیموں کے باہمی تعلّق اور ان کے ملنے کے اصولوں کے مطالعے کا نام ہے۔ مارفیمیات میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ لفظوں پر مشتمل مرکبات (جو نحو کی ذیل میں آتے ہیں) میں مارفیم کی تبدیلی سے مفہوم میں تبدیلی واقع ہو رہی ہوتی ہے صرف میں واحد جمع، مذکر مؤنث جیسے موضوعات پر بات ہوتی ہے جبکہ مرکب میں تبدیلی نحو کا موضوع ہے کہ لفظ کی تبدیلی سے مرکب تبدیل ہو رہا ہوتا ہے یہ مسئلہ نحو سے تعلّق رکھتا ہے۔چونکہ یہ تبدیلی مارفیم کی وجہ سے ہو رہی ہوتی ہے تو اس لیے اسے نہ صرف کے کھاتے میں ڈالتے ہیں اور نہ نحو کے، بلکہ اسے مارفیمیات کا مسئلہ بنا کر قواعد کے بجائے لسانیات کی بحث بنا دیا جاتا ہے۔[۴۱]

مارفیمیات قواعد کے بجائے لسانیات کی شاخ سمجھی جاتی ہے۔

مارفیم اور لفظ

مارفیم کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو غمناک ایک لفظ ہے مگر دو مارفیم ہیں یعنی غم اور ناک۔ اسی طرح اَمِٹ ایک لفظ ہے مگر دو مارفیم ہیں جن میں ایک مارفیم اَ اور دوسرا مٹ ہے۔

وہ مارفیم جو اپنے الگ معنی دیتے ہیں آزاد مارفیم کہلاتے ہیں مثلاً در، ڈر، دن وغیرہ۔ اسی طرح جو مارفیم اپنے الف معنی نہیں دیتے بلکہ کسی اور مارفیم کے ساتھ مل کر معنی دیتے ہیں انھیں پابند مارفیم کہا جاتا ہے۔ پھولدار، پھلدار یہاں دار ایک ایسا مارفیم ہے جو کہ پھول اور پھل کے ساتھ مل کر معانی دے رہا ہے۔

ہم صوت مارفیم

اردو میں آم، عام۔ وغیرہ کو ہم صوت مارفیم کہا جائے گا۔ جو تلفّظ کے لحاظ سے تو کسی دوسرے مارفیم ہی کے مانند ہیں مگر چونکہ ان کے معنی مختلف ہیں لہٰذا انھیں ہم صوت مافیم کہا گیا ہے۔[۴۲]

صرف نطقہ: (Morphophonemics)

یہ وہ شعبہ ہے جس میں صرفیوں کے ترکیبی اجزا کے نطقیاتی پہلوؤں اور صرفیوں میں ہونے والی نطقیاتی تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

مشتقہ (etymon)

اسے عموماً مادہ کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ لفظ ہے جس سے ہم کسی لفظ کے اشتقاق کا پتہ چلاتے ہیں۔

ماہر علم اشتقاق کو etymologist کہا جاتا ہے اور اشتقاقی کو etymological کہتے ہیں۔

اشتقاقیات: (Etymology)

اسے علم الاشتقاق بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لسانیات کا وہ شعبہ ہے جس میں الفاظ کی اصل کے بارے میں بحث کی جاتی ہے اور اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور دوران مطالعہ لسانی گروہ میں ان الفاظ کے قدیم سے قدیم دور کا تعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اشتقاق کی کلید لفظ کو etymon یعنی مشتقہ کہا جاتا ہے۔ اشتقاق سے متعلّق یا مطابق کو اشتقاقی کہتے ہیں اس کے لیے انگریزی لفظ

etymological استعمال ہوتا ہے۔اشتقاقیات کے ماہر کو etymologist کہا جاتا ہے۔یہ شعبہ الفاظ کے قدیم ترین دور کا تعین کرتا ہے۔

معنیات:(Semantics)

جتنی بھی لسانیاتی فارم بنتی ہیں، جو بھی اصوات اور الفاظ زبان میں شامل ہوتے ہیں وہ کوئی نہ کوئی معانی ضرور رکھتے ہیں۔زبان میں لسانی عمل کے ذریعے بامعنی آوازیں الگ کی جاتی ہیں پھر ان کے لیے متعیّن کردہ الفاظ اور علامات کے معانی پر بحث کی جاتی ہے۔معنیات کا شعبہ انھیں معانی سے تعلق رکھتا ہے۔جو آوازیں بامعنی نہیں ہیں وہ صرف بے ہنگم آوازوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، اسی طرح جو الفاظ کسی معنی تک نہ پہنچائے یا جو کسی معنی کے مترادف یا متضاد نہ ہوں وہ آڑی ترچھی لکیروں سے زیادہ کچھ نہیں۔بقول ڈیوڈ کرسٹل:

> ''کسی زبان کی لفظیات (vocabulary) یا لغت (Lexicon) بھی مطالعے کا اہم موضوع ہے کیونکہ ہم میں سے اکثر لغت کی ایسی کتابوں سے استفادہ کرتے رہتے ہیں جن میں زبان کا ذخیرۂ الفاظ جزوی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔''(۴۳)

اشارے کو کسی لفظ سے کیسے جوڑا جاتا ہے، یا کسی علامت کو کن معنوں میں اور کیوں استعمال کیا جاتا ہے اس کا دارومدار حالات اور درپیش صورتحال پر بھی ہوتی ہے، بعض اوقات اس میں اشارہ یا علامت وضع کرنے والے کی نفسیاتی الجھنیں بھی اپنا کردار ادا کر رہی ہوتی ہیں۔

سچ پوچھیے تو معنی کا سارا کھیل نفسیاتی ہے۔''وینڈرے کہتا ہے جانوروں کی زبان میں مشارالیہ سے اشارے کی وابستگی مضمر ہوتی ہے اور اس غرض سے کہ یہ وابستگی ختم ہوجائے اور اشارہ شے سے آزاد ہوکر خود اپنی حیثیت قائم کرلے ایک نفسیاتی عمل کی ضرورت پڑتی ہے اور یہی انسانی زبان کا نقطۂ آغاز ہے۔''(۴۴)

جب ہم کسی لفظ کو پڑھتے یا سنتے ہیں تو فوری طور پر وہ شے ہمارے تصور میں آجاتی ہے جس کے لیے لفظ متعیّن کیا گیا ہوتا ہے یعنی لفظ کے معنی دراصل اُس شے کا تصور ہے جو لفظ پڑھ یا سن کر ہمارے ذہن میں آجاتی ہے۔

لفظ اور شے کا تعلق خود ہمارا متعیّن کردہ ہے اور سراسر مصنوعی ہے۔یعنی لفظ اور شے میں موجود تعلق کو ہم نے خود استوار کیا ہے۔اور یہ من مانا تعلق ہے۔اس کے علاوہ ایک اہم بات کثرت

معنی کی بھی ہے۔ بعض لفظ ایسے ہیں جن کے کئی معانی ہیں اور بعض اوقات کئی لفظوں کے ایک ہی معنی بھی ہو سکتے ہیں۔(۴۵)

شروع میں جب ہم کسی معنی کے لیے لفظ تراشتے ہیں تو اس سے مراد ایک ہی معانی ہوتے ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ لفظ اور دوسرے معنی میں بھی استعمال ہونے لگتا ہے۔ مگر شروع میں جس معنی کے لیے اسے وضع کیا گیا وہ بنیادی طور پر اسی معنی کے ساتھ مختص ہوگا۔ کیونکہ بعض اوقات اصل معنی کے ساتھ ساتھ علامتی اور استعاراتی معنی بھی مراد لیے جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات کوئی لفظ حقیقی معنوں کے ساتھ ساتھ مجازی معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ لفظ پر معنی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ لفظ کی ضرورت اسی وقت محسوس کی جاتی ہے جب ہمیں کوئی معنی بتانے مقصود ہوں۔ ہم لفظوں کے لیے معنی نہیں بناتے بلکہ معنی کے لیے لفظ تراشتے ہیں۔ بقول سہیل بخاری:

> ”جس طرح زبان کے بنیادی اور ابتدائی الفاظ سے نئے نئے الفاظ ڈھالتے رہتے ہیں جنھیں نکاسی کہتے ہیں اسی طرح ابتدائی اور بنیادی معنی سے بھی جنھیں حقیقی معنی کہتے ہیں ہم نئے نئے معنی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جنھیں مجازی معنی کہتے ہیں۔ مغرب کے بعض لوگ اس عمل کو انتقالِ معنی کہتے ہیں لیکن یہ درست نہیں جس طرح ہم مادے سے لفظ بنانے کو لفظ کی تبدیلی نہیں لفظ سازی کہتے ہیں اسی طرح حقیقی معنی سے مجازی معنی نکالنے کو بھی انتقال معنی کی جگہ معنی سازی یا معنی آفرینی کہنا چاہیے۔“(۴۶)

زبان، فکر اور الفاظ کے باہمی تعلق کے مطالعہ کو معنویات کہا جا سکتا ہے۔ علم معنویات علم لسانیات میں دوسرے شعبوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۸۳۹ء میں اسے لسانیات کا الگ شعبہ سمجھا گیا۔ سٹیفل اُلمان لکھتے ہیں:

> "True it was constituted as a separate province of grammer in 1839 in K. Resig's book on Latin philology."(47)

علامتوں اور اشاروں کے علمی مطالعے کا نام معنیات ہے جسے ۱۹۱۳ء میں کر نیرپ (Kr. Neyrup) نے فروغ دیا۔ ۱۹۲۰ء میں فالک (Falk)، ہیٹز فیلڈ (Hatzfeld) اور کارنائی ویلنڈر (Welander)، ہیں سپر برجیسے ماہرینِ لسانیات نے فروغ دیا۔ اسے اصطلاح کے طور پر سب

سے پہلے پولینڈ کے ایک مشہور فلسفی چوسٹک (Chwistok) نے ۱۹۲۰ء میں استعمال کیا۔ جسے دبستان پولینڈ نے ۱۹۳۳ء میں فلسفیوں کی کانفرنس میں semantics نامی اصطلاح پیش کی جسے منطق کا حصہ قرار دیا گیا۔ ویانا کے مکتبہ فکر کے ماہر لسانیات چارلس مورس نے معنویات کی تین درجوں میں تقسیم کی معنویات، فلسفہ عملیات، نحوی ساخت۔ کرناپ (carnap) نے بھی اس کی تصدیق کی۔ اس شعبہ میں باضابطہ قلم اُٹھانے والوں میں سی۔ کے اگڈن (c.k.ogden) اور آئی اے رچرڈ (I.A.Richard) کا نام اہمیت کا حامل ہے جنھوں نے ۱۹۲۳ء میں The Meaning of Meaning لکھی۔(۴۸)

برٹرینڈ رسل نے زبان کے مطالعے کے چار حصے بتائے تھے مگر سٹیفن المان نے انھیں پانچ درجوں میں تقسیم کیا لسانیات، نفسیات، منطقیات بشری (logic epistemology)، علم نحو (Science Syntax)، علم معانی (Science Semantics)۔

"Language has two aspects physiological, or mechanical, and psychological or non-mechanical. Each of these aspects has two sub-divisions; phonologyand morphology for the mechanical side; syntax, and semantics for the psychological; and in addition to these, there is a fifth subject of investigations , etymology, which is essentially historical in character."(49)

زمانے کے ساتھ ساتھ الفاظ اور ان کا معنوی کردار بدلتا رہتا ہے۔ بعض اوقات لفظ کی صوتی اور ہیئتی حالت بدل جاتی ہے اور بعض اوقات اس کی معنوی ترقی اسے کچھ اور معنوں کے ساتھ منسوب کر دیتی ہے۔ ہر لفظ اپنے معانی کی ایک تاریخ رکھتا ہے یہ تاریخ اسے معاشرتی اتار چڑھاؤ کی وجہ سے حال ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سہیل بخاری:

''حقیقت یہی ہے کہ زبان کائنات کے لیے اور لفظ معنی کے لیے بنا ہے۔ ہم لفظ کے لیے معنی تلاش کرنے نہیں جاتے بلکہ معنی کے لیے لفظ گھڑتے ہیں۔ معنی کی یہ اولیت اور لفظ کی ثانویت یعنی لفظ پر معنی کی فوقیت ایک ایسی ناقابلِ تردید حقیقت ہے جو ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔''(۵۰)

مختلف الفاظ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے معانی تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً منشی کا لفظ پہلے پڑھے لکھے کے لیے استعمال ہوتا تھا مگر اب یہ لفظ وکیل کے منشی یا ایسے شخص کے لیے استعمال ہوتا

ہے جس کا مطالعہ یا معلومات علمی زیادہ نہیں۔اسی طرح پہلے خلیفہ اور امیر کے لفظ خلیفۃ المسلمین یا امیرالمومنین، ریاست کے والی اور امیرالبحر وغیرہ کے معانی میں استعمال ہوتے تھے مگر آج کل خلیفہ کے معنی حجام اور پہلوانوں کے استاد کے بارے میں استعمال کیے جاتے ہیں اسی طرح امیر آج کل دولت مند کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح استاد یا ماسٹر صرف اسکول کے اساتذہ کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔جب ہم کہتے ہیں کہ وہ بڑا استاد ہے تو یہ منفی معنی دیتا ہے۔اسی طرح پہلے مسلم عام مسلمانوں کے لیے استعمال ہوتا تھا یا برصغیر میں مسلمان قوم کو کہا جاتا تھا مگر آج کل یہ ایک مخصوص قوم کے لیے لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔اسی طرح مومن پہلے ایمان لانے والے کو کہتے تھے،اب مومن کے لفظ کو بھی ایک مخصوص طبقہ فکر نے اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔الفاظ زمانے اور حالات کے مطابق اپنے معانی بدلتے رہتے ہیں۔جدید انگریزی نظام تعلیم سے پہلے اسلامی دور میں مدرسہ کو ایک اہم تعلیمی درسگاہ ہونے کا اعزاز حاصل تھا مگر اب اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں بن جانے کے بعد مدرسہ اُن معنوں میں مستعمل نہیں رہا۔پہلے عدالتوں میں فیصلہ سنانے والوں کو قاضی کہا جاتا تھا اب قاضی ایک قومیت کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔اور ان کی جگہ جج، سول جج، سیشن جج وغیرہ رائج ہو گئے۔تقریباً تمام زبانوں میں معنوی نظام اسی طرح بدلتا رہتا ہے۔

لسانیات میں یہ بھی ضروری ہے کہ الفاظ کا تجزیہ کیا جائے کہ وہ کس طرح نشانات اور علامات کا کام دیتے ہیں۔زبان کا سارا نظام ہی الفاظ کے سہارے سے چلتا ہے۔الفاظ ہی بامعنی نشانات ہیں جنھیں لسانیات میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔الفاظ ہی سے تراکیب جنم لیتی ہیں، روزمرہ اور محاورہ بنتا ہے۔کسی زبان میں لفظیات کو کردار ادا کرتی ہے وہ زبان کو زندہ رکھتا ہے اور اسے لوگوں کے اظہار بیان کے لیے سند فراہم کرتا ہے۔الفاظ ایک دوسرے سے مل کر مختلف معانی کے ارتقا میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔قواعد الفاظ کے معانی اور مترادفات تک نہیں پہنچاتی بلکہ صرف اس حد تک علم دیتی ہے کہ اسم کیا ہے، حرف کیا ہے اور جملے کس طرح بنتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔مگر لغت ہمیں الفاظ کی اصلیت ان کی اصطلاحی اہمیت کو بیان کرتی ہے۔اگر الفاظ میں حقیقی زندگی میں استعمال ہو رہے ہوں تو ضروری ہے کہ ان کے کوئی نہ کوئی معانی بھی متعیّن کیے گئے ہوں گے۔کیونکہ معانی کے بغیر زبان کی کوئی شکل نہیں بنتی، کوئی اہمیت اجاگر نہیں ہوتی۔

ہم مثال کے طور پر ایک لفظ استعمال کرتے ہیں ''متن''۔اس سے مراد وہ تحریر ہے جو کسی

بھی موضوع کے حوالے سے لکھی گئی ہو۔ متن کو جو معنی دیے گئے ہیں وہ معنی خود بخود پیدا نہیں ہو گئے بلکہ ایک نظام کے تحت اس لفظ کو یہ معنی دیے ہیں۔ معنیات میں معانی کے اسی نظام کا لسانی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ معنیات میں اس بات کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے کہ جملوں میں یا متن میں مختلف الفاظ کا دوسرے الفاظ کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ متن الفاظ کے رشتوں پر مبنی ایک نظام کا نام ہے جسے زبان تشکیل دیتی ہے۔ کچھ الفاظ کو ہم مترادفات سے پہچانتے ہیں اور کچھ کو ان کے متضاد سے۔ مقصد معانی تک پہنچنا ہوتے ہیں چاہے متضاد کے ذریعے وضاحت ہو یا مترادف کے ذریعے۔ مثال کے طور پر دن کو سمجھنے کے لیے ہم لفظ رات کو متضاد کے طور پر لے سکتے ہیں۔ اسی طرح روشنی کے صحیح معنی جاننے کے لیے ہمیں اندھیرے کی بات کرنی ہوگی۔

معنیات دراصل لسانی علامات کے ذریعے حقیقی اشیاء تک پہنچنے کے عمل میں بھی معاونت کرتا ہے۔ یعنی معنیات میں کسی چیز کی اصل اور اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے بجائے صرف اشیاء اور ان کے لیے مختص کی گئی علامات کے تعلق پر بحث اور بات کی جاتی ہے۔ یعنی زبان اور اشیاء آپس میں کس رشتے میں منسلک ہیں، اسی انسلاک کی وضاحت معنیات کا فریضہ ہے۔ معنیات کو معنی کی سائنس کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

زبان کے مطالعے میں لفظیات (vocabulary) اور معنیات (semantics) کے حوالے سے زبان کو دیکھنا سمجھنا اور اس حوالے سے کام کرنا لسانی تحقیق کے باب میں ایک اہم اضافہ جس پر پہلے زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔

اگر ہم کسی بھی لفظ کو دیکھیں تو وہ مختلف معنی دے رہا ہوتا ہے، یہ معنی بعض اوقات تحریر کے سیاق وسباق سے سمجھنے پڑھتے ہیں اور بعض اوقات فوری سمجھ میں آجاتے ہیں کہیں یہ معنی استعاراتی ہوتے ہیں اور کہیں علامتی۔ معنی دراصل یاد آوری کا ایک عمل ہے۔ ہم بچپن سے لفظوں کو ان معنی کے ساتھ یاد کرتے اور دہراتے رہتے ہیں جو ہمارے گھر یا معاشرے میں رائج ہو چکے ہوتے ہیں۔ معنی کا لفظ سے کوئی منطقی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ معنی گھٹی کی طرح ہمیں بچپن سے پلائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کم پڑھے لکھے لوگوں میں لفظ بعض اوقات غلط تلفظ کے ساتھ رائج ہوتا ہے مگر معنی وہی مراد لیے جارہے ہوتے ہیں جو کہ عام طور پر اس لفظ کے لیے متعین کر دیے گئے ہیں۔ ہم شروع سے قاعدہ پڑھنے کا آغاز کرتے ہیں تو آ۔ آم، ب بکری، پ پنکھا، ت تھالی، ٹ ٹوپی، چ چاقو وغیرہ رٹنا شروع کر دیتے

ہیں، پھر آہستہ آہستہ جب لفظوں کی پہچان پختہ ہو کر ذہن میں بیٹھ جاتی ہے تو انھیں حرفوں سے دوسرے لفظ بنانے کی مشق کی جاتی ہے اور پھر لفظ سازی کے بعد جملہ بنانے کا گُر سکھایا جاتا ہے۔ یہ دوطرفہ سلسلہ ہوتا ہے۔ لفظ دیکھیں تو شے کا تصور ذہن مین آجاتا ہے، شے دیکھیں تو لفظ زبان پر یا ذہن میں آ جاتا ہے۔

یعنی نام اور مفہوم ایک دوسرے کے ساتھ دوطرفہ تعلق میں بندھے ہوتے ہیں اور ایک کو پکارا جائے تو دوسری کی یاد دلاتا ہے۔(۵۱) یعنی کسی شے کا تصور ہی دراصل اس لفظ کے معنی ہیں۔ اور یہ رشتہ اور تعلق من مانا ہے اس میں کوئی منطقی جواز نہیں۔

بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ جو کئی معنی رکھتے ہیں انھیں کثیر المعنی کہا جاتا ہے۔ مختلف لفظ کسی ایک ہی معنی کے گرد گھوم سکتے ہیں اور ایک ہی لفظ کے کئی معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات یہ لفظ لکھنے یا بولنے والے پر منحصر ہوتا ہے اور بعض اوقات سننے والے یا قاری پر کہ وہ کن معنوں کو اپنی استعداد یا مفاد کی خاطر لیتا ہے۔

لفظوں کے معنی کی کئی اقسام ہو سکتی ہیں، حقیقی معنی، مجازی معنی، علامتی معنی، بنیادی معنی، ثانوی معنی، لغوی معنی، ذیلی معنی، استعاراتی معنی، معنی جو بھی ہوں وہ بنیادی اور اساسی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ تمام لفظ صرف معنی ہی کی وجہ سے بنائے گئے ہیں۔ اگر لفظ معنی نہیں دے رہا تو وہ آہستہ آہستہ متروک ہو جائے گا۔ ہم معنی آفرینی کے ذریعے حقیقی معنی سے کئی مجازی معنی پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تمام معنی آپس میں کچھ کچھ تعلق ضرور رکھتے ہیں۔

اگر ہم زبان کے مطالعہ اور ابتدائی طور پر زبان کی تدریس کے آغاز پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ لفظیات (vocabulary) یا لغت (Lexicon) اور معنیات (semantics) ابتدائی سطح ہی سے زیر بحث آنا شروع ہو جاتے ہیں مگر زبان کے مطالعے کا یہ عمل صرف زبان سیکھنے کی حد تک ہوتا ہے۔ بچوں کو زبان سکھاتے ہوئے الفاظ اور ان کے معانی؛ مترادفات اور متضادات کی روشنی میں پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں۔ معنیات کے بغیر کسی بھی قسم کا زبان کا مطالعہ یا زبان کی تدریس ممکن نہیں ہے۔

صرف: (Morphomics)

یہ قواعد کا علم ہے جس میں الفاظ اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں اور مختلف کلموں کی ساخت

کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔لفظ کی دو قسمیں ہیں ذیل میں کلمہ اور مہمل کے بارے میں مباحث اور کلمہ کی اقسام اسم،فعل اور حرف اور ان کی اقسام کے حوالے سے بات کی جاتی ہے۔

صرف: اسم،ضمیر،صفت،جنس اور عدد کے مطالعے پر مشتمل ہوتا ہے۔

فعل کی قسمیں

لازم	متعدی	متعدی المتعدی	؟
؟	کھانا	کھلانا	کھلوانا
؟	پینا	پلانا	پلوانا
؟	پڑھنا	پڑھانا	پڑھوانا[۵۲]

صرف لُغت میں پھیر کو کہتے ہیں۔لیکن قواعد کی رو سے یہ وہ علم ہے جس میں الفاظ کے تغیّر و تبدل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔اس سے مختلف کلمات کی ساخت کا پتہ چلتا ہے۔[۵۳]

اس میں حرف، لفظ،کلمہ،اسم،صفت، مصدر، فاعل،فعل،مفعول اور ان کی مختلف حوالوں سے اقسام کا جائزہ لیا جاتا ہے۔صرف میں تذکیر و تانیث، واحد جمع کے حوالے سے مختلف مباحث پر بھی غور کیا جاتا ہے۔

نحو: (Syntax)

نحو میں جملوں کے عناصر ترکیبی کا آپس میں تعلق، جملوں کی ساخت کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور جملے بنانے کے اصول و قواعد پر بات کی جاتی ہے۔اس میں لفظ اور جملے کے باہمی تعلق کو دیکھا جاتا ہے۔فاعل،فعل اور مفعول پر بات کی جاتی ہے۔

نحو وہ علم ہے جس میں اجزائے کلام کی صحیح ترتیب، ترکیب اور تعلّقات باہمی سے بحث کی ہوتی ہے۔مختلف کلمات کے باہمی ربط و تعلق کا پتا چلتا ہے۔اس کے جاننے سے انسان کلام میں غلطی نہیں کرتا۔[۵۴]

کلام اور اس کی اقسام،اضافت کی اقسام،مرکبات، جملہ اور اس کی اقسام پر بات کی جاتی ہے۔

ادغام: (Assimilation)

ادغام سے مراد جذب کرنا کے ہیں۔اپنے اندر سمو لینا، جزو بدن بنا لینا۔

یہاں ادغام سے مراد ان حرفوں کو ملا کر پڑھنا کے ہیں جو کہ ہم مخرج ہوں۔ جیسے بدتر سے بتر۔ ادغام کے بارے میں ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

''جب کسی آزاد لفظ میں کسی لاحقے کا اتصال ہوتا ہے یا دو آزاد الفاظ باہم جڑتے ہیں تو ان کی آوازوں میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لسانی عمل کو عربی میں ادغام، سنسکرت میں سندھی اور اردو میں جوڑ کہتے ہیں۔ یہ دو قسم کا ہوتا ہے خارجی ادغام اور داخلی ادغام۔ داخلی ادغام میں اجالا سے اجیالا، گھاس سے گھسیارا، خارجی ادغام میں نکل آیا، نکلِ آیا، نکلیایا، پڑھ آیا، پڑھِ آیا، پڑھی آیا، پڑھیایا وغیرہ۔''(۵۵)

اس میں جز اول کا آخری اسر جز دوم کی ابتدائی ہمزہ کو خارج کر کے اس کا سُر اپنا لیتا ہے۔ یعنی سقوط ہمزہ۔

گُرگُرانا (غرّانا)، تھرتھرانا (تھرانا)، کُرکُری (کری)۔

اضافی عمل یا الحاقیانہ: (Additative Accretion)

Accretion الحاق کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد کسی اکائی میں کسی زائد عنصر کا اضافہ یا شامل ہونا کے ہیں۔

اضافی فقرہ: (Additive Clause)

بنیادی جملے میں اگر کوئی فقرہ شامل کیا جائے جس سے بنیادی جملے میں پیش کیا گیا خیال کو تبدیل یا محدود کیے بغیر اس میں اضافہ کرے تو اسے اضافی فقرہ کہا جاتا ہے۔

تحریر شناسی: (Paleography)

تحریر شناسی سے مراد قدیم تحریر کے پیکر، اسلوبوں اور طریقوں کا مطالعہ کرنا ہیں۔ پرانی تحریر کے نمونوں کو پڑھنے کا علم Paleography کہلاتا ہے۔ اسی طرح قدیم اور پرانی زبانوں کے تجزیہ کرنے کو Paleontology کہا جاتا ہے۔ جیسے پرانی زبانوں سنسکرت وغیرہ کو پڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ موہنجودڑو اور ہڑپہ کے کھنڈرات سے برآمد ہونے والی مہروں پر لکھی گئی تحریروں کو جانچنے کی کوششیں جاری ہیں۔

صرفیہ اکائی: (Sememe)

لفظ کا وہ عنصر یا جز جو معنیاتی اہمیت رکھتا ہو sememe کہلاتا ہے۔ اسے معینہ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ sementeme معنی کی سب سے چھوٹی اکائی کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح معنیات کے علم کو semantics کہا جاتا ہے۔ اسے متبادل نام کے طور پر علم المعانی یعنی semasiology اور sematology بھی کہا جاتا ہے۔

محل تلفیظ: (Lace of Articulation)

lace سے مراد دھاگوں کا منظّم نظام ہے جبکہ Articulation سے مراد، صاف بولنا، ترسیل، صاف تلفّظ کے ہیں۔ (Lace of Articulation) سے مراد صاف بولنا اور تلفّظ کے ایک منظّم نظام کے ہیں۔

ڈسکورس: (Discourse)

ڈسکورس کی اصطلاح جدید ماہرین لسانیات کے زیر اثر رائج ہوئی۔ خاص طور پر ساسر کے لیکچر جب منظر عام پر آئے تو کئی لسانیاتی اصطلاحات اور نظریات منظر عام پر آئے۔

ڈسکورس کی اصطلاح آج کل جن معنوں میں استعمال ہو رہی ہے ان مخصوص معنوں میں اس کا استعمال سب سے پہلے ۱۹۶۶ء میں فرانس میں بینونستے (Benveniste) شروع کیا تھا۔

ڈسکورس کے مباحث ابتداً ساختیات کے ضمن میں سامنے آئے تھے۔ بعض ماہرین لسانیات جے آر فرتھ کے زیر اثر، خاص طور پر ہالیڈے اور اس کے پیروکاروں نے روایتی گرائمر کی بعض تحدیدات کی نشاندہی کرتے ہوئے گرائمر کے کچھ نئے اصول وضع کرنے کی کوشش کی تو اس ضمن میں یہ بحث چھڑی کہ روایتی گرامر جملے / فقرے تک محدود رہتی ہے اس لیے وہ صرف فقرے کی ساخت اور اس کے منجملہ اجزا کا مطالعہ اور تجزیہ کرتی ہے جب کہ روزمرہ استعمال میں زبان محض منفرد اور مکتفی بالذات فقروں / جملوں یا ان کے مجموعوں پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ کسی مخصوص انسانی صورت حال میں انسانوں کے مابین ایک باہمی لسانی تفاعل (interaction) بامعنی ہوتا ہے۔ اور یہ لسانی تفاعل عموماً فقرے سے زائد پر مشتمل ہوتا ہے جو زبان کے ایک وسیع تر نظام کے اندر ہی معنویت پذیر ہوسکتا ہے۔ جب فقرے سے بڑے مستعمل ٹکڑوں کے مطالعے کی بات ہوئی تو ڈسکورس کے مباحث

نے جنم لیا۔(۵۶)

اگر ہم کبھی افسانے کے حوالے سے ڈسکورس کو سمجھنے کی کوشش کریں تو صورت حال کچھ یوں ہوگی:

"کہانی افسانے کا سلسلہ واقعات ہے اور ڈسکورس وہ سارا بیانیاتی عمل ہے جو کہانی سمیت پورے بیانیے کو محیط ہے۔ کہانی اگر افسانے کا واقعاتی مدوجزر ہے تو ڈسکورس اس کو ممکن بنانے والی لسانی قوت اور حکمتِ عملی ہے۔"(۵۷)

مثل فوکو نے ڈسکورس پر اقتدار اور طاقت کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ صاحبان اقتدار طاقت حاصل کرنے کے لیے اور طاقتور اقتدار حاصل کرنے کے لیے ڈسکورس کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ وہ بیانیہ ہے جسے عام لوگ صداقت اور سچائی کی طرف اشارہ کرنے والا سنگ میل سمجھتے ہیں۔ مگر عموماً حقیقت اس کے برعکس ثابت ہوتی ہے۔

فوکو کے خیالات میں Discourse میں زبان اور عمل کی بہت زیادہ اہمیت ہے اسی طرح سچائی کے تصور کے سلسلے میں بھی علم اور اقتدار کے تعلق کی بھی بہت زیادہ اہمیت ہے۔(۵۸) یعنی ڈسکورس وہ مہابیانیہ ہے جسے ہم اپنی ذات اور شخصیت کی انفرادیت کے لیے استعمال کرتے ہیں، اس کے پیچھے نظریاتی، اجتماعی یا ذاتی مفادات کا ایک سلسلہ موجود ہوتا ہے۔

تقلیب

تقلیب میں لفظ کی اگلی اور پچھلی آوازیں ایک دوسرے کی جگہ لے کر تبدیل ہو جاتی ہیں۔ جیسے پاتھنا، تھاپنا۔کور، روک۔لک، کال۔چکما، چمکا۔ریس، سیر۔رس، سار۔رکشہ، رشکا، کیچڑ، چیکڑ (سرائیکی)۔رت جگا، جگ راتا (پنجابی)۔سُر، رس۔نام، مان۔کون، نوک۔سانپ، پھانس۔گم، مگن۔گھاس، ساگ۔اکڑ، کڑا۔ڈال، لاد۔لگ، گل، نگ، گن۔

حوالہ جات

۱۔ فہمیدہ بیگم، شعور زبان، نئی دہلی، موتی باغ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۷

۲۔ ڈیوڈ کرسٹل، ص ۴۳

۳۔ احتشام حسین، آغا سہیل، اردو لسانیات کا مختصر جائزہ، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۲۶، ۲۷

۴۔ سید احمد دہلوی، علم اللسان، دفتر فرہنگ آصفیہ، ۱۸۹۵ء، ص ۱۱

۵۔ شوکت سبزواری، اردو لسانیات، ص ۴۳

۶۔ شان الحق حقی، زبان کے معیار کا مسئلہ، مشمولہ اخبار اردو، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ۶

۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی زبان، لاہور، فضلی سنز، ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۰

۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، لاہور فضلی سنز، ۱۹۹۸ء، ص ۸۰

۹۔ عبدالحق، مولوی، قواعد اردو، لاہور، سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۲۴

10- phoneme, its nature and use, by Daniel Jones. great Britain 3rd impression, 1966, p.38

11- An introduction to descriptive Linguistics, by Gleason, New York, 1950, p.9

۱۲۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، اردو لسانیات، ص ۵۲

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۷

۱۴۔ محمد یوسف بخاری، ڈاکٹر، سید، کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ، ص ۱۶۱

۱۵۔ اُردو املا ور قواعد (مسائل و مباحث)، مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۰ء، ص ۸۷

۱۶۔ صحیفہ، لاہور، اپریل ۱۹۶۳ء، شمارہ ۲۳، ص ۱۶

۱۷۔ کیفی، پنڈت برجموہن دتاتریہ، کیفیہ، ص ۲۲

18- The Phoneme, by Daniel Jones, Great Britain 3rd impression, 1966, p.10

19- A course in modern Linguistics by Charles F. Hockett. P113

۲۰۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو، دہلی، یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۱ء، ص ۲۱
۲۱۔ ہمارے لسانی مسائل، ص ۷۰
۲۲۔ اُردو لسانیات، ص ۵۵
۲۳۔ ایضاً، ص ۵۶
۲۴۔ کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ، ص ۱۵۹

25- The phneme by Danial Jonnes, p.15

۲۶۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، ص ۲۶
۲۷۔ اردو نامہ، ستائیسواں شمارہ، اردو مصوتے اور ان کی صفات، از ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص ۴
۲۸۔ گوپی چند نارنگ' ڈاکٹر، اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو، ص ۲۵
۲۹۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، ص ۲۲
۳۰۔ الٰہی بخش اختر اعوان' ڈاکٹر، کشاف اصطلاحاتِ لسانیات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء، ص ۱۳۴
۳۱۔ اردوئے معلّٰی، دہلی، لسانیات نمبر، اردو زبان کے مصوتے از مسعود حسین خاں، ص ۱۰۹
۳۲۔ شوکت سبزواری' ڈاکٹر، اردو لسانیات، ص ۴۴
۳۳۔ معیار الاشعار، ص ۲۵، بحوالہ اردو لسانیات، ص ۴۶
۳۴۔ سید احمد دہلوی، علم اللسان، دفتر فرہنگ آصفیہ، ۱۸۹۵ء، ص ۱۳، ۱۴
۳۵۔ علم اللسان، ص ۱۴
۳۶۔ کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ، ص ۱۷۳، ۱۷۴
۳۷۔ اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، ص ۴۰
۳۸۔ گیان چند، عام لسانیات، ص ۱۳۷
۳۹۔ الٰہی بخش اختر اعوان' ڈاکٹر، کشاف اصطلاحاتِ لسانیات، ص ۳۶۹
۴۰۔ لسانیات کیا ہے، ص ۸۱
۴۱۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، مارفیم، مارفیمیات اور اردو میں مستعمل کچھ مارفیم، مشمولہ الماس، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیرپور سندھ، شمارہ ۱۵، ۲۰۱۳، ۲۰۱۴ء، ص ۳۵۹

۴۲۔ اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۵ء، ص ۷۵

۴۳۔ ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے، ص ۹۹

۴۴۔ لینگوئج، ص ۱۲ بحوالہ سہیل بخاری، ص ۱۵۶

۴۵۔ دی پرنسپل آف سیمانٹکس، ص ۱۰۷

۴۶۔ تشریحی لسانیات، ص ۱۷۱

47- The Principles of Semantics, by Stephan Ullmn, Basil Black Well(Oxford, second edition)1957,p.1

۴۸۔ محمد یوسف بخاری، سید، ڈاکٹر، کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ، ص ۲۱۵، ۲۱۶

49- The Principles of Semantics by Stephan Ullman , p-11

۵۰۔ تشریحی لسانیات، ص ۱۵۳

۵۱۔ پرنسپلز آف سیمانٹکس، ص ۷۰

۵۲۔ تشریحی لسانیات، ص ۲۱۰

۵۳۔ منصف خان سحاب، نگارستان، لاہور، مکتبہ جمال، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۵۵۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، ص ۱۳۱

۵۶۔ علمدار حسین بخاری، کلام / ڈسکورس: تعارف و تجزیہ، مشمولہ، تخلیقی ادب، شمارہ ۸، نمل یونیورسٹی اسلام آباد، ص ۳۰۳

۵۷۔ ناصر عباس نیر، آئیڈیالوجی اور تفہیم، مشمولہ سہ ماہی اردو نامہ، مجلس زبان دفتری حکومت پنجاب لاہور، اپریل ۲۰۱۰ء، تا ستمبر ۲۰۱۰ء، ص ۱۷

۵۸۔ قمر جمیل، جدید ادب کی سرحدیں، جلد دوم، کراچی، مکتبہ دریافت، ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۳

ساختیات

ساختیہ کسی چیز، اس کے عناصر اور ٹھوس اجزا کے بجائے رشتوں (Relations) پر مشتمل ہوتا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساختیات رشتوں کا ایک نظام ہے جس میں کسی ایک چیز یا اس کے عناصر کے بجائے پورے نظام کو اہمیت دی جاتی ہے۔

ساختیات ایک ایسا نظام ہے جس کا تعلق لسانیات، زبان، اصوات اور حروف والفاظ سے جوڑا جاتا ہے۔ساختیات دراصل زبان کے مطالعہ کا نام ہے۔

ساختیات کا تصور ماہر لسانیات ساسر کے نظریۂ زبان کی بنیاد پر قائم ہے۔ساسر کے خیال میں زبان کی ساخت زبان کے مختلف عناصر کے درمیان رشتوں کا نظام ہے وہ نظام جس کی بنا پر وہ زبان بولی یا سمجھی جاتی ہے، ساسر کے خیال میں ہم پوری کائنات کو نشانات کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر شے کا ادراک نشانات کی مدد سے حاصل کرتے ہیں۔زبان میں معنی کا نظام بھی نشانات کا محتاج ہے۔انھیں نشانات کی وجہ سے ہر شے کسی نہ کسی رشتے میں منسلک ہے۔انھیں نشانات سے ہم اشیاء کو نام دیتے ہیں اور ان کی الگ الگ پہچان کرتے ہیں۔

ساسر نے زبان کو نشانات کا ایک ایسا علم قرار دیا جس سے اپنی مرضی کے مفاہیم اور مطالب برآمد کیے جاسکتے ہیں۔اس کے نزدیک ہر حرف ایک نشان ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں یہ حرف کس آواز کے لیے مختص کیا گیا ہے یہ ایک اجتماعی لسانیات کا کام ہے جس میں معاشرہ اور اس

کے افراد ہر دور میں شریک رہے ہیں۔ کوئی بھی فن پارہ وجود میں آنے کے بعد اپنے قاری کے رحم وکرم پر ہوتا ہے کہ وہ اس کے متن کو کس طرح پڑھتا ہے اور اس سے کیا معانی مراد لیتا ہے۔ تفہیم کے اس سارے عمل میں بنیادی کردار مصنّف کے بجائے قاری کا بن جاتا ہے۔ کیونکہ مصنّف تو ادب پارے کی تخلیق کے بعد اس سے الگ ہو جاتا ہے۔

ادب کی متنوع اصناف کے ساتھ ساتھ تنقید کی بھی متنوع اقسام وجود میں آتی رہی ہیں۔ کبھی متن کے حوالے سے، کبھی خیال، کبھی اسلوب، کبھی ہیئت کے حوالے سے اور ہیئت کے بعد ساختیاتی تجزیہ سامنے آیا۔

ادب کے ساختیاتی تجزیہ کی بنیاد ساسر کے لسانی نظریے پر رکھی گئی ہے۔ ساسور نے زبان کو نشانات سے تعبیر کیا تھا۔ ادب کے مطالعے میں ساختیات کے اصول اس تعلّق پر قائم ہے جو تعلق ساسر نے زبان langue اور تقریر parole کے درمیان بیان کیا تھا۔

روسی ہیئت پسندوں (۱۹۱۳ء۔۱۹۳۰ء) نے ادب پارے کو ہیئت کے حوالے سے تجزیہ کرنے کی بات کی۔ وہ ادب پارے کے تشکیلی عناصر اور ادب پارے کی بناوٹ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ شکلووسکی اور رومن جیکب سن روسی ہیئت پسندوں میں زیادہ متحرک تھے، انھوں نے آگے چل کر ساخت کے حوالے سے مطالعے کو زیادہ اہمیت دی۔

شکلووسکی نے شاعری کو زبان کی تعمیر قرار دیا جس کی وجہ سے ادب کا مطالعہ زبان اور اس کے مختلف پہلوؤں کے پیش نظر کیا جانے لگا۔ رومن جیکب سن نے اس قسم کے زبان کے مطالعات میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا۔

رومن جیکب سن ۱۹۲۱ء میں روس سے چیکوسلوا کیہ آ گیا اور وہاں سے امریکہ آ کر نیویارک میں تدریسی خدمات سرانجام دینے لگا۔ فرانس سے لیوی سٹراس ۱۹۴۱ء میں امریکہ آ کر اِسی ادارے میں ملازم ہو گیا۔ وہاں رومن جیکب سن کے نظریات سے وہ متاثر ہوا۔

جیکب سن روسی ہیئت پسندوں اور ساختیات پسندوں کی ایک درمیانی کڑی ہے۔ رومن جیکب سن اور لیوی سٹراس نے اپنے مضامین میں ادب کے مطالعہ میں لسانیات کے کردار پر بات کی کہ لسانیات ادب کے مطالعہ میں کیا کردار ادا کر سکتی ہے۔ رومن جیکب سن نے روس، چیکوسلوا کیہ، فرانس اور امریکہ میں نئے نظریات کو متاثر کیا۔

ساسر نے جملے کی افقی اور عمودی جہت کا ذکر کر کے زبان کا ایک بنیادی تصور پیش کیا جسے رومن جیکب سن نے مزید آگے بڑھایا۔اس نے شعریات کے حوالے سے اسے تخلیقی سرگرمی کا حصہ قرار دیا۔یہ دونوں جہتیں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں کام کرتی ہیں۔استعارہ (metaphor) کو وہ عمودی جہت کے حوالے سے بیان کرتا ہے اور (metonymy) کو زبان کی افقی جہت کے حوالے سے پیش کرتا ہے۔اس کے خیال میں زبان بولتے وقت یا تو افقی جہت کی طرف سفر کرے گی یا عمودی جہت کی طرف۔عمودی جہت میں تشبیہہ کا تعلّق ہوتا ہے جبکہ افقی جہت میں تلازمے کا اور ارتباط و انسلاک کا۔عمودی جہت میں استعاراتی لفظ تو بولے جا سکتے ہیں مگر اس میں افقی جہت موجود نہیں رہتی۔یعنی ربط اور انسلاک۔اسی سے وہ ساختیاتی شعریات کو وضع کرتا ہے۔

عمودی جہت میں مشابہت کا تعلّق ہے اور جبکہ افقی جہت میں تبدیلی کا ربط ہے۔شاعر جب کوئی شعر کہتا ہے تو بعض اوقات ایک لفظ کی جگہ دوسرے کئی لفظ لگا کر دیکھتا ہے کہ وزن بحر اور خوبصورتی کس سے پیدا ہو رہی ہے، ابلاغ اور مدعا کی ترسیل کس لفظ سے ممکن ہے، یہ جہت عمودی یا انتخاب کی جہت ہے جس میں لفظ کی جگہ لفظ لایا جاتا ہے۔ہر شاعر اپنے کلام میں کم و بیش اس رویے کو اختیار کرتا ہے۔جب وہ نظم یا غزل کہتا ہے تو اسے تنقید کے مرحلے سے گزارتے وقت کئی الفاظ تبدیل کرتا ہے۔اسی طرح افسانے اور ناول میں بھی بعض اوقات الفاظ کو دوسرے الفاظ سے تبدیل کیا جاتا ہے۔یہ وہ جہت ہے جس کا تعلّق اظہار و بیان سے ہے۔اس میں علامت، کنایہ، رمز، پیکر وغیرہ شامل ہیں۔جیسے اجالا کی جگہ روشنی، دھوپ، چمک، چاندنی وغیرہ میں رشتہ مشابہت کا ہے۔عمودی جہت میں لفظ کے بجائے لفظ آتا ہے مگر افقی جہت میں لفظ کے علاوہ دوسرا لفظ آتا ہے جس میں تعلق ربط اور ارتباط کا ہوتا ہے۔

افقی جہت کا تعلّق اس لفظ کے ربط اور اس سے منسلک لفظ سے ہے۔یعنی دوسرا لفظ پہلے لفظ کی مناسبت سے آئے گا اس کی جگہ نہیں لے گا۔یہ انسلاکی جہت ہو گی۔یہ انتخابی سے ممتاز ہے اور اس کا درجہ وضاحتی کا ہو گا۔زبان کے مختلف اسالیب کا پیرایہ یا تو استعاراتی ہوتا ہے یا وضاحتی۔شعری اظہار و بیان استعاراتی ہوتا ہے جبکہ نثری اظہار وضاحت طلب ہوتا ہے۔مگر بعض اوقات نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی وضاحتی پیرایۂ اظہار دیکھنے میں آتا ہے جیسے سکول کے علاوہ طالب علم، کمرہ جماعت، بلیک بورڈ، استاد یہاں ارتباط پایا جاتا ہے مگر تشبیہہ اور مماثلت نہیں۔

رومن جیکب سن کے خیال میں زبان تخلیق کے دوران دونوں جہتوں سے برابر کام لیتی ہے۔ یہی تخلیقی زبان کی خصوصیت ہے۔اس کے خیال میں شعری زبان میں استعاراتی جہت اور نثری زبان میں انسلا کی جہت کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔رومن جیکب سن زبان کے ترسیلی نظام کو یوں بیان کرتا ہے:

CONTEXT

ADDRESSER ---------- MESSAGE --------- ADDRESSEE

CONTACT

CODE

ہم اسے اُردو میں یوں پیش کر سکتے ہیں:

سیاق وسباق

مخاطب --------- متن، پیغام ---------- قاری، سننے والا

ربط

تحریر کا ضابطہ،لسانی نظام

یعنی اس کے خیال میں صرف متن ہی اس کی بات کی ترسیل میں کافی نہیں ہے بلکہ اس میں سیاق وسباق، جملوں اور لفظوں کا ربط، مخاطب اور لسانی نظام یعنی تحریر کا ضابطہ بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

لیوی سٹراس اور دوسرے کئی فرانسیسیوں نے ساختیات کے حوالے سے کام کیا۔مگر ان میں نمایاں نام اور کام لیوی سٹراس کا ہے جس نے علم الانسان کے حوالے سے ساختیات میں کام کیا۔بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی:

''کلاڈ لیوی اسٹراس (Claude Levi Strauss) نے جس نوع کی ساختیاتی فکر کے حق میں تحریک چلائی۔بطور خاص علم الانسان کے مطالعے کے لیے، وہ ہر نوع کے آورش کے خلاف تحریک تھی یعنی یہ وجودیت اور انفرادیت پسندی کے بھی خلاف تھی۔''(۱)

ساختیات بھی ہیئت پسندوں کی طرح صرف فکر اور معانی پر بات نہیں کرتی۔یہ غیر نظریاتی، غیر تاریخی ہئیتی طریقۂ کار رکھتی ہے، جہاں تک ساختیات کا تعلّق ہے یہ ساخت اور بناوٹ سے جدا ہے۔عموماً نیا قاری ساخت ہی کو ساختیات سمجھ بیٹھتا ہے اور ہیئت اور بناوٹ کے حوالے سے معلومات کو ساختیاتی مواد تصور کرنے لگتا ہے جہاں سے مسائل پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں ہمارے ہاں لسانیات اور تنقید کے طالبِ علم کے لیے ساختیات کو سمجھنا شروع سے ذرا سا مشکل رہا ہے۔دراصل

ساختیات میں نظام کو اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ نظام جس کی وجہ سے مختلف عناصر اس کا حصہ بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

فرائڈ، سوسیوا اور درکھیم تینوں نے فرد کی مرکزی حیثیت پر کاری ضرب لگاتے ہوئے اسے محض ایک ذریعہ قرار دیا ہے لہٰذا بقول ان کے جب فرد کوئی حرکت کرتا ہے تو خواہش اسے آلہ کار بنا رہی ہوتی ہے۔ جب وہ بولتا ہے تو زبان (Langue) اسے ذریعہ بنا کر بولتی ہے اس طرح سوسائٹی جو اس کی ذات کے اندر موجود ہے اسے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ چنانچہ جب ساختیاتی تنقید والوں نے کہا کہ:

زبان بولتی ہے لکھاری نہیں (Writings Writes not Writers)

وہ دراصل اس بات ہی کا اعادہ کر رہے تھے جو مندرجہ بالا تینوں مفکّروں نے کہی تھی۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں تھی کہ تخلیق کار اپنے مطالعہ سے حاصل کردہ معلومات کے اظہار مکرر کے سوا اور کچھ نہیں کرتا کیونکہ اگر ایسی بات ہوتی تو تخلیقی عمل محض ایک اکتسابی عمل قرار پاتا۔ دراصل اس سے مراد یہ تھی کہ جس طرح عام گفتگو کے پیچھے زبان یعنی (Langue) موجود ہے بالکل اسی طرح ادبی تخلیقات کے بطون میں شعریات یعنی POETICS موجود ہے جس کے اپنے خدوخال، ایک اپنا اسٹرکچر ہے۔ جب ادیب لکھنے کے عمل میں مبتلا ہوتا ہے تو شعریت کے اسٹرکچر کے تابع ہو کر (یعنی اسٹرکچرنگ کے عمل سے گزر کر) اپنی قلبِ ماہیت کا منظر دیکھتا ہے۔[۲]

جب ساختیاتی تنقید کسی تخلیق کا تجزیہ کرتی ہے تو نہ تو محض تخلیق کار کے حوالے سے ایسا کرتی ہے اور نہ محض قاری کے حوالے سے، بلکہ تخلیق کو پرت در پرت کھولتی چلی جاتی ہے۔ رولاں بارتھ نے اسے پیاز کی مانند قرار دیا ہے جو پرتوں (نظام) کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جس طرح پیاز کو پرت در پرت کھولتے چلے جاتے ہیں اُس میں سے کوئی راز یا کوئی معنی برآمد نہیں ہوتے بلکہ ایک کے بعد ایک پرتیں ہی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا رولاں بارتھ کے الفاظ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ساختیاتی تجزیہ کوئی مخفی معنی دریافت نہیں کرتا، کیونکہ تخلیق تو پیاز کی طرح ہوتی ہے جو پرتوں (نظاموں) کے ایک عالم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جس کا جسم کسی راز، کسی اصل الاصول سے عبارت نہیں۔ وہ کچھ نہیں سوائے پرتوں کے ایک لامتناہی سلسلے کے جو اپنی سطحوں کے علاوہ اپنے اندر کوئی اور شے نہیں رکھتا۔''[۳]

ساختیاتی تنقید کے مطابق نقاد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ تخلیق کے معنی یا پیغام کی تشریح کرے یا معانی کو از سرِ نو دریافت کرے بلکہ اس نظام کی ساخت کا تجزیہ کرے جس سے معانی کا انشراح ہوا ہے۔ بعینہٖ جیسے ماہر لسانیات جملے کے معنی کو نشان زد کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اس کا کام جملہ کی اس ساخت کو نشان زد کرنا ہوتا ہے جو اس کے معنی کو دوسروں تک منتقل کرتی ہے۔

ساختیات نے تخلیق کو رشتوں کا ایک ایسا سلسلہ قرار دیا جس میں معانی کا کوئی خزانہ چھپا نہیں ہوتا کہ جسے پڑھنے والا دریافت کر لے بلکہ معانی کا عمل قاری کی قرأت کے عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ قاری خود بھی تخلیقی عمل میں شریک ہو جاتا ہے اور وہ فن پارے کی قرأت کے دوران اُن معانی تک پہنچتا ہے جس کی تخلیق وہ قرأت کے عمل سے کرتا ہے۔ ایک قاری مختلف اوقات میں جتنی بار تخلیق کی قرأت کرے گا اتنے ہی معانی کے انشراح کا امکان بڑھتا جائے گا۔ مختلف قارئین ایک ہی تخلیق سے اپنی اپنی قرأت کے دوران مختلف معانی کی تخلیق کا سبب بن سکتے ہیں۔

معانی کی تخلیق دراصل اُس سسٹم یا کوڈ کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے جو کہ تخلیق میں موجود ہوتا ہے۔ اور جو بظاہر نظر نہیں آتا۔ بقول احمد ہمدانی:

"خالص ساختیات میں ظاہری الفاظ و آہنگ سے کہیں زیادہ اہم وہ سسٹم یا کوڈ ہوتا ہے جو تمام فن پاروں کی لفظیات و صوتیات کے پسِ پشت یا لفظیات و صوتیات کے بطون میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ لفظیات و صوتیات میں موجود یہ سسٹم آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔"(۴)

ساختیات کسی ایک جزو یا مرکز کی جگہ پورے نظام کو زیرِ بحث لاتی ہے۔ اسی طرح فن پارے میں موجود متن کو قرأت کے ذریعے معنی کے تناظر میں پرکھا جاتا ہے۔

ایک عام سی مثال ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ انسانی چہرہ تبدیل ہو جاتا ہے لیکن زیرِ سطح چہرے کے خدوخال موجود رہتے ہیں، اس سے بہتر مثال یہ ہے کہ ندی کا پانی کناروں میں محبوس ہو کر اچھلتا کودتا ہر دم تبدیل ہوتا رواں دواں رہتا ہے مگر اس کے بنتے بگڑتے پیٹرن کے اندر ندی کی وہ ساخت سدا موجود رہتی ہے جس کے مطابق ندی کی اچھل کود کا یہ پیٹرن وجود میں آیا تھا۔ تاہم کناروں کا بہرحال ایک وجود ہوتا ہے جب کہ ساختیہ کے کنارے یا کھائیاں غیر مرئی وجود کی حامل ہیں۔ اور آرکی ٹائپ کی طرح اندر سے خالی ہوتی ہیں اب اگر اس بات میں یہ اضافہ کیا جائے کہ ساختیہ کی کھائیاں اپنے مخصوص پیٹرن کی structuring کرتی ہیں تو ساختیہ کا یہ خاص وصف پوری طرح واضح

ہو جائے گا۔(۵)

اگر ہم جدید طبیعات کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ جدید طبیعات نے مرکزہ کی جگہ پیٹرن کو دے دی ہے جو اصلاً رشتوں یا CONECTIONS سے بننے والی ایک گرہ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اب BUILDING BLOCKS ٹھوس مادی وجود کا تصور باقی نہیں رہا لہٰذا تصویر یہ نہیں ابھرتی کہ اجزاء ایک مرکزہ کل کے گرد طواف کر رہے ہیں بلکہ یہ کہ ایک پیٹرن موجود ہے جس کے تمام حصے آپس میں جڑے ہوئے ہیں اور یہ پیٹرن ہمہ وقت بننے اور جڑنے ٹوٹنے میں مبتلا ہے یعنی حرکی ہے۔

ساختیات کسی ایک پہلو پر غور کرنے کے بجائے گُل کو اہمیت دیتی ہے۔ یعنی کلیت کے فارمولے پر عمل پیرا ہے۔ جس طرح جدید طبیعات میں اب نیوکلس یعنی مرکزہ کی اہمیت کے بجائے پیٹرن پر زور دیا جاتا ہے اسی طرح ساختیات بھی رشتوں کی بات کرتی ہے جن سے وہ عناصر یا اجزاء آپس میں باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ساختیات تخلیق کی کلیت کے ساتھ مطالعے مین قاری کو بھی تخلیق کا شریک کار قرار دیتی ہے۔ ساختیات تخلیق کے تجزیے میں قرأت کو اہمیت دیتی ہے۔ جس طرح کسی میکانکی عمل میں ناظر کی حیثیت ہوتی ہے اسی طرح ساختیات میں تخلیق کے ساتھ قاری کو اہمیت دی جاتی ہے۔

> ''سوسائٹی کسی مرکزہ کے گرد افراد کے طواف کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک ایسا پیٹرن ہے جس میں مثبت اور منفی نوعیت کی لہریں سدا ایک دوسرے سے ٹکراتی اور نئے نئے روابط میں متشکل ہوتی رہتی ہیں۔''(۶)

ساختیات میں اس بات کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے تخلیق کے معانی کیا ہیں۔ اس سے کیا معانی و مفاہیم برآمد ہو رہے ہیں بلکہ اس بات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ کہ وہ تخلیق کن تخلیقی مراحل سے گزری ہے۔

اسی طرح قاری جب کسی متن کی قرأت کرتا ہے تو وہ متن کو سمجھنے کے عمل میں خود اپنی انفرادیت اور شخصیت کو اس لمحے کھو بیٹھتا ہے اور اس کے اپنے خیالات کی جگہ خارجی خیالات لے لیتے ہیں جنھیں وہ متن سے حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ ساختیات کے مطابق کوئی بھی قرأت حتمی نہیں، کوئی بھی معنی اپنی نئی تشکیل کی طرف جا سکتا ہے۔ کوئی بھی سوچ ایسی نہیں جس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو سکتی ہو۔ ساختیات نے ان سے ہٹ کر ایک نیا تصور دیا کہ نقاد کو نظم یا کسی بھی فن پارے کی ساخت

کے اندر سفر کر کے یہ دیکھنا چاہیے کہ نظم یا فن پارے کی معنوی تعبیر کس طرح سے اور کن مراحل سے ممکن ہو سکتی ہے۔ ایک سوال تو نظم کے معنی کا ہے کہ یہ کیا ہے اور دوسرا سوال یہ ہے کہ نظم کیسی لکھی گئی ہے ساختیات دوسرے سوال سے بحث کرتی ہے۔ نظم کی ساخت کو دریافت کرتے کرتے نظم کے در و بست ہمارے سامنے ابھر آتے ہیں۔(۷)

ساختیاتی عمل میں نقاد یا قاری کو خود بھی ایک تخلیقی عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔

ساختیاتی تجزیہ کسی ادب پارے میں نئے معانی کی دریافت نہیں کرتا معنی کی کوئی نئی تعبیر پیش نہیں کرتا بلکہ یہ بتاتا ہے کہ کن حالات میں یہ معانی پیدا ہوتے ہیں ہم کسی متن میں مخصوص معانی کن حالات میں پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ عمل کیا ہے؟ جس سے ادب کی مختلف تعبیریں پیدا ہوتی ہیں اور جس کی وجہ سے ادب ایک ادارے کی حیثیت سے قائم ہے۔ جس طرح زبان کے بولنے والے کے ذہن میں اس زبان کے قواعد محفوظ ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ آوازوں کو مخصوص معانی عطا کرتا ہے اسی طرح ادب کا پڑھنے والا، ادب پڑھ پڑھ کر مختلف نشانیوں کی روایتوں کے مفاہیم کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔(۸)

قاری پڑھے جانے والے متن کو ادب کی مختلف اصناف کی صورت میں پہچانتا ہے اور انھیں مخصوص معانی اور شکلیں عطا کرتا ہے۔ انفرادی تخلیق سے آگے بڑھ کر وہ تخلیقی روایت سے آشنا ہوتا ہے اسی روایت سے آشنائی اور اسی روایت کی سمجھ بوجھ سے ادب کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔

> ''ساختیات زبان کو ثقافت کے ایک ''طور'' کی طرح دیکھتی ہے۔ یعنی زبان ثقافت کی رو سے ہے اور زبان ثقافت کے اندر ہے۔ ہر زبان کی ساخت اس کی اپنی ثقافت کی رو سے قائم ہوتی ہے۔ اور اسی ثقافت کے اندر ہی کارگر ہوتی ہے۔ مخصوص ثقافت کے بار و ہی ساخت نہ صرف بے معنی بلکہ کالعدم ہو جاتی ہے۔''(۹)

کوئی بھی مصنّف پہلے اپنی بات، مشاہدے اور تجربے کو اپنے فن کے ذریعے پیش کر کے قارئین تک اپنے من کی بات پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر جدید نظریات اور لسانیات نے زبان کو اہمیت دے کر مصنّف کے اس منشا اور مقصد کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔

ساختیات ہو یا پس ساختیات یا ردتشکیل، سب میں مصنّف کی بنیادی حیثیت پر کاری ضرب لگائی۔ اور ان میں مصنّف کے بغیر تصنیف کے حوالے سے زبان کے تجزیے پر زور دیا جاتا

ہے۔یعنی ساختیات تصنیف کے وجود میں آجانے کے بعد مصنّف کے کردار اور تصنیف پر اس کے اقتدار کو منہا کرنے پر زور زور دیتی ہے۔

''ساختیات میں شے سے زیادہ شے کے خیال یا شے کی فعلیت function کو اہمیت حاصل ہے کیونکہ شے زبان کا مادی پہلو material aspect کہلاتا ہے اور شے کا خیال اس کا ذہنی mental aspect کہلاتا ہے لیکن ان دونوں پہلوؤں کو الگ کر دینا ممکن نہیں ہے۔''(۱۰)

ساختیات کے ماہر تاریخ اور وقت کی نفی کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر شے اپنے عمل function کی صورت میں موجود ہوتی ہے ورنہ شے کا کوئی وجود نہیں۔وہ کسی فن پارے کو اس کے عہد یا تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے اُس نظام کے تحت دیکھتے ہیں جس نظام کے تحت وہ فن پارہ وجود میں آیا ہے اور جس نظام کی وجہ سے قرأت کے ذریعے معانی پیدا ہو رہے ہیں۔

ساختیات کا مسئلہ تقریر یا گفتار سے کہیں زیادہ لسانیاتی نظام Langue کا ہے کیونکہ زبان اپنے اندر مختلف علامات کو چھپائے رکھتی ہے جو تقریر کے عملی امکانات کا تعین کرتے ہیں۔۔ساسر کے نزدیک ساختیات بحثیت عمومی زبان کے نظام اور اس کی ساخت کو تاریخی تناظر سے الگ کر کے دیکھتی ہے ساختیاتی مطالعہ لمحہ، موجود کی صورتِ حال تک محدود رہتا ہے۔(۱۱)

ساختیات کے ترجمانوں میں جن ماہرینِ لسانیات کے نام سرِفہرست لیے جاتے ہیں ان میں ولادمیر پراپ (vladimar propp)، لیوی اسٹراس (levi strauss)، گریماس (Greimas)، بریمونڈ (Bremond)، ٹڈوروف (Tedorof) کے نام نمایاں ہیں۔

اگر ہم انسانی جسم پر غور کریں تو پورے جسم میں بافتوں کا پٹھوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے، اور پورے جسم میں زندگی کی رو، کرنٹ انھیں پٹھوں کے ذریعے رواں دواں ہے،ان پٹھوں کا جو آپس میں تعلق ہے وہ انسانی زندگی اور صحت کے حوالے سے بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور یہی ساختیات ہے جو کہ ایک مرکز کے بجائے مختلف عناصر کے جال کے مابین رشتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔اسی طرح دماغ بھی پورے جسم، ذہن، سوچ کو خارجی عوامل سے ہم آہنگ کرتا زبان کے قائم کردہ نشانات کے ذریعے مختلف چیزوں کو قبول اور رد کرنے کے عمل میں لگا رہتا ہے۔بقول مقصود حسنی:

''دماغ رشتوں سے منسلک ہونے کے سبب باہر کی کائنات کو بھی رشتوں کے جال کے طور

پر دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ تاہم یہ مدلول حرف آخر نہیں کہلا سکتا کیونکہ اسے زیر حوالہ دال کا حقیقی مدلول کہلائے جانے کے لیے دہرائے جانے کے عمل سے گزرنا پڑے گا۔ خاموشی سے وابستہ اختراعی تصور اپنی ذات میں محض اختراع کے سوا کچھ نہیں۔ Signification کے دوران نہ جانے کونسا رشتہ نظر انداز ہو گیا ہو۔ جال تبھی مکمّل ہو گا جب اس کا ہر دھاگہ موجود ہو گا۔"(۱۲)

ساختیات کے نظریے کو اردو زبان میں زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی مگر اطلاعیات میں اس سے کافی مدد کی گئی ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر جیفرے بارڑیل (Jeffrey Bardzell) کا سافٹ ویئر اسٹرکچر ٹو انفارمیٹیکس جب سامنے آیا تو اس کے امکانات میں وسعت پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر عطش درانی لکھتے ہیں:

"اردو اطلاعیات میں ہمیں کسی عبارت اور اس کے اندر استعمال ہونے والی گرامر کے باہمی رشتے کی رسمیات تلاش کرنا ہوگی۔ بنیادی فرضیہ (Hypothesis) یہ بنتا ہے کہ ساختیاتی تجزیات اردو کوائفیے کی تشکیل میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اطلاعیات میں کئی ڈسپلن کام کر رہے ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی تو محض ایک آلہ ہے، اصل رہنمائی لسانیات کی ہے یا پھر ادبی نظریوں (Theories) اور تحقیقی چوحدی (Paradigm) کا حوالہ موجود ہے۔ یوں کمپیوٹر، زبان، ادب، تحقیق اور فلسفہ جیسے ڈسپلن اس میں کام آتے ہیں بلکہ نظریہ سازی کی حد تک سائنٹفک انداز نظر بھی ایک بنیادی کارآمد ڈسپلن ہے۔"(۱۳)

اگر ہم ساختیات کے حوالے سے مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ساختیات روسی ہیئت پسندوں کی تحریک کے زیرِ اثر فرانس میں شروع ہوئی، اس کے بعد ساختیات پہلے انگلستان اور پھر امریکہ میں رواج پانے والی نئی تنقید کی وجہ سے سامنے آئی۔

اُردو میں ڈاکٹر وزیر آغا نے جہاں دیگر ادبی وتنقیدی جہتوں پر بات کی ہے وہیں ساختیات اور ساختیاتی طریقِ کار پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ساختیاتی تنقید اور اس کے بعد ساخت شکن تنقید، جو اِن دنوں مغربی ادبیات میں موضوع بحث ہے، طبیعات کی متوازی پیش رفت سے متاثر ہوئی ہے، بالخصوص کوانٹم طبیعات نے ساختیات اور دیگر تنقیدی مکاتب کے لیے بنیادی نظریات مہیا کیے ہیں۔"(۱۴)

ساختیات نے جدیدیت کے بنیادی تصور سے انحراف کیا۔ جدیدیت کی تحریک کی ناکامی کے بعد ساختیاتی فکر سامنے آئی۔ اس نے تخلیق کے مطالعہ اور تجزیہ کے حوالے سے ایک نیا انداز پیش کیا۔ ساختیاتی فکر کے مطابق مرکزے کی اہمیت ختم ہو جانے کے بعد جب نظام (پیٹرن) کو اہمیت دی جانے لگی تو خواتین نے بھی اُس معاشرے کو رد کرنے کا آغاز کیا جس میں مرد کی حیثیت ایک مرکزے کی سی تھی۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ساختیات جدیدیت کے معروف تقاضوں کے خلاف مطالعۂ ادب کا ایک ایسا طریقہ بن چکا ہے جس میں صرف اقدار اور نظریات ہی نہیں بلکہ الفاظ کے معانی بھی اضافی بن چکے ہیں۔ ساختیات میں سے برآمد ہونے والا نسائی مکتب تنقید ایک لحاظ سے مقصدی ہے کہ وہ ''مرد'' کے گرد گھومنے والی کائنات کے زاویے کے برخلاف ''عورت'' کے زاویے سے دیکھنا چاہتا ہے۔''(۱۵)

ساختیات ایک ایسا طریقِ کار ہے جس میں کسی قسم کے تاریخی فلسفے، اقدار، اخلاق، خیال، کہانی کے بجائے زبان، لسانی اشاروں، صرف ونحو اور لسانی منطق سے جڑے ہوئے نظام کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس میں کسی مفہوم کی دریافت یا انکشافِ حقیقت کے بجائے مخصوص انداز اور لگے بندھے سائنسی طریق کار کو اہمیت دی جاتی ہے۔

بعض ادیبوں کی تحریروں کا لطف ان کی رمزیت ہی میں ہوتا ہے اور اگر رمزیت کو چھوڑ کر اس کے کوئی اور معانی لیے جائیں تو تنقید ادب کی تفہیم کے بجائے صرف ایک مخصوص ڈسپلن بن جائے گا جس سے کوئی بھی شخص اپنی مرضی سے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ نظم پہلے خود کو قائم کرتی ہے پھر کسی دوسری شے کو۔ لیکن شعری زبان کی بڑائی اس کی شئیت میں نہیں اس کی جمالیات اور تاثیر میں ہے، یہ نہیں تو موضوع کتنا ہی بڑا ہو نظم کچھ بھی نہیں۔ لیکن تاثیر پیدا ہوتی ہے معنی سے اور معنی آتا ہے ساخت سے، اور ساخت سے اگر کہانی کے عنصر یا واقعیت یا واقعے کی کڑی سے کڑی ملنے یا (progression) جو زماں کے سکیل پر ہے اور جو مکاں سے کلیتاً باہر نہیں، یعنی اگر بیانیہ کے اس تفاعل کو اگر کر دیں تو کیا نظم کا وجود باقی رہے گا، یعنی کیا نظم نظم رہے گی۔''(۱۶)

ساختیاتی مفکرین نے متن کی بنیادی اہمیت، اساسی حیثیت پر زیادہ زور دیا۔ متن میں سربستہ رازوں کو جاننے کے لیے متن کا مطالعہ ضروری ٹھہرا کہ متن پر قدرت حاصل کر کے متن کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو سامنے لایا جائے۔

ساختیات نے جہاں ادب کو زبان کے حوالے سے نئے رشتوں میں نئے نشانات میں نشان زد کیا ہے وہاں ساختیات کی وجہ سے ادب کے نئے قارئین کو مسائل کا سامنا بھی ہے۔ بعض ناقدین اور دانشور ساختیات کو ایک بے معنی گورکھ دھندا ہے قرار دیتے ہیں، جس کی خاص طور پر اردو ادب میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ اسے اردو ادب میں والہانہ انداز میں خوش آمدید کہا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میراجی اور منٹو کے افسانوں کا ساختیاتی ان کے تحریروں سے اُس پُراسراریت اور حساسیت کو نشان زد نہ کر سکے جو کہ ان کی تخلیقات کی جان ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، جہات، کراچی، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء، ص ۳۶

۲۔ وزیر آغا، ص ۲۴۳، ۲۴۴

۳۔ وزیر آغا، ص ۲۴۶

۴۔ احمد ہمدانی، ساختیات کے بارے میں مشمولہ سہ ماہی تمثال (مدیر سحر انصاری) جلد ۱، شمارہ ۱، ۲، ۳، ۱۹۹۲ء، ص ۵۷، ۵۸

۵۔ وزیر آغا، ص ۲۴۵

۶۔ وزیر آغا، ساختیات اور سائنس، مشمولہ تنقیدی مضامین، مرتبہ سید سجاد نقوی، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۴۷

۷۔ انٹرویو ڈاکٹر تبسّم کاشمیری از ریاض ہانس، سہ ماہی ادب عالیہ انٹرنیشنل جنوری فروری مارچ ۲۰۰۵ء جلد ۵، شمارہ ۱، ص ۱۷

۸۔ قمر جمیل، جدید ادب کی سرحدیں، حصہ دوم، ص ۲۰۰

۹۔ گوپی چند نارنگ، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص ۶۲۰

۱۰۔ احمد ہمدانی، ساختیات کے بارے میں، ص ۵۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۴، ۵۵

۱۲۔ مقصود حسنی، ساختیات پس ساختیات اور ردساختیات ایک اساسی مطالعہ، حصہ دوم، مشمولہ سہ ماہی نوادر، لاہور شمارہ ۱۳ تا ۱۵، ۲۰۰۵ء، ص ۹۵

۱۳۔ عطش درانی، ڈاکٹر، ساختیات برائے اطلاعیات: ادبی نظریے کی جدید ضرورتیں، مشمولہ معیار، شمارہ ۶، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، جولائی، دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۶۸، ۶۹

۱۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ساختیاتی فکر میں پُراسراریت کے عناصر، مشمولہ ''معنی اور تناظر'' (مقالات)، سرگودھا، مکتبہ نردبان، ۱۹۹۸ء، ص ۱۳۰

۱۵۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، جہات، کراچی، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء، ص ۳۷

۱۶۔ جدیدیت کے بعد، ص ۱۶۱، ۱۶۲

پس ساختیات

لسانی نظام دراصل آوازوں کا ایک سلسلہ ہے جس میں مختلف آوازیں ایک دوسرے سے اختلاف کے باعث اپنا الگ وجود رکھتی ہیں، زبان ان آوازوں کو نشانات کی مدد سے مدعا نگاری اور تخلیقِ متن کا کام لیا جاتا ہے۔ ساسر کے خیال میں زبان کا علم اشیاء کو مختلف ناموں سے موسوم کرنا نہیں بلکہ لسانیات نشانات کے ذریعے اشیا کے تصور میں فرق بتاتی ہے۔

ساسر نے زبان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک لینگ اور دوسرا پیرول۔ ان دونوں میں موجود رشتہ آگے چل کر نہ صرف زبان بلکہ علم زبان اور ساختیات اور پس ساختیات کے تصورات میں بھی بنیادی اہمیت کا حامل ثابت ہوا۔ لینگ کے حوالے سے ساسر نے بتایا کہ جو زبان ہم روز استعمال کرتے ہیں اس زبان کا جامع نظام پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ معاشرہ اس نظام سے استفادہ کر رہا ہوتا ہے۔ اور بولنے کے عمل کو اس نے پیرول سے تعبیر کیا جو زبان کے پہلے سے موجود نظام کے بغیر ممکن نہیں۔ لینگ کسی بھی بولنے والے شخص کے ہاں انفرادی خاصیت کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے۔ یعنی اس کے خیال میں لینگ زبان کا ایک مکمّل اور جامع نظام ہے جبکہ پیرول کی حیثیت انفرادی ہے کہ جس کا تصور کسی بھی بولنے والے شخص کے ساتھ مخصوص ہے۔ یعنی لینگ سے لسان یا زبان مراد لی گئی اور پیرول سے زبان کا انفرادی استعمال۔ یعنی زبان کے جامع نظام کی موجودگی کی وجہ سے انفرادی تکلم ممکن ہونا

ہے۔اور انفرادی تکلّم جامع زبان کے مقابلے میں ادھورا ہوتا ہے۔اور جامع زبان کا نظام اپنی مخصوص ساخت رکھتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ آوازوں کا فرق بھی ان آوزوں کے معنی کا تعین کرتا ہے اور معنی کا یہ تصور آوازوں کے فرق سے وجود میں آتا ہے جیسے بال اور کھال، قاضی راضی، بازی، شام، نام، بام، ان مثالوں میں ابتدائی آوازوں کی تبدیلی سے الفاظ کے معنی میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔زبان کی ساخت انھیں آوازوں اور الفاظ کے فرق سے وجود میں آتی ہے۔اور اسی تفریق سے معنی کی تبدیلی عمل میں آتی ہے۔زبان کا رویہ ساختیاتی ہے جس کی بنیاد آوازوں کی تفریق پر ہے۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے آخر میں ساختیات کی جگہ پس ساختیات کے نظریات کا رواج ہوا۔ساختیات کے ماہرین ہی نے پس ساختیات کی بات کی، ان کی نظر ساختیات کی کمیوں اور کوتاہیوں پر تھی یعنی یہ ایک خود احتسابی عمل کی طرح تھا کہ ساختیاتی معذوریوں اور ساختیاتی رویے میں واقع کمی کا محاسبہ کیا جا سکے۔

رولاں بارتھ خیال میں ہر فن پارہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، اور یہ اختلاف دراصل متنیت کا حصہ ہوتا ہے۔اور ہر فن پارہ پہلے سے لکھی گئی متنیت سے تعلّق رکھتا ہے۔ہر فن پارہ پہلے سے موجود ادب کے رشتے میں جڑا ہوتا ہے۔اسی طرح متن دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو آزادانہ پڑھے جانے سے گریز کی طرف لے جاتے ہیں اور کسی خاص معنوں کو اخذ کرنے پر زور دیتے ہیں اور دوسرا وہ جن سے قاری نئے معنی اخذ کر سکتا ہے۔

> ''پہلی طرح کے متن کو بارتھ پڑھے جانے والا اور دوسری طرح کے متن کو لکھا جانے والا متن یعنی تخلیق کیا جانے والا کہتا ہے۔پہلی طرح کا متن محض پڑھنے کے لیے جبکہ دوسری طرح کا متن گویا لکھنے کا جواز پیش کرتا ہے۔اس قسم کے متن سے مسرت اور حظ کا در وا ہوتا ہے۔اس قسم کے متن میں معنی کی نئی کائنات ابھرتی ہے۔اس کا کوئی مقررہ باب نہیں اس میں کسی بھی دروازے سے داخل ہوا جا سکتا ہے اور یہ رکاوٹ نہیں کہ کوئی ایک ہی مخصوص دروازہ ہے۔متن جن کوڈ (رموز) سے کام لیتا ہے وہ تا حدِ نظر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔''(1)

تخلیق میں بنیادی کام قاری کا ہے جس نے اپنی قرأت سے اپنے علم اور ماحول اور ضرورت کے مطابق معنی اخذ کرنے ہیں۔جو معنی وہ کسی ایک وقت میں اخذ کر رہا ہے ہو سکتا ہے کہ دوسری بار قرأت میں وہ کسی دوسرے معنی کی تہہ تک پہنچ جائے۔اس طرح یہ سلسلہ رکتا نہیں ہے۔

بقول مقصود حسنی:

''ردِ ساخت سے مراد موجودہ تشریح سے انحراف جبکہ ساخت شکنی (Deconstruction) کے معنی پہلے سے موجود انکار کر کے یا اسی یا کسی اور زاویے سے آگے (fast) بڑھنا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ کوئی قرأت یا تشریح آخری نہیں۔ اسے کسی بھی وقت رد کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کی جگہ کوئی نئی قرأت یا تشریح پیش کی جا سکتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ وقت، حالات، ماحول حاجات، امرجہ، ضرورتیں، نظریے وغیرہ ساکت و جامد شے نہیں ہیں ان میں تغیّرات آتے رہتے ہیں۔ قاری یا ناظر کسی غیر لچکدار زاویے یا اصول کے ماتحت نہیں۔''(۲)

بارتھ کے خیال میں متن کے یہ کوڈ ساختیاتی نہیں ہیں۔ اس کے خیال میں فن پارے کے لیے اختیار کردہ کوئی بھی نظام (مارکسی، رومانی، جمالیاتی، ساختیاتی وغیرہ)، قاری جب اسے پڑھے گا تو وہ پڑھتے وقت مختلف نقطہ نظر اور انداز اختیار کرے گا جس کی وجہ سے معنی کا اختلاف جنم لے گا۔ جب متن سے مختلف قارئین کے ہاں مختلف معنی برآمد ہوں گے تو اس سے معنی کی وحدت والی بات ختم ہو جاتی ہے۔

بارتھ نے ادب کے حوالے سے جو کچھ لکھا اسے ماہرین پس ساختیاتی دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس دور میں بارتھ نے سائنسی سے بڑھ کر تخلیقی نقطۂ نظر اپنایا ہے۔ اس کے خیال میں ساختیات انسان کے تمام نظامات کو نشانات کی مدد سے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کے خیال میں جب بھی قاری یا نقاد کسی متن کو پڑھتا ہے تو وہ متن کی حدود سے باہر جا کر کوئی ایسا مؤقف اختیار نہیں کر سکتا کہ جس پر بعد میں آنے والے ناقدین اعتراض کر سکیں یا کوئی سوال اٹھا سکیں۔ اس کے خیال میں کوئی بھی تحریر سچائی کی جگہ نہیں لے سکتی اور ہر تحریر من گھڑت اور بناوٹی ہے۔ اس کے خیال میں انسان جو کچھ بھی بولتا ہے وہ زبان کے سہارے بولتا ہے زبان کے بغیر وہ کچھ نہیں بول سکتا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ انسان نہیں بلکہ زبان بولتی ہے۔ اور زبان انسان کو ذریعہ کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ یعنی انسان کے کلام، تکلّم کا تعلّق لسانی نظام پر ہے۔

ادب کے بارے میں بھی اس کا خیال ہے کہ ادیب نہیں لکھتا بلکہ ادب لکھتا ہے۔ وہ نئی تنقید کے برعکس ادب کو ان اشیاء اور تصورات کا مجموعہ قرار دیتا ہے جو کہ سماج کی موضوعیت میں اہم

کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ تخلیق، قرأت اور معنی کو کئی تہوں پر مشتمل ایک پیچیدہ نظام قرار دیتا ہے اور وہ متن کے پہلے سے سوچے گئے نام نہاد معنی کی بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں قرأت اور تخلیق سے معنی کی تفہیم کے دوران سیاسی، سماجی اور تہذیبی وثقافتی نظریات، رومانی و جمالیاتی تصورات کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

پس ساختیاتی فکر کے حوالے سے رولاں بارتھ کا مضمون The Death of Author (مصنف کی موت) اہمیت کا حامل ہے۔ بارتھ کے خیال میں کوئی بھی متن ہو وہ کثیر المعنی ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک ہی متن کو جب دو قاری پڑھتے ہیں تو ان کی قرأت ایک جیسی نہیں ہوتی اسی طرح جب وہ ایک ہی متن سے معنی اخذ کرتے ہیں تو وہ بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس متن میں پائی جانے والی تشبیہیں، استعارے، تلازمے اور حوالے اسے دوسرے متون سے منسلک کرتے ہیں۔ وہ متن کو Intetext قرار دیتا ہے جو کہ مختلف حوالوں اور نسبتوں کے ساتھ کئی دوسرے متون سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں متن کے اس طرح معنی طے شدہ نہیں ہوتے جس طرح سمجھے جاتے ہیں۔ قاری ایک متن کی جس طریقے سے چاہے اس کی قرأت کر سکتا ہے۔ وہ مصنف کے برخلاف کوئی بھی معنی مراد لے سکتا ہے۔ وہ معنی کو التوا میں ڈال دیتا ہے کہ متن سے جو بھی معنی مراد لیے جائیں وہ معنی نہیں بلکہ معنی نما ہیں۔ وہ فن پارے کو بغیر مرکز کے ایک ساخت قرار دیتا ہے۔ جس میں معنی کے امکانات کی کوئی حد نہیں۔

پس ساختیات، ساختیات ہی کا تسلسل ہے اس میں تمام تصورات وہی ہیں جو ساختیات میں مگر فرق صرف ایک بات کا ہے اور وہ یہ کہ ساختیات میں ساسر کے لسانیاتی نظریے کے حوالے سے سگنیفائر اور سگنیفائیڈ میں جو رشتہ ہے وہ وحدت معنی کی طرف لے جاتا ہے اور معنی کی کوئی نہ کوئی معینہ صورت کا امکان باقی رہتا ہے مگر پس ساختیات میں یہ گرہ بھی کھول دی گئی کہ جس کے بندھنے میں معنی کا تصور بندھا ہوا تھا۔ پس ساختیات میں معنی کی وحدت کی جگہ تفریقیت کی بات کی گئی۔ اس حوالے سے زیادہ کام ژاک دریدا نے کیا جس نے ردتشکیل کے نظریے کی بنیاد رکھی۔ لاکاں، آلتھیو سے، رولاں بارتھ اور مشل فوکو نے معنی کی وحدت کی جگہ کثرت معنی کا تصور پیش کیا۔

ساختیات کا لسانیات کے ساتھ تعلق کی وجہ سے سائنسی رویہ سامنے آیا تھا مگر پس ساختیات کا رویہ تخلیقیت اور تکثیر معنی کی طرف مڑتا چلا گیا۔

پس ساختیاتی سوچ اس بات کی کھوج میں سرگرداں رہی ہے کہ کیسے لفظ معنی در معنی ایک

لامتناہی سلسلے سے منسلک ہوکر ادب وتخلیق کی وسیع کائنات میں جلوہ گر ہوتا ہے۔پس ساختیات کے حوالے سے بارتھ کے علاوہ ژاک لاکاں، مثل فوکو اور جولیا کرسٹیوا نے بھی فکری حوالے سے قابلِ قدر کام کیا ہے۔

پسِ ساختیات ایک غیر مقلّدانہ فکری نظریہ ہے۔لاکاں،فوکو، بارتھ اور آلتھیو سے نے اسے عروج تک پہنچایا۔دریدا نے ردتشکیل کے ذریعے ایک نیا تصور حقیقت دیا اور معنی کی طرفوں کو کھول کے رکھ دیا۔نظام صدیقی لکھتے ہیں:

''مابعد جدیدیت موضوعاتی، اسلوبیاتی، ساختیاتی،لفظیاتی اور نحویاتی سطح پر بہت حد تک جدیدیت سے متغائر ہے اور متمائز ہے۔''(۳)

پسِ ساختیات کی فکری اور نظریاتی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں جن مفکّرین نے کام کیا وہ ساختیات کے فکری دھارے سے بھی منسلک رہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ص ۱۶۷

۲۔ مقصود حسنی، ساختیات، پس ساختیات رد ساختیات، حصہ اول، مشمولہ سہ ماہی نوادر، لاہور، گیارھواں شمارہ، ستمبر۲۰۰۴ءتا مارچ ۲۰۰۵ء، ص ۴۰

۳۔ نظام صدیقی، ایوان اردو، فروری ۱۹۹۶ء

فرڈی نینڈ ڈی ساسر

(Ferdinand Saussure)

۲۶ نومبر ۱۸۵۷ء کو جنیوا، سوئٹزر لینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کا نام ہنری فریدرخ سوسئیر تھا۔ سوسئر نے ۲۲ فروری ۱۹۱۳ء کو وفات پائی۔ ان کی کتابوں میں

کورس اِن جنرل لینگوسٹکس (course in general linguistics)،

رائٹنگز اِن جنرل لنگوسٹکس (writings in general linguistics)،

میموری سر لے سسٹم (memoire sur le systom)،

پریمئر کورس ڈی لنگوسٹکس

ڈیکسیم کورس ڈی لنگوسٹکس، جیسی کتابیں شامل ہیں۔

۲۱ سال کی عمر میں اس کی کتاب memoire sur le systom کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں انھوں نے انڈیو یورپین زبانوں میں واول سسٹم کے حوالے سے کام پیش کیا۔ اس کے بعد اس نے سنسکرت زبان کے حوالے سے کام کیا۔ فروری ۱۸۸۰ء میں اس نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ پیرس چلا گیا جہاں اس نے سنسکرت، گوتھک اور اولڈ ہائی جرمن اور دوسرے موضوعات پر لیکچر دیے۔ جب ۱۸۹۱ء میں اسے جنیوا میں پروفیسر شپ ملی تو وہ واپس آ گیا۔

یونیورسٹی آف جنیوا میں ساسر نے سنسکرت اور انڈو یورپین زبانوں پر لیکچر دیے۔ ۱۹۱۱ء تک اس نے تین مرتبہ عام لسانیات کے کورس پڑھائے۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء میں ساسر نے کئی بار کوشش کی کہ عام لسانیات کے مواد پر کتاب لکھی جائے۔ اس نے انگریز، جرمن اور فرانسیسی کے علاوہ یونانی اور اطالوی زبانیں سیکھیں۔

اس نے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء کے درمیان زبان کے اصولوں کے حوالے سے جو لیکچر دیے تھے ان کو اس کے شاگردوں (Charles Bally اور Albert Sechehaye) نے اکٹھا کر کے (cours de linguistique generale) کے نام سے ۱۹۱۶ء میں کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ یہ کتاب بہت مقبول اور مشہور ہوئی۔ اس کا کچھ ناتمام کام ۱۹۹۶ء میں writings in general linguistics کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب کا زیادہ تر مواد ایک کتاب Engler's critical edition of the course میں ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۴ء میں شائع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ساسر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سنسکرت اس نے ابتدا سے پڑھی تھی اور اس کا ذہن و شعور سنسکرت روایت میں رچا بسا تھا۔''(۱)

ساسر بیسویں صدی کے شروع ہی میں ایک نئی لسانی تھیوری دینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کے خیال میں زبانیں ایک ہی قسم کے محور میں گھومتی ہیں اور ایک ہی جیسے فیشن اور انداز میں کام کرتی ہیں۔ اس کے خیال میں تمام زبانیں اپنا ایک جداگانہ تصور رکھتی ہیں اور سب کا اپنا اپنا صوتی نظام ہے۔ سب زبانیں اپنا اپنا دال اور مدلول (سگنیفائر، سگنیفائیڈ) رکھتی ہیں۔ ساسر کہتا ہے کہ زبانیں اپنے اجزائے زبان: الفاظ اور معانی سے گہرے تعلق کا رشتہ رکھتی ہیں۔ زبان میں ہر لفظ کی صوت دوسرے لفظ کی صوت سے مختلف ہوتی ہے جیسے میز کی صوت الگ ہے اور کرسی کی صوت الگ۔

یورپ میں ساسر کے زیر اثر زیادہ کام ۱۹۴۰ء میں پراگ سکول میں ہوا جہاں رومن جیکب سن نے fonology theory کے حوالے سے اہم کام کیا۔

زبان کے حوالے سے ساسر بہت مطالعہ کیا اور اس حوالے سے لسانی تھیوری کی شکل میں جامع نظریات پیش کیے۔

''سوسئیر نے بھی یہ کہا تھا کہ نہ صرف کائنات کے بارے میں انسان اپنی زبان کے ذریعے

سوچتا ہے بلکہ خود کائنات کا وژن اس کی اپنی زبان سے متعیّن ہوتا ہے۔''(۲)

سوسئر نے زبان میں اشیاء کی شناخت کے لیے ان کے ایک دوسرے سے فرق پر رکھا۔ کہ زبان میں افتراق ہے اثبات نہیں۔

فرڈی نینڈ ڈی ساسر نے عام لسانیات میں زبان کے مطالعہ کے لیے اسے دو حوالوں سے تقسیم کیا:

۱۔ ہم وقتی: کسی ایک دور میں کسی ایک مقام پر زبان کا مطالعہ کیا جائے۔

۲۔ ہمہ وقتی: کسی ایک مقام پر زبان کی دور بہ دور حالتوں کا مطالعہ کیا جائے اس کا نام تاریخی لسانیات رکھا گیا۔

ساسر کی یہ بات قابلِ قدر ہے کہ اس نے تشریحی لسانیات کو تاریخی لسانیات کی غلامی سے آزاد کر کے پہلی بار اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی لیکن ابھی اس کا جائز و اہم منصب دلانے کے لیے کسی پس وپیش کے بغیر دوٹوک الفاظ میں یہ اعلان کر دینا بھی ضروری اور باقی ہے کہ تاریخی لسانیات نہ صرف الٹی اس کی پابند ہے بلکہ خود اپنی جگہ ایک بے کار مشغلہ اور گمراہ کُن مفروضہ بھی ہے جس نے لسانیات کے مطالعے کو ایک غلط راستے پر ڈال کر اس کی تحقیق اور فروغ میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔(۳)

تاریخی لسانیات میں چونکہ زیادہ تر کام مفروضوں سے چلایا جاتا ہے جس ماہر لسانیات کے ذہن میں جو مفروضہ آیا اُس نے اُسی کو سند مان لیا، پھر زیادہ مسائل اُس وقت پیدا ہوئے جب کہ ایک ہی غلط مفروضے کو درست مان کر اس پر زیادہ تر ماہرین لسانیات نے کام شروع کر دیا۔

یورپ میں لسانیات کے حوالے سے اٹھارویں صدی میں فرانس سے روسو، جرمنی سے ہرڈر نے شہرت حاصل کی۔ بیسویں صدی میں سوئٹزرلینڈ سے فرڈیننڈ ڈی ساسر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی کتاب (Source of Linguistique Generole) توضیحی تحقیق کے حوالے سے تھی۔ جس میں انھوں نے زبان اور زبان میں صوتی پہلو کے حوالے سے کئی مباحث پیش کیے۔ ساسر نے تمام زبانوں کی ایک گرامر کا کلیہ بیان کیا۔ بیسویں صدی کا نصف اولین دور امریکہ سے تشکیلی توضیحی لسانیات کا آغاز ہوا۔ امریکہ سے بلوفیلڈ کی مشہور کتاب Language ''زبان'' سامنے آئی۔ بلو فیلڈ ۱۸، اپریل ۱۹۴۹ء میں فوت ہوا۔

نصف صدی کے بعد نوم چومسکی کا نظریہ "قواعد تحویلیہ" سامنے آیا۔ ان کی کتاب "تراکیب نحویہ" (Syntactic structures) نے شہرت حاصل کی جو کہ جو کہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی تھی، جس میں اُس نے لغت اور کلام کو مدنظر رکھ کے جملوں کی تخلیق کے بارے میں روشنی ڈالی۔ (عربی اور اردو کے لسانی رشتے، ص ۱۹) نوم چومسکی ۷ دسمبر ۱۹۲۸ء میں فلاڈیلفیا۔ امریکہ میں پیدا ہوا۔

اس کے خیال میں تاریخی لسانیات زبان کے ابلاغ کے حوالے سے جواب فراہم نہیں کرتی جس کی وجہ سے وہ لسانیات کو سائنس بننے میں رکاوٹ ہے۔ ساسئر نے زبان کو نشانات کا نظام قرار دیا۔ اور یہی نشانات زبان کو ابلاغ فراہم کرتے ہیں۔

رولاں بارتھ
(Roland Barthes)

رولاں بارتھ (۱۹۱۵ء۔۱۹۸۰ء) فرانس کا رہنے والا تھا۔ وہ پیرس یونیورسٹی سے کلاسیکی ادب اور فرانسیسی زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ شعبہ تدریس سے وابستہ ہو گیا۔ وہ مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں سے منسلک رہا جہاں زبان کی تعلیم دیتا رہا۔ تنقید، تحقیق اور زبان سے اسے خاص دلچسپی تھی۔

اس کی پہلی کتاب Writing Degree Zero ۱۹۵۳ء میں سامنے آئی۔ اس کے خیال میں متن کو مصنّف کی سوانح کی مدد سے جانچنا ایک طرح سے مجرمانہ غفلت ہے۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

> ''اس کے نزدیک ادبی متن کے عناصر کو صرف ان داخلی رشتوں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے جو وہ متن کے دوسرے عناصر سے رکھتے ہیں۔ یہ نکتہ ساختیاتی فکر کا بنیادی پتھر ہے اس کا کہنا تھا کہ نفسیاتی عوامل کا سادہ لوحانہ اطلاق یوں بھی گمراہ کُن ہے کیونکہ اکثر و بیشتر متن میں کوئی شدید جذبہ، خواہش یا مایوسی ذاتی زندگی کا عکس نہیں، کئی طرح کی کشاکش اور محرومیوں کا بدل ہوتی ہے۔''(۴)

رولاں بارتھ کی کتاب S/Z ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں رولاں بارتھ نے پس ساختیات کے حوالے سے فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا۔جو کہ ایک نئے ادبی تجزیے اور متن کی قرأت کے نئے زاویوں کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔اس کے خیال میں کسی بھی فن پارے کی اگر اپنے رائج معنی کے طلسم سے ہٹ کر قرأت کی جائے تو معانی کا ایک نیا جہان سامنے آجائے گا اور جس سے معنی کی وحدت کا تصور پاش پاش ہو کر بکھر جائے گا۔

رولاں بارتھ کے پس ساختیات کے حوالے سے نظریات کا ابتدائی سراغ اس کے مضمون The Death of the author سے ملتا ہے۔جس میں اس نے معنی کو مصنّف کے حوالے سے اخذ کرنے کی روایت کو مسترد کیا۔اس کے خیال میں معانی متن کی خود اپنی ساخت میں پوشیدہ ہیں۔ جنھیں قاری قرأت کے ذریعے اخذ کرتا ہے۔

رولاں بارتھ کی کتاب The Pleasure of the Text ۱۹۷۳ء میں سامنے آئی۔اس کتاب میں رولاں بارتھ نے متن پر قاری کے حوالے سے فکر انگیز بات کی۔کہ کس طرح قاری متن سے حظ حاصل کرتا ہے اور متن کے کن کن حصوں پر دوران قرأت غالب آجاتا ہے۔

رولاں بارتھ نے روایتی تصورات کے بتوں کو توڑا۔وہ ادب زبان اور تخلیق میں معنی خیزی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔اس کے نظریات کی بنیاد بھی معروف ماہر لسانیات ساسر کے نظریات پر ہے۔وہ signifier اور signified کے درمیان پیدا ہونے والے معنی کے تعلق پر نظر رکھنے پر زور دیتا ہے۔وہ signifier اور signified کو معنی خیزی کا ایک سرچشمہ قرار دیتا ہے۔اس نے لسانی امور اور اصولوں کو گہرائی میں جا کر سوچنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔

اس کے ہاں لسانیات میں کچھ نیا دریافت کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔رولاں بارتھ نے ساختیات کے حوالے سے جو مباحث پیش کیے انھوں نے اسے زبان و ادب اور لسانیات کے شعبہ میں ایک منفرد مقام عطا کیا۔وہ ژاں پال سارتر کے نظریات سے بھی متاثر رہا۔

اس نے زبان کو ایسے نشانات پر مبنی ایک میڈیم قرار دیا جو کہ معنی کے حوالے سے صاف اور شفاف میڈیم نہیں ہے۔اس کے ہاں نشانات (sign) اور اشارات (semiotics) کے حوالے سے مباحث کا ایک نیا زاویہ سامنے آتا ہے۔اس کے خیال میں معنی کی تفہیم اور زبان کی سمجھ بوجھ علم نشانیات (semiology) کے صحیح ادراک کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اس کے خیال میں زبان کے گورکھ دھندے کے ذریعے لوگ عام قاری کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور زبان سے اپنی مرضی کے متعیّنہ معنی اخذ کرانے کی جبری کوشش میں سچائی اور صداقت سے انحراف کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جب کہ متن متعیّنہ معنی نہیں رکھتا اور زبان حقیقت کو جیسی کہ وہ ہے، پیش نہیں کر سکتی۔

اس نے ساختیات کے نظریہ وحدت پر ضرب لگاتے ہوئے اس کائنات میں وحدت کی موجودگی کو خواب و خیال قرار دیا اور تکثیریت کی بات کی۔ اس دنیا میں پائی جانے والی تمام چیزیں تکثیریت کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اُس کے نزدیک وحدت کا نظریہ سوائے واہمے کے اور کچھ نہیں۔ وہ ہر اس کوشش کو پسند کرتا ہے جو کہ مرکزیت کے خلاف ہو۔

اس کی تحریریں مختلف موضوعات کے حوالے سے ہیں۔ اس نے صداقت اور بصیرت کو اپنے نئے نئے خیالات میں پیش نظر رکھا۔ اس نے اس لیے کسی نئے دبستان کی بنیاد نہیں ڈالی کیونکہ وہ ہر قسم کے دبستان سے وابستگی کے خلاف رہا۔ اس نے ساختیات اور پس ساختیات کے حوالے سے نئے نئے نکات اور جہات کو روشنی بخشی۔ وہ بطور ادیب یا نقاد اور نظریہ ساز کے اپنے لیے کسی بھی قسم کے لیبل کے خلاف تھا۔ وہ ہر قسم کی گروہ بندی کے خلاف تھا اسی لیے اُس نے کسی بھی گروہ میں شمولیت اختیار نہیں کی۔

ژاک لاکاں

(Jacques Lacan)

ژاک لاکاں ۱۳/اپریل ۱۹۰۱ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ ۹ ستمبر ۱۹۸۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ نفسیات، تحلیلِ نفسی اور فرائیڈ سے اسے خصوصی دلچسپی تھی۔ اس نے نفسیات اور ادبی تحریروں کے حوالے سے اپنے نظریات پیش کیے۔ اور ادبی تنقید کو ایک نیا رخ دیا۔

اس کی ایک کتاب Ecrits ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔

ایک اور کتاب Speech and Language in Psychoanalysis ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کی کتاب The four fundamental concepts of psychoanalysis ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔

فرائیڈ کی تھیوری کے حوالے سے اس کی کتاب The Ego in Freud's Theory and in the Technique of Psychoanalysis ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔

اس کی کتاب دی ایتھکس آف سائکوانیلیسس (The Ethics of Psychoanalysis (1959,1960 ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔

ژاک لاکاں نے فرائیڈ کی نئی قرأت پیش کی۔ اس نے فرائیڈ کے ان گوشوں پر اپنے مطالعات کی بنیاد رکھی جس پر فرائیڈ کو بھی رکنا اور ٹھٹکنا پڑا۔ ژاک لاکاں کے نزدیک لاشعور ساخت کا

حامل ہے اور اس ساخت کا تجزیہ ممکن ہے۔ لاشعور کے حوالے سے ژاک لاکاں کہتا ہے لاشعور کی دریافتیں اس حد تک ڈرادینے والی تھیں کہ فرائیڈ کو بھی ان سے فرار ہو کر اساطیر میں پناہ لینا پڑی۔

لاشعور کی ساخت پیچیدہ ہے جو عمل در عمل اور تہہ در تہہ لامتناہی دریافتوں کے سلسلہ کی حامل ہے۔ لاکاں نے فرائیڈ کے ان خیالات اور دریافت کو کھوجنے کی کوشش کی ہے جو کہ فرائیڈ کی برداشت کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔ لاکاں کے خیال میں لاشعور بھی زبان کی ساخت ہی کی طرح ساخت رکھتا ہے۔ اس نے ساسر کے معنی اور معنی نما کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے لاشعور کے نظریہ کو تقویت دی۔ اس کے خیال میں معنی نما معنی کے ماتحت ہوتا ہے اور سامنے اور تکلّم میں موجود ہوتا ہے جبکہ معنی سامنے آنے سے گریزاں رہتا ہے اور یہ مبہم رہتا ہے۔ لاکاں نے فرائیڈ کے خوابوں کے نظریے کو مزید وسعت دی اور خوابوں کو اس نے معنی نما کی طرح سمجھا۔ اس کے نزدیک موجودہ ادب میں معنی کی دریافت بھی خوابوں کی دنیا کی سی ہے۔

لاکاں نے اپنے نظریات میں نفسیات، لاشعور، معنی اور معنی نما کے حوالے سے مباحث پیش کیے ہیں۔ کیونکہ لاشعور ہی ادب کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اس نے نفسیات کو فکر کی نئی سطح پر متعارف کرایا ہے۔ اس کے نزدیک لاشعور ہی سب کچھ ہے یہی عقل اور دانش کا منبع ہے۔

اس نے فرائیڈ کے نظریات کو نئی معنویت سے روشناس کرایا۔ لاکاں نے ایک نئی بات کی کہ تحلیل نفسی کا لاشعور ادب ہے۔ لاشعور کی چونکہ ساخت ہے تو لہٰذا اسے بھی زبان کی طرح پڑھنا ممکن ہے۔ یعنی ادب کو لاشعور کی طرح اور لاشعور کو زبان کی طرح پڑھنا ممکن ہے۔

مشل فوکو

(Michel Foucault)

مشل فوکو ایک فلسفی تھا۔ وہ ۱۹۲۲ء میں پیرس میں پیدا ہوا اور ۱۹۸۴ میں اس کا انتقال ہوا۔
اس کی کتاب لینگویج کاؤنٹر میموری پریکٹس (,Language counter-memory
practice) ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کے لیکچر کا مجموعہ ?what is an author کے نام
سے ۱۹۶۹ء میں سامنے آیا۔ اس میں مشل فوکو نے مصنّف کی تحریر پر مختلف حوالوں سے مباحث پیش کیے
ہیں۔ اس کی کتابیں مختلف موضوعات پر ہیں۔

دی برتھ آف دی کلینک ۱۹۶۳ء میں، دی ہسٹری آف سیکسولیٹی ۱۹۷۶ء میں، دی آرڈرز
آف تھنگز ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔

مشل فوکو مطلق صداقت کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں بلکہ ہر شخص اسی با
ت کو صداقت سمجھتا ہے جو اس کے دور میں رائج مختلف پیمانوں اور تصورات کے حوالے سے صداقت
کے برابر محسوس ہو۔ کوئی بھی فلسفہ، نظریہ، تصور یا سائنس اسی وقت تک درست محسوس ہوتا ہے جب اسے
اپنے دور کے مروّجہ قوانین اور صداقت کے معیارات صداقت قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
لکھتے ہیں:

''فوکو ''ڈسکورس'' کو ذہن انسانی کی مرکزی سرگرمی قرار دیتا ہے ایک عام آفاقی ''متن''

معنی خیزی کے ایک وسیع سمندر کے طور پر۔ وہ تبدیلی کی تاریخی جہت کے طور پر نہیں بلکہ

میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ کہنا ممکن ہے وہ ایک عہد سے دوسرے میں بدل

جاتا ہے۔ سائنس میں بھی کوئی نظریہ اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جاتا، جب تک کہ وہ

سائنس کے مقتدر اداروں اور ان کے سرکاری ترجمانوں کے طاقتی توافق سے مطابقت

پیدا نہ کر لے۔''(۵)

مثل فوکو کے ہاں اپس ٹم (Episteme) کے حوالے سے بھی مباحث ملتے ہیں۔ وہ ہر دور کے نظریاتی فکری ڈھانچے کو اپس ٹم قرار دیتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ ہم ایک اپس ٹم کے اختتام اور دوسرے کے آغاز پر کھڑے ہیں۔ وہ ہر عہد کی نمائندہ ادیب شخصیات کا ذکر بھی کرتا ہے اور انھیں نارمل انسان کے ڈسکورس قرار دیتا ہے۔ وہ ڈسکورس کو ایک ایسا مہا بیانیہ قرار دیتا ہے جس سے مختلف شعبۂ ہائے زندگی میں طاقت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ڈسکورس کو سو فیصد سچا تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے ہاں اکثر جگہ ڈسکورس اور طاقت کا ذکر ملتا ہے۔ وہ ڈسکورس سے رویہ، خیالات، اور تصورات مراد لیتا ہے۔

بقول قمر جمیل:

''فوکو کے خیالات میں Discourse یعنی بیان یا ابلاغ کی بہت اہمیت ہے لیکن خود Discourse میں زبان اور عمل کی بہت زیادہ اہمیت ہے اسی طرح سچائی کے تصور کے سلسلے میں بھی علم اور اقتدار کے تعلق کی بھی بہت زیادہ اہمیت ہے فوکو کہتا ہے کہ اقتدار کا براہِ راست تعلق جسم سے ہوتا ہے سرمایہ داری کے زمانہ سے پہلے کے معاشروں میں بھی خارجی قوت ہی جسم کو سزا دے سکتی تھی لیکن سرمایہ دارانہ معیشت نے جسم کو ایک نئی قسم کی محنت میں لگا دیا اور اس جسم سے ایک نئی تخلیقی خدمت حاصل کرنے لگا اس طرح افراد کے جسموں کو، ان کے اعمال اور ان کے رویوں اور برتاؤ کو کنٹرول کرنے لگا۔ ان کی زبان اور ان کے نشانات کو استعمال کر کے انسانوں کے جسم پر اقتدار حاصل کیا گیا۔''(۶)

فوکو کے خیال میں استحصالی طبقہ ڈسکورس کی بنا پر زبان کو آلۂ کار بنا کر تخلیق کاروں اور سوچ رکھنے والوں کو فکری غلام بنانے کا کام کرتا ہے۔

فوکو کی ایک کتاب Psychiatric power ۱۹۷۳ء میں سامنے آئی، اس کتاب میں فوکو نے پاور اور علم کے حوالے سے مباحث پیش کیے۔ یہ ان کے لیکچرز کا مجموعہ ہے۔ جو انھوں نے

کالج ڈی فرانس میں دیے تھے۔

طاقت، ڈسپلن اور سزا، جیل کے حوالے سے ان کی ایک اور کتاب ''ڈسپلن اینڈ پنش''
۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔

فوکو اپنی تحریر Micro Physics of Power میں طاقت کی مختلف صورتوں کے حوالے سے سوالات اٹھاتا ہے۔ یہ تحریر طاقت اور اقتدار کی مختلف صورتوں سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ جہاں اقتدار کی کئی صورتیں بیان کرتا ہے اور جنگ کی قسمیں گنواتا ہے وہاں ان میں سے ایک اہم قسم اس جنگ کی بھی ہے جو کہ زبان میں جاری رہتی ہے۔ جو کہ زبان کو دباتی بھی ہے اور تخلیق پر بھی ابھارتی ہے، وہ طاقت کی وہ تصویر لیتا ہے جس میں طاقت تخلیق کے عمل میں کردار ادا کرتی ہے، طاقت سچائی اور حقیقت کو سامنے لاسکتی ہے اور یہ بے شمار صلاحیتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

فوکو تاریخ کو سائنس قرار نہیں دیتا کیونکہ تاریخ میں زبان کی رنگ آمیزی ضرور ہوتی ہے۔ فوکو نطشے سے متاثر تھا۔ اس نے روایتی فلسفہ اور تاریخ کے بجائے اپنے نظریات کو نظامِ فکر کی تاریخ قرار دیا۔ وہ زبان کے بجائے عمل کو اہمیت دیتا ہے۔

جولیا کرسٹیوا

(Julia kristeva)

۲۴ جون ۱۹۴۱ء کو بلغاریہ میں پیدا ہوئی۔ ساٹھ کی دہائی سے فرانس میں رہائش پذیر ہے۔ یونیورسٹی آف صوفیہ سے تعلیم حاصل کی۔ یونیورسٹی آف پیرس میں پروفیسر رہی۔ وہ کولمبیا یونیورسٹی میں بھی ایک عرصہ وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر پڑھاتی رہی۔ اس کی پہلی کتاب سیموٹک (semeiotike) ۱۹۶۹ء میں سامنے آئی۔

۱۹۷۰ء میں اس نے چین کا سفر کیا۔ جس کے نتیجے میں ۱۹۷۷ء میں اس کی کتاب "About chinese women" کے نام سے سامنے آئی۔ ۱۹۸۰ء میں سامنے آنے والی اس کی کتاب "In desire in Language" میں کرسٹیوا نے بیان کیا ہے کہ کس طرح زبان کی ترقی بچے کو اپنی زبان ایک Speeking subject کے طور پر سیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کی کتابوں میں کئی موضوعات موجود ہیں۔ جولیا کرسٹیوا

Desire in language ۱۹۸۰ء،

Power of horror ۱۹۸۲ء،

Revolution in poetic Language ۱۹۸۴ء،

The Kristiva Reader ۱۹۸۶ء،

New maladies of the soul ۱۹۹۵ء،

Time and sense ۱۹۹۶ء،

Murder in Byzantium ۲۰۰۶ء،

Languge -the unknown ۱۹۸۹ء،

The Samurai ۱۹۹۲ء،

Le Language, Cet inconnu ۱۹۸۱ء، جیسی بہت سی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔(۷)

جولیا کرسٹیوا کا کام تحلیل نفسی پر ہے وہ ان ذہنی کاوشوں اور رویوں کو کھوجنا چاہتی ہے جو انسانی خواہش میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ موضوع کی متحد و منظم ضرورت کے پیچھے متحد اور منظوم شعور کی موجودگی کو ضروری سمجھتی ہے۔ اس کا کام ادبی معنیات کے حوالے سے ہے۔ اس نے انسانی ذہن، نفسیات اور شعری رشتے کی بات کی۔ انسانی ذہن کے بارے میں کہتی ہے کہ یہ ہر وقت مصروف کار رہتا ہے۔ ہم اسے کسی سادہ ورق سے تشبیہہ نہیں دے سکتے۔ یہ جس قدر ہے اس سے زیادہ بڑھنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ وہ نفسیات، تحلیل نفسی اور انسانی ذہن کے حوالے سے اپنے مباحث میں کہتی ہے کہ انسانی ذہن میں ہر وقت کچھ نہ کچھ نفسیاتی ہیجانات اور عمل در عمل اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ سماج انسانی ذہن کو ایک باقاعدگی، سمت اور دھارا عطا کرتا ہے۔ زبان کے باقاعدہ علم میں آنے سے پہلے انسان کے ذہن میں مختلف اصوات، حرکات، اشارات اور اپنی جگہ بناتے رہتے ہیں اور انسان جب زبان کے زیور سے آراستہ ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں موجود لسانی عمل میں یہ مواد اہم کردار ادا کرتا رہتا ہے۔

کرسٹیوا کے خیال میں سماج میں شعری زبان کی بدولت تبدیلی آسکتی ہے مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب سماجی نظام زیادہ سے زیادہ متحد و منظم ہو جائے گا۔ اس کے خیال میں یہ انقلاب اسی وقت آسکتا ہے جب سماج کے مقتدر ڈسکورس میں تبدیلی لائی جائے۔ مگر اسے اس انقلاب کے آنے میں ایک خطرہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ کہیں اس انقلاب اور تبدیلی کو بھی بورژوا آئیڈیالوجی اپنے مقصد کے لیے استعمال نہ کرلے۔(۸) اس کے خیال میں سماجی تبدیلیوں اور پیچیدگیوں کے نتیجے میں ایک وقت ایسا آئے گا جب شعری زبان کی مدد سے سماج میں انقلاب برپا کیا جا سکے گا۔

جولیا کرسٹیوا کے خیال بغیر منظّم اور جامع شعور کے جو کہ ایک عدسے کی طرح کام کرتا ہے ہم کسی بھی چیز کا درست علم حاصل نہیں کر سکتے۔اس کے نزدیک سماج میں موجود مقتدر ڈسکورس کو بے دخل کرنے کے لیے ضروری ہے نئے موضوعات اور شعری زبان میں نئی تبدیلیوں کو راہ دی جائے۔ پسِ ساختیات کے حوالے سے بھی اس کا کام اہمیت کا حامل ہے۔

ژاک دریدا

(Jacques Derrida)

ردِ تشکیل

ژاک دریدا ۱۵ جولائی ۱۹۳۰ء کو الجیریا میں پیدا ہوا۔ ۸، اکتوبر ۲۰۰۴ء کو پیرس (فرانس) میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے ہاورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ اس کی کتابیں آف گریماٹولوجی ۱۹۶۷ء میں، سپیچ اینڈ فینومینا ۱۹۶۷ء، گلاس ۱۹۷۴ء، آف ہاسپیٹیلیٹی ۲۰۰۰ء، مارجنز آف فلاسفی ۱۹۸۲ء، (The ear of thr other) ۱۹۸۴ء، دی گفٹ آف ڈیتھ ۱۹۹۵ء، دی ٹرتھ اِن پینٹنگ ۱۹۸۷ء، رائٹ ٹو فلاسفی ۱۹۹۰ء، ایکٹ آف ریلیجن (Act of religion) ۲۰۰۲ء، ایکٹ آف لٹریچرز، voice and phenomenon ۱۹۶۷ء میں، پالیٹکس اینڈ فرینڈ شپ ۱۹۹۷ء، میں شائع ہوئیں۔

ژاک دریدا نے ردِ تشکیل (Deconstruction) کا نظریہ دے کر ساختیات سے پسِ ساختیات تک کا سفر طے کیا۔ ردِ تشکیل کو پس ساختیات کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ ردِ تشکیل کا نظریہ ۱۹۶۶ء میں سامنے آیا جب جانز ہاپکنز یونیورسٹی میں ایک سیمینار میں ژاک دریدا نے ساختیات کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کیا جہاں اس نے ردتشکیل کی بات کی۔

ژاک دریدا نے ردِ تشکیل کی بنیاد انھیں نظریات پر رکھی جن کو ساسر نے پیش کیا تھا اور جنھیں ساختیات نے بنیاد بنا کر اپنی پوری ساختیاتی عمارت کھڑی کی۔ ردتشکیل کا نظریہ کسی بھی مفروضے،

نظریے، تصور، اصول اور رویے کو حتمی نہیں مانتا وہ معنی کی وحدت پر وار کرتا ہے۔ ردِ تشکیل اُن تمام بنیادوں کو بے دخل کرتی ہے جس پر کوئی نظریہ یا فلسفہ کھڑا ہوا ہے۔ اسی لیے اسے ردِ تشکیل کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ اور تو اور یہ ردِ تشکیل کی بھی رد کو مانتا ہے۔ بقول قمر جمیل:

''سوسئیر کی فکر کا یہ حصہ ہے کہ نشانات کا نظام Differences افتراق پر قائم اس میں کوئی item مثبت نہیں ہوتا یہی بنیادی نکتہ آگے چل کر ردِ تشکیل کی صورت میں ڈھل گیا یعنی صرف نشانات ہی Differences افتراقات پر قائم نہیں بلکہ ہمارا پورا شعور افتراقات Differences کا ایک جال ہے۔''(۹)

دریدا کے خیالات ۱۹۶۷ء میں اس کی پیرس سے شائع ہونے والی ۳ کتابوں سے سامنے آئے۔ اپنے نظریات کی وضاحت اور تشریح کے لیے وہ بعد میں بھی مقالات اور مضامین لکھتا رہا۔ اس نے قدیم فلسفے کے ساتھ ساتھ عصری نظریات کی بنیاد پر وار کیا اور ان کو بے دخل کیا۔ اس کی کتاب of Grammatology سے پس ساختیات اور ردِ تشکیل جیسے نظریات کا آغاز ہوا۔

دریدا عام انداز میں تخلیق کو نہیں دیکھتا اور نہ ہی وہ مروّجہ معنوں میں تخلیق سے معانی برآمد کرتا ہے اور نہ ہی عام طریقے سے اس کی تشریح کرتا ہے۔ وہ تخلیق کے ان عناصر پر زور دیتا ہے جو کہ عام طور پر چھپے ہوئے اور غیر اہم سمجھے جاتے ہیں۔

دریدا نے اپنے خیالات کا آغا ساسئیر کی نظریہ سے کیا۔ ساسئیر کو جب پتہ چلا کہ زبان افتراق سے وجود میں آتی ہے اور افتراق اپنے اندر تضاد کی کیفیات رکھتا ہے تو اس نے زبان کے مثبت کردار کو سمجھانے کے لیے تفریقی عناصر کو ایک کاغذ کی دو طرفوں کے مترادف قرار دے کر انھیں ایک Sign (نشان) سے موسوم کیا۔ یوں ساسئیر نے دو افتراقی چیزوں کو اکٹھا کر کے وحدت کا روپ دے کر اسے نشان کا نام دے دیا۔ دریدا نے ساسئیر کی اسی وحدت کو اپنے نظریے ردِ تشکیل سے توڑ دیا۔ اس کے خیال میں ہر وہ متن جسے لکھا گیا ہے اسے اس کے مروّجہ معنی سے بے دخل کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں:

''ساخت شکنی والے جب متن کو deconstruct کرتے ہیں تو اسے منہدم نہیں کرتے بلکہ اس کے اندر کے تضادات کو سامنے لا کر اس کی بُنت میں استعمال ہونے والے ان دھاگوں کو نشان زد کرتے ہیں جو نظروں سے اوجھل تھے۔''(۱۰)

دریدا کے خیال میں جتنے بھی نظریات ہیں وہ لفظ کی وجہ سے اور لفظ کے معنی کی وجہ سے قائم ہیں۔ کیونکہ وہ معنی پہلے سے طے شدہ ہیں۔ وہ لفظ مرکزیت کا قائل نہیں ہے۔ اس کے خیال میں لفظ کو معنی پہنانے کی تمام کوششیں اور صورتیں بے معنی اور خیالی ہیں۔ وہ معنی کی مرکزیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں معنی کا کوئی مرکز نہیں ہے۔ وہ اپنی بات کو منوانے کے لیے کسی بھی فلسفے یا بات کو الٹ کر دیکھتا ہے جس سے اس کی معنیاتی ترتیب بھی الٹ جاتی ہے۔ جہاں تک تحریر پر تقریر کی تقدیم کی بات ہے ہم اسے الٹ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ تقریر میں بھی تو تحریر کے اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ موجودگی مختلف سرگرمیوں کی ساخت کا نام ہے۔ جیسے انسان اپنے ذہن، فکر، سوچ خیال اور جسم کو ''میں'' یا ''ہم'' کہہ کر موجودگی کا اعلان کرتا ہے۔ مگر فرائیڈ نے شعور اور لاشعور کی تقسیم کر کے انسانی وجود کی وحدت پر کڑا وار کیا ہے۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''دریدا کا دعویٰ ہے کہ زبان کے استعاراتی اور بدیعی نظام کی ساخت ہی کچھ اس نوعیت کی ہے کہ فلسفے میں تصورات کو مطلق معنیاتی بنیاد فراہم کرنا محض آمرانہ عمل ہے۔ دریدا معنی کے لیے جس موجودگی یا مرکز کی بات کرتا ہے اس کی بنیادی دلیل دراصل سوسئیر کے اس نکتے سے ماخوذ ہے کہ معنی نما (Signifier) اور تصور معنی (Signified) (لکھا جائے خواہ بولا جائے) اپنا انفراد کسی مثبت یا معروضی عنصر سے نہیں، بلکہ اس افتراق سے حاصل کرتے ہیں۔''(۱۱)

دریدا اپنا نظریہ مرکزی طور پر ساسر ہی سے وضع کرتا ہے مگر اس سے قطعی اتفاق کرنے کے بجائے اُس میں ذرا سی تبدیلی اور اُلٹ پھیر سے ایک نیا طوفان کھڑا کر دیتا ہے۔ ساسر نے زبان کے نظام کو افتراقی قرار دیا تھا اور اس میں کوئی اثبات موجود نہیں تھا ہر شے اپنے تضاد اور فرق سے پہچانی جاتی ہے۔ ساسر نے زبان میں جو سگنیفائر اور سگنیفائیڈ کے حوالے سے بات کی اور اس افتراق پر قابو پانے کے لیے اس نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے مماثل اور مترادف قرار دے کر ان دونوں کے افتراقی پہلو کو وحدت میں پرو دیا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اس افتراقات کے مسئلے پر تو قابو پانے میں کامیاب ہو گیا جس کی وجہ سے زبان میں انتشار کا خطرہ تھا اور جس سے بچنے کے لیے اس نے زبان میں اثبات کا پہلو نکالا اور نشان کی وحدت کی بات کی کہ signifier اور signified کے درمیان معنوی وحدت ہے کہ ایک نشان کی وجہ سے دوسرے کا تصور ذہن میں آتا ہے اور یوں لفظ اور اس کا خیال ایک

وحدت اختیار کر لیتا ہے۔ دریدا نے اسی وحدت کا پول کھول کر رکھ دیا اور اس پر کاری ضرب لگاتے ہوئے کہا کہ signifier اور signified اپنے اسی افتراقی خصوصیت کی وجہ سے زبان کا کارگر حصہ ہیں اور یہ کبھی ایک وحدت نہیں ہو سکتے۔ دریدا کی فکر کا مرکزی نکتہ اسی افتراق میں پوشیدہ ہے۔ یعنی وہ ساسر کے خیالات سے ہم آہنگ بھی ہے اور اور جدلیاتی طور پر اس کو رد بھی کرتا ہے۔ وہ معنی کے افتراق کی بات کرتا ہے۔ signifier اور signified کسی ایک مرکز کے تحت نہیں لایا جا سکتا۔

اگر پانی کہہ کر پانی مراد لیے جائیں تو ''پ الف نون ی'' میں کوئی ایسی تخصیص نہیں کہ اس سے پانی کا کوئی تعلق ہو۔ بلکہ لفظ اور معنی کا رشتہ یہاں خود اپنی اختراع ہے۔ من مانا ہے۔ اس نظام میں یہ لفظ انہیں من مانے معنی میں استعمال ہوگا۔ یہ معنی اس نظام میں صرف تفریقی ربط کی وجہ سے مراد لیے جاتے ہیں۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ signifier اور signified میں اثبات کے بجائے افتراق کا رشتہ ہے۔ اور ان دونوں میں کوئی وحدت نہیں ہے۔

معنی کو بغیر لفظ کے حاصل نہیں کیا جا سکتا اور ہر لفظ اپنی تشریح کے لیے دوسرے لفظ کا محتاج ہے اس طرح معانی لفظ در لفظ سفر کرتا رہتا ہے اور یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا معنی کی کبھی کوئی منزل نہیں آتی جو کہ آخری ہو یا حتمی ہو۔

دریدا مرکز اور رد مرکز کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ہم ایک مرکز کی رد کرتے ہیں تو پھر دوسرا (جس کی مدد سے مرکز کو رد کیا گیا) مرکز وجود میں آجائے گا۔ ہم اسے بھی پلٹ سکتے ہیں یعنی تردید کے بعد وجود میں آنے والے مرکز کی بھی رد ہو سکتی ہے۔ ہم کسی بھی نظام میں داخل ہو کر اس میں موجود طرفین میں سے کسی ایک کی موجودگی یا اس کی مرکزیت کی رد کر سکتے ہیں۔ جیسے ہم روشنی کی مرکزیت اس لیے رد کر دیں کہ تاریکی کی تخریبی قوت روشنی کو رد کرنے والے عامل کی صورت میں برسرِ پیکار رہتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس مرکز کو رد کر کے ایک نئے مرکز کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ ردتشکیل کا نظریہ چونکہ زبان کی وجہ سے وجود میں آیا ہے اور زبان ''لفظ کی مرکزیت'' سے نہیں بچ سکتی، اس لیے اس کے تجزیے جس طرح دوسرے متون کی ردتشکیل کرتے ہیں اسی طرح دریدا کے نظریے ردتشکیل کی رد بھی ممکن ہے۔

دریدا کے خیال میں لفظ و معنی افتراقی رشتوں کی وجہ سے آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم انھیں موجود نہیں کہہ سکتے۔ دریدا ان کو غیر موجود بھی نہیں کہتا کیونکہ معنی نما تو موجود ہوتا ہی

ہے۔اس کے خیال میں متعیّن معنی موجود نہیں ہوتے بلکہ جو معنی موجود ہوتے ہیں وہ معنی کا عکس ہوتا ہے۔ جسے وہ اثر کا نام دیتا ہے۔

''دیریدا(Dareda) نے تھیوری میں ردتشکیل کا تصور پیش کر کے پورے منظر نامہ ہلا کر رکھ دیا ہے اس تصور سے علمی اور ادبی حلقے خوفزدہ ہو کر رہ گئے تھے ادب وفن اور علوم کے مسلمہ شاہکار لرزاں نظر آنے لگے تھے۔۔ردتشکیل کے تمام مطالعات میں متن کے داخلی مطالعہ پر از بس زور دیا جاتا اور کسی بھی خارجی معاون کی معاونت سے مکمّل گریز کیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی فنی تشکیل کے معنی اس کے فن کی بنت کے اندر پنہاں ہوتے ہیں باہر نہیں۔اس لیے تنقید کے اس طریقے کو ہر درجہ فطری تنقید کا نام بھی دیا جاتا ہے۔''(۱۲)

ردتشکیل کا نظریہ ایک ایسا نظریہ ثابت ہوا جس نے متن اور لفظ معنی کے رشتے کے حوالے سے کئی سوالات اٹھائے۔ردتشکیل ایک ایسا نظریہ ہے جس میں متن میں معنیاتی تضاد سامنے آتا ہے اور متن قول محال کا شکار ہو کر معنی کی وحدت کو کھو بیٹھتا ہے۔ردتشکیل کے تحت ہر متن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو بے دخل کر سکے۔ردتشکیل کا کام متن کے داخلی تضادات کو آشکار کرنا معنی کی عدم موجودگی کا سراغ دینا ہے۔

ہر متن اپنے رد کی صلاحیت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ردتشکیل باہر سے نہیں بلکہ خود متن کے اندر داخل سے تعلّق رکھتی ہے۔دریدا ڈی کنسٹرکشن کو خود متن کا اپنا ردعمل قرار دیتا ہے۔ظاہر ہے کہ جب ہم کسی متن کی ڈی کنسٹرکشن کریں گے تو اس میں خود متن کا کردار بنیادی نوعیت کا ہوگا۔جس کی ڈی کنسٹرکشن کی جا رہی ہے۔

دریدا نے معنی کے عدم تعین کی بات کی۔وحدت کی جگہ تکثیریت کا نظریہ دیا۔اس نے معنی کی عدم تشکیل کو بنیاد بناتے ہوئے متن کی ساخت شکنی کی بات کو آگے بڑھایا۔

ردتشکیل کا زیادہ زور متن پر رہا۔متن کے حوالے سے ردتشکیل جو سوالات اٹھائے اور جس طرح متن کو اپنے نظریے کا مرکز ومحور بنایا اُس سے متن کی حیثیت خود اپنی جگہ بے حیثیت ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے۔ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے بقول:

''تفسیرات وتوضیحات کے حوالے سے جو کام اصل متن سے لیا جاتا رہا ہے اس کے لیے اب ساخت شکن فکر میں اصل متن کی جگہ دوسرا متن تیار کرنے پر زور ہوا۔''(۱۳)

ردِ تشکیل مروّج رویوں کو ایک نئے انداز سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تخلیق کو سرے سے منہدم نہیں کرتی بلکہ اپنی توجہ اس رخ کی طرف مبذول کرتی ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔

''دراصل ساخت شکنی کا عمل ایک الگ نظریے کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اصلاً ایک process ہے جس کا مقصد رائج نظریے پر جمنے والی زنگ اور کُہنگی کو اس طور اتارنا ہے کہ اس میں سے نئے معانی کا انعکاس ہونے لگے۔''(۱۴)

ردِ تشکیل ساختیات سے اس حوالے سے متضاد ہے کہ اس کے نزدیک ساختیات ایک باغیانہ روش تھی جس کا کام روایت کو بے دخل کرنا تھا۔ جبکہ وہ سچائیوں اور حقیقتوں کے ادراک اور ان کی اصلاح کی طرف مائل ہوگئی اسی لیے ردتشکیل نے ساختیات کے خلاف آواز اٹھائی۔ ردتشکیل کے اسی رویے کی وجہ سے اسے پس ساختیاتی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ساخت کو اس کے پہلے سے پہنائے گئے معانی میں قبول نہیں کرتی۔ لفظ کی ساخت یا معنی سے ردتشکیل کو غرض نہیں بلکہ ردتشکیل تو معنی کی رد وحدت کا نام ہے۔ ردتشکیل نے تمام دبستانوں اور فکر کے دھاروں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی بنیادوں کا نئے سرے سے جائزہ لیں۔

حوالہ جات

۱۔ گوپی چند نارنگ، ساختیات اور پس ساختیات اور مشرقی شعریات، دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو، بار سوم ۲۰۰۴ء، ص ۳۸۰

۲۔ قمر جمیل، جدید ادب کی سرحدیں، جلد دوم، کراچی، مکتبہ دریافت، ۲۰۰۰ء، ص ۲۵

۳۔ سہیل بخاری، تشریحی لسانیات، ص ۶۱، ۶۲

۴۔ گوپی چند نارنگ، ساختیات پس ساختیار اور مشرقی شعریات، ص ۱۶۳

۵۔ ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ص ۱۹۵

۶۔ قمر جمیل، جدید ادب کی سرحدیں، جلد دوم، ص ۱۶۳، ۱۶۴

7- Wikipedia, Julia kristeva

۸۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ساختیات پس ساختیات مشرقی شعریات، ص ۲۰۱

۹۔ قمر جمیل، جدید ادب کی سرحدیں، جلد دوم، کراچی، مکتبہ دریافت، ۲۰۰۰ء، ص ۷۶

۱۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور جدید اردو تنقید، کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۵

۱۱۔ گوپی چند نارنگ، ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ص ۲۰۷

۱۲۔ انٹرویو ڈاکٹر تبسّم کاشمیری از ریاض ہانس، سہ ماہی ادب عالیہ انٹرنیشنل جنوری فروری مارچ ۲۰۰۵ء جلد ۵، شمارہ ۱، ص ۱۷

۱۳۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، جہات، ص ۹۴، ۹۵

۱۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور جدید اردو تنقید، ص ۱۰۸

اسلوبیات۔اسلوب کا لسانی مطالعہ

اسلوبیات کا تصور اسلوب سے آیا ہے۔اسلوب سے مراد طرزِ بیان، انداز، اسٹائل، اظہار بیان کا طریقہ، طرزِ تحریر، رنگ، طرزِ سخن، لہجہ وغیرہ کے ہیں۔

لفظ اسلوب انگریزی کے اسٹائل سے مترادف ہے، یونانی میں اسٹلائیلاز (Stylos) اور لاطینی میں اسٹائیلس (Stylus) اسلوب کا ہم معنی ہے اور ہندی میں شیلی کہتے ہیں۔(۱) اسلوب میں ہم کسی شاعر کے اندازِ بیان اور اس کی زبان و بیان کی بنیادی خصوصیات سے بحث کرتے ہیں۔یا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مختلف شاعروں کے ہاں زبان و بیان کو کس طرح استعمال کیا گیا ہے۔یا مختلف ادوار میں کس قسم کی زبان اور لہجہ مروج رہا ہے۔یا مختلف اصناف اور ہیئتوں میں کس طرح کا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔سید عابد علی عابد اپنی کتاب ''اسلوب'' میں لکھتے ہیں:

''اسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقۂ ادائے مطلب یا خیالات وجذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت (انفرادی خصوصیات) کے شمول سے وجود میں آتا ہے۔اور چونکہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتادِ طبع، فلسفہ حیات اور طرزِ فکر و احساس جیسے عوامل مل جل کر حصہ لیتے

ہیں۔اس لیے اسلوب کو مصنّف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے۔"(۲)

اس سلسلے میں ڈاکٹر بفن کی اس رائے کو بہت شہرت حاصل ہوئی جو انھوں نے ۱۷۵۰ء میں فرنچ اکیڈمی کے افتتاحی اجلاس میں پیش کی تھی۔جس کے معنی تھے۔۔"اسلوب خود انسان ہے" یہی تعریف انگریزی میں یوں مستعمل ہے" Style is the man himself"(۳)

اسلوب کا تعلّق جدت اور انفرادیت سے ہے۔جدت اور انفرادیت ہی کسی ادیب کو دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے اور اسے ایک الگ صاحبِ اسلوب ادیب کی حیثیت سے متعارف کراتی ہے۔

"فلابیر نے لکھا ہے اسلوب صرف لکھنے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ جینے، زندہ رہنے اور اپنے وجود کو ثابت کرنے کا نام ہے۔اسلوب اپنے وقت کی عام زبان سے ضرور تعلّق رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود ایک مخصوص اسلوب کی زبان اپنے زمانے کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔اس کا مخصوص لب ولہجہ، ایک مخصوص انداز، ایک مخصوص آہنگ اور اپنی ایک مخصوص آواز رکھتا ہے جو اپنے زمانے سے تعلّق رکھنے کے باوجود اچھوتی اور نئی ہوتی ہے۔"(۴)

اسلوب انفرادی بھی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی۔مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ لکھنؤ کا دبستان شاعری میں رعایتِ لفظی اور خارجیت وغیرہ کو زیادہ دخل تھا تو اس وقت ہمارا اشارہ ایک مخصوص عہد اور خاص جگہ کے اس اجتماعی اسلوب کی طرف ہوتا ہے جس کی جوت کم وبیش اس عہد کے چھوٹے بڑے بہت سے شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ایسے مواقع پر یعنی جب ہم اجتماعی اسلوب کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اسلوب کا مطالعہ یا تو جماعتی نفسیات یعنی گروپ سائکالوجی کے تحت کیا جاتا ہے یا سماجیات اور علم الانسان کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔اس کے برعکس جب ہم اسلوب کا لفظ کسی فنکار یا شاعر کے انفرادی طرزِ کلام کی نشان دہی کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ہمارا مقصد اس کو اپنے معاصر شعراء سے ممتاز کرنا یا اس کی انفرادیت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے تو اس وقت ہماری توجہ لازمی طور پر اس شاعر یا فنکار کی شخصیت اور زندگی کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔(۵)

اسلوب، اظہار کی پرت اور معنیات پر مشتمل ہوتا ہے۔اظہار میں شخصیت اور اس کا انداز آجاتا ہے جبکہ معنیات لفظ میں چھپے معانی کی تہوں، استعاراتی نظام اور علامت واساطیر سے بحث کرتی ہے۔

مجھ کو ڈھونڈو مرے خوابوں کے خرابوں میں کہیں
میرے اسلوب سے اندازہ لگاؤ میرا

اسلوب کے حوالے سے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

درد لفظوں میں اتر آیا ہے
مرا اسلوب الگ ہے سب سے

منفرد ہے مرا اندازِ بیاں
میری پہچان مرے لفظ سے ہے

اسلوبیات میں شاعری کو الفاظ اور الفاظ کے ساتھ اصوات اور ان کی ادائیگی کے حوالے سے پرکھا جاتا ہے۔ لسانیات کے تناظر میں اسلوب کا مطالعہ اسلوبیات کہلاتا ہے۔

لسانیات میں فرڈی نینڈی ساسر (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۳ء) کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ جرمنی میں وہ ایک فرنچ گھرانے میں پیدا ہوا۔ جس نے زبان کو لسانی اشاروں اور نشانات کی مدد سے سمجھنے اور مطالعہ کرنے کا کام کیا۔ ساسر کے بعد ان کے شاگردوں نے اس لسانی کام کو آگے بڑھایا۔ ساسر جنیوا یونیورسٹی سے تعلّق رکھتا تھا۔ جنیوا اسکول اور اسلوبیات کے بارے میں گیان چند لکھتے ہیں:

"جنیوا اسکول کے سلسلے میں ساسور کے بعد اس کے دو شاگردوں چارلس بیلی اور سکے ہیے (Sechaye) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ چارلس بیلی اسلوبیات کا ماہر ہے اور سکے ہیے نے نحوی مطالعے میں لسانیات اور نفسیات کے تعلّق کی کھوج کی۔ ساسور کی اہمیت عصری مطالعے کے آغاز سے ہے لیکن اب جنیوا اسکول اسلوبیات کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔"(۶)

روسی ہیئت پسندوں میں وکٹر شکلووسکی بورس توماشی وسکی اور ایچن بام (eichen baum) نے لنگوسٹک سرکل بنا کر لسانی اور ہیئتی مطالعات کو رواج دیا۔ ہمارے یہاں آرزو لکھنوی نے بھی انھیں دنوں رسالہ میزان الحروف لکھ کر اصوات اور علم عروض کے باہمی تعلّق پر بات کی۔ کہ کس موقع پر کتنی اور کس قسم کی آواز درکار ہوگی۔

روسی اسلوبی (لسانیاتی) ماہرین اور ان کے مرکباتی شاگردوں نے ایسے ہمہ گیر اصول دریافت کرنے پر کام کیا ہے جو زبان کے ادبی استعمال سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اسلوبی بیان کی ترکیب سے وہ شاعری کے تخیلاتی پیکروں تک کارفرما نظر آتے ہیں۔(۷)

روسی ہیئت پسندوں میں رومن جیکب سن کا نام اسلوبیات کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ جیکب سن نے کہیں اسلوبیات کی اصطلاح تو استعمال نہیں کی مگر اسلوب کے حوالے سے ابتدائی نظریات وخیالات اسی کے ہاں نظر آتے ہیں۔ جہاں تک اسلوبیات کا تعلق ہے تو ہم رومن جیکب سن کو اس کا بانی قرار دے سکتے ہیں۔ رومن جیکب سن کے اسلوبیات پر گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ رومن جیکسن کے ساتھ فرانسیسی مہر لسانیات چارلس بیلی کا نام بھی اس حوالے سے اہم ہے مگر اس نے شعروادب کے حوالے سے بات نہیں کی جب کہ رومن جیکب سن نے اسلوبیات کا تعلق شعروادب کے ساتھ جوڑا ہے۔ ریاض صدیقی لکھتے ہیں:

''اسلوبیات چونکہ بیانات کی ترتیب بندی کر سکتی ہے اور ادب وغیر ادب میں خط امتیاز کھینچ سکتی ہے اس لیے شعروادب اور فن کی ایک آفاقی تعریف کا تعین کیا جا سکتا ہے۔''(۸)

مختلف علوم کو لسانیات کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کا رواج ہوا تو اسلوب کا تعلق بھی لسانیات سے جوڑا گیا۔ سحر انصاری لکھتے ہیں:

''لسانیات کی کئی شاخیں ہیں اور ان میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اسلوبیات توضیحی لسانیات کی ایک شاخ ہے جو لسانیات کی دوسری شاخوں مثلاً صوتیات (فونیٹکس) فہمیات (semantics) اور صرفیات ونحویات سے بھی مدد لیتی ہے۔''(۹)

شاعری یا نثر میں استعارے، تشبیہہ، مجاز، کنایہ، محاورہ، روزمرہ، ضرب الامثال غرض کئی چیزیں ہوتی ہیں جو مل کر کسی ادیب کے اسلوب کی تشکیل کرتی ہیں۔ فن پارے میں اس کے عناصر ترتیبی میں مختلف باہمی رشتے مختلف اسالیب کا سبب بنتے ہیں۔ شاعری میں مصرعوں کا باہم ملاپ جمالیاتی اور صوتی پیکروں کو جنم دیتا ہے۔ شاعری کو جذباتی رنگ میں جذبات اور پیغام کی ترسیل کا نام ہے۔

شاعری ہم عصری اور اجتماعی (تاریخی) صفات الفاظ اور زبان کو جمالیاتی پیکروں میں ڈھال دیتی ہے۔ یہ کاوش اصوات، بحور، ردم وغیرہ میں بنیادی رشتوں کی بنت سے زبان کو گھمبیرتا بخشتی ہے اور اسے اس کی اسلوبی خوبیوں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔(۱۰) اسلوبی خوبیاں صوتی اتار چڑھاؤ، سُر اور لہجے کے ذریعے زبان میں ایک نیا پن اور کشش پیدا کر کے اسے دوسروں کے انداز اور طرز تکلم سے جدا پہچان عطا کرتی ہے۔

چونکہ متن مختلف سطحوں میں پڑھا جا سکتا ہے ایک نقاد الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ یہ اسلوبی

تنقید کی صورت میں سامنے آتی ہے یعنی ساختی لسانیات کے اصولوں کا انطباق لسانیاتی اور موضوعاتی اہمیت کی مرکباتی شکل ہے۔ ہر متن کے سلسلے میں سیاق وسباق کے سانچے مختلف ہو جاتے ہیں۔(۱۱) پڑھنے والے انھیں اپنے سیاق وسباق کے حوالے سے پڑھتے ہیں۔ اسلوب بعض اوقات معنیات سے الگ جہان تخلیق کر کے قاری کو ایک نئی دنیا کی سیر کراتا ہے۔

''معانی سے آگے حسن کی تخلیق اسلوبیات کا اصل مقصود ہوتا ہے۔ باوجود اس امر کے، لسانیات اور اسلوبیات کا ایک مضبوط رشتہ ہے اور ماہرین لسانیات نے اسلوبیات کو ایک سائنس قرار دیا ہے اور سماجی تناظر میں اسلوبیات کو وضاحتی لسانیات کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔ جو ادبی اظہار کے جملہ عناصر ترکیبی کا معروضی طور پر جائزہ لیتی ہے۔۔۔ اسلوبیات کا تعلق لسانیاتی جمال سے ہے۔''(۱۲)

اسلوب کا سائنسی یا لسانی مطالعہ ہمیں ایک نئے انداز سے کسی متن میں پائے جانے والے الفاظ وتراکیب اور ان کی بندش کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سہیل عباس:

''جب ہم کسی فن پارے کا لسانی مطالعہ کریں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کی بُنت کیا ہے؟ اس میں کتنے دھاگے ہیں اور کن کن رنگوں کے ہیں؟ لفظ کیا ہے اور لفظ ومعانی میں کیا رشتہ ہے؟ متن کے اصلی محاسن کیا ہیں۔''(۱۳)

زبان کو نئے انداز سے استعمال کرنا، نئے نئے خیالات کو سامنے لانا انسان کو دوسروں سے الگ اور منفرد بناتا ہے۔ زبان، خیال اور اسلوب کسی بھی انسان کو مخصوص شناخت عطا کرتے ہیں۔ اپنے عام مفہوم میں اسلوبیات کو زبان کی اُن خاص اقسام کے مطالعے میں لسانیاتی تکنیکوں کے اطلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے جو ایک مروّجہ تکلمی جماعت میں رائج ہیں، جیسے علمی، مذہبی، مباحثی یا ادبی یا ایسی زبان جو مختلف سماجی طبقوں سے تعلق رکھتی ہے۔(۱۴) اگر ہم روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والی زبان پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس میں بھی یکسانیات نہیں ہوتی بلکہ نمایاں طور پر فرق پایا جاتا ہے۔ جب ہم کہیں مجمع سے خطاب کر رہے ہوتے ہیں تو ہمارا انداز مختلف ہوتا ہے اور جب دوستوں میں گفتگو کرتے ہیں تو زبان اور انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح بچوں اور بڑوں سے گفتگو کرتے ہوئے بھی ہماری زبان میں واضح تفریق موجود ہوتی ہے۔ زبان سماجی صورتِ حال کے مطابقت سے مختلف مواقع پر مختلف انداز اختیار کرتی رہتی ہے۔

اس کا انحصار سماجی صورتِ حال پر ہوتا ہے۔ جب ہم کسی مذہبی رہنما سے بولتے ہیں تو ہمارا اسلوب اور ہوتا ہے، جب کسی دکاندار سے گفتگو کرتے ہیں تو ایک الگ انداز میں زبان کو استعمال کرتے ہیں۔

اسلوبیات میں یہ مطالعہ کیا جاتا ہے کہ زبان یا تحریر کی کونسی قسم کس موقع کے لیے مناسب ہے۔ یہ علم ہمارے اندر صلاحیت پیدا کرتا ہے اور ان تبدیلیوں پر قابو پاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی خاص تکنیکی گفتگو نہ ہونے کے باوجود بھی ہم لوگوں کی باتوں کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتے یا ہم کسی شخص کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے میں دھوکا کھا جاتے ہیں کیونکہ اس کے استدلال کے طریقے سے ہم زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں یا کسی خاص موقع نا قابلِ استعمال لفظ یا فقرہ بول کر ایک طرح سے ہم لسانیاتی پتھر کھینچ مارتے ہیں۔[15] بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ متکلّم جو سمجھانا چاہتا ہے وہ لفظوں کے بجائے اپنے لہجے اور انداز سے سمجھا جاتا ہے۔ اور ہم اس کی بات کو ہمیشہ اسی انداز میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، جو انداز اس نے اپنا لیا ہوتا ہے۔

شعری زبان گرامر کے مروّجہ اصولوں سے انحراف کرتی ہے چنانچہ بعض شعروں اور نظموں الفاظ وتراکیب یا بعض عبارتوں کا بار بار استعمال ہوتا ہے جو نثر میں از روئے گرامر جائز نہیں ہیں۔ جب کہ شاعری میں یہی عمل حسن و آہنگ اور اثر پذیری میں اضافہ کرتا ہے اور اسلوب کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔[16] طارق سعید لکھتے ہیں:

> ''اسلوبیات کسی نہ کسی طرح لسانیات کے تابع ہوتی ہے کیونکہ قواعد اور قاعدوں کے حوالے کے بغیر اسلوب کی واضح تعریف ممکن نہیں لیکن جہاں قواعدی تجزیے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ (زبان کے بیوہار کے بارے میں) پیشین گوئیاں ممکن ہوسکیں اسلوبیاتی تجزیے کا مقصد پہلے تو طبقہ بندی (Classification) ہے پھر کچھ اور۔''[17]

شعری عمل ادب میں اسلوب سازی کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔ جسے زبان کے تصور کی مدد سے جانا جاتا ہے۔ شعری پیغام سے قارئین کی دلچسپی اصل میں ادبیت اور اسلوب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ادبیت اور اسلوب ہی کسی فن پارے کی طرف قارئین کی توجہ کو مبذول کراتے ہیں۔

اسلوبیات دراصل لسانیات ہی کی ایک شاخ ہے۔ رومن جیکب سن اپنے لسانیاتی تجزیے میں نہ صرف اظہار بیان کے طریقوں بلکہ ابلاغ کی ممکنہ صورتوں کو بھی کھوجنے کی کوشش کرتے ہیں معروف ماہرِ اسلوبیات بیلی کے خیال میں بہت سے جذبات واحساسات وہ ہیں جنھیں

تخلیق کار بیان نہیں کر پاتے کیونکہ ان کے بیان کے لیے الفاظ موجود نہیں۔ شاعر انھیں احساسات اور جذبات کو شعری قالب عطا کر پاتے ہیں جن کے لیے ان کے پاس ذخیرۂ الفاظ موجود ہوتا ہے۔ جبکہ رومن جیکب سن اس کے برخلاف کہتا ہے کہ پیغام اپنی تشریح اپنے لسانی اجزائے ترکیبی کے ذریعے کرتا ہے۔ نہ کہ شاعر یا سننے والے سے حوالے سے، اسی طرح کسی پیغام کی لفظیات اس کی ساختیاتی ترکیب اور وقوعی تناظر کے مثلث کو اہمیت حاصل ہے اور یہی ایک طریقہ ہے جس کی مدد سے ہم ایک عہد کے شعر او ادب کا دوسرے عہد میں صحیح مطالعہ کر سکتے ہیں۔ رومن جیکب سن کے نزدیک نہ صرف ایک پیغام کا اسلوب ٹھوس اور قابل مشاہدہ ہوتا ہے جو کہ حقیقت پسندوں کا نقطۂ نظر ہے بلکہ اسلوب کا مطالعہ زبان میں پائے جانے والے دائم و قائم اصولوں کے ذریعے کیا جانا بھی ضروری ہے۔۔ کسی پیغام میں اسلوب آفرینی کوئی مشینی عمل نہیں ہے۔(۱۸)

اسلوبیات کیا ہے، اس کا طریقِ کار اور میدان کتنا وسیع ہے اس کے ذریعے متن سے کیا کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

''ادبی اسلوبیات کسی بھی لکھنے والے کے اسلوب کی امتیازی خصوصیت کا تجزیہ کرنے اور ان کا تعین کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ادب کے جملہ متون اپنی انفرادی اور اسلوبیاتی خصوصیات کی بنا پر الگ الگ پہچانے جا سکتے ہیں کیونکہ یہ خصوصیات مظہر ہوتی ہیں کسی بھی شاعر یا ادیب کی انفرادی تخلیقی شخصیت کا۔ تخلیقیت لامحدود ہے۔ اسلوبیات تخلیقیت کے اسی تنوع کو پرکھنے کی کوشش کرتی ہے۔''(۱۹)

جب ہم اسلوبیات کی بات کرتے ہیں تو پھر ہم اس تصور اسلوب سے مختلف راستہ اختیار کرتے ہیں جو کہ ہمارے ہاں مشرقی ادب میں آج تک رائج رہا ہے۔ کیونکہ اسلوبیات تو متن کے سائنسی مطالعے کا نام ہے۔ اسلوب میں فن پارے کے ادنیٰ و اعلیٰ ہونے کی بات کی جاتی ہے مگر اسلوبیات میں یہ بحث خارج از امکان قرار دی جاتی ہے کہ ادب پارہ ادنیٰ ہے یا اعلیٰ۔ کیونکہ یہ ذمہ داری اسلوبیات کی نہیں ہے۔ اسلوبیات میں ادب اور الفاظ کا سائنسی مطالعہ اسے عام قاری سے دور لے جاتا ہے کیونکہ یہاں یہ اسلوبیات ایک سائنس کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو کہ ادب کے قاری کے لیے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ اسلوبیات مصوت اور مصمت آوازوں، لفظیات، جملوں کی بناوٹ اور ساخت اور جملوں کے اجزائے ترکیبی کو زیر بحث لاتا ہے۔ ادب میں تصور اسلوبیات دوسرے رویوں سے کس

طرح مختلف ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''دوسرے رویوں سے یہ مختلف اس لیے ہے کہ اس کا اپنا معروضی طریقہ ہے جو کسی بھی متن یا ادیب یا شاعر کا تجزیہ اس لحاظ سے کرتا ہے کہ اس کی امتیازی تخلیقی شناخت ممکن ہو سکے۔ بالکل جس طرح کوئی انسان اپنی انگلیوں کے نشان سے پہچانا جاسکتا ہے۔اسی طرح کوئی بھی فنکار اپنے فن میں زبان کی تخلیقیت سے پہچانا جاسکتا ہے۔لیکن اسلوبیات کو ہر مرض کی دوا سمجھنا بھی غلط ہے۔اسلوبیات ادبی تنقید کے ہاتھ میں ایک حربہ ہے۔یہ کُل ادبی تنقید نہیں۔لیکن ادبی قدر کے تعین کا کوئی دعویٰ نہیں کرتی ۔ادبی قدر کا کوئی بھی تصور کسی بھی دور میں موضوعیت سے خالی نہیں رہا جبکہ اسلوبیات اول و آخر معروضی ہے۔۔۔اگر معروضی اصول سائنسی اصول ہیں تو پھر اسلوبیات ادب کی تنقید و تحسین کے لیے سائنسی بنیاد اسی لیے فراہم کرتی ہے کہ اس کے یہاں مادر پدر آزاد رائے زنی کی گنجائش نہیں۔''(۲۰)

زبان میں متن اور اسلوبیات کا گہرا تعلق ہے۔متن کی تفہیم تخلیق کار کے اسلوب کی مدد سے زیادہ آسانی کے ساتھ ممکن ہے۔پال سمپسن (Paul Simpson) زبان،متن اور اسلوبیات کے آپس میں تعلّق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

The reason why language is so important to stylisticians is because the various forms, patterns and levels that contitute linguistic structure are an important index of the function of the text.(21)

اسلوبیاتی مطالعہ دراصل متن کے مطالعہ تک محدود رہتا ہے۔اس سے آگے بڑھ کر کوئی بات دریافت نہیں کی جاتی ۔اسلوبیات کے حوالے سے شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''اسلوبیاتی مطالعہ کسی فن پارے کا بہت محدود اور یک رخا مطالعہ ہے جو تخلیق کے صرف ایک رخ کو روشن کرتا ہے۔وہ مجموعی حیثیت سے فن پارے کی قدروں سے بحث نہیں کرتا۔''(۲۲)

اسلوبیاتی تجزیے میں ان لسانی امتیازات کو نشان زد کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے کسی فن پارے، مصنّف، ہیئت، صنف یا عہد کی شناخت ممکن ہو۔یہ امتیازات کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔(i) صوتیاتی (آوازوں کے نظام سے جو امتیازات قائم ہوتے ہیں۔ردیف وقوافی کی خصوصیات یا معکوسیت، ہکاریت یا غنیمت کے امتیازات یا مصمتوں اور مصوتوں کا تناسب وغیرہ(ii) (لفظیاتی) (خاص نوع

کے الفاظ کا اضافی تواتر، اسما، اسمائے صفت، افعال وغیرہ کا تواتر اور تناسب، تراکیب وغیرہ، (iii) نحویاتی (کلمے کی اقسام میں سے کسی کا خصوصی استعمال، کلمے میں لفظوں کا دروبست، (iv) بدیعی (بدیع وبیان کی امتیازی شکلیں، تشبیہہ، استعارہ، کنایہ، تمثیل، علامت امیجری وغیرہ۔ (v) عروضی امتیازات (اوزان، بحروں، زحافات، وغیرہ کا خصوصی استعمال اور امتیازات)۔[۲۳]

اردو کے صوتی نظام میں ہائیہ اور معکوسی آوازوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ان کے بغیر اردو زبان کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا یہ اردو صوتیات اور اردو زبان کا جزِ لاینفک ہیں۔ہائیہ اور معکوسی آوازیں بھی اردو کے صوتیے ہیں۔اور ان کی حیثیت مصمتوں (Consonants) کی ہے۔

اردو کے ۳۸ مصمتوں میں سے ۱۱ ہائیہ آوازیں (Aspirates) ہیں۔مثلاً پھ، بھ، تھ، دھ، ٹھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ اور ڑھ۔ان کے علاوہ بھی اردو میں چار ہائیہ آوازیں مستعمل ہیں جو یہ ہیں: مھ (تمھارا)، نھ (ننھّا)، لھ (دولھا)، رھ (سرھانا)۔اردو کے صوتیاتی نظام میں معکوسی آوازوں (Retoflex Sounds) یا معکوسی صوتیوں کا بھی اپنا ایک مقام ہے۔ان سے اردو زبان کا ایک خاص صوتی آہنگ تشکیل پاتا ہے۔جو اردو کے صوتی مزاج کا ایک اہم حصہ ہے۔اردو کی معکوسی آوازیں چھے ہیں جن میں تین غیر ہائیہ معکوسی آوازیں مثلاً ٹ، ڈ، ڑ اور تین ہائیہ معکوسی آوازیں مثلاً ٹھ، ڈھ، ڑھ ہیں۔اگر ان آوازوں کو اردو سے خارج کر دیا جائے تو یہ زبان توتلی ہو کر رہ جائے گی۔[۲۴]

ادبی اسلوبیات کسی تخلیق کار اسلوبیاتی خصائص کا تجزیہ کرتی ہے اور اُن امتیازات کا تعین کرتی ہے جو اسے دوسروں سے الگ کرتے ہیں اور جن کی بنا پر ادبی متون اپنی منفرد حیثیت کی وجہ سے اپنی الگ الگ پہچان رکھتے ہیں۔انھیں سے کسی تخلیق کار کی تخلیقی سمت اور انفرادیت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔اور انھیں کی مدد سے مختلف تخلیقی رنگوں کو پرکھا جاسکتا ہے۔

کسی بھی زبان کے صوتیاتی نظام میں مصوتوں کی تبدیل سے آوازیں تبدیل ہو جاتی ہیں اور الفاظ و معانی بھی۔جیسے اردو کے دو صوتیے پ اور ب۔یعنی پانی اور بانی دو ممیّز آوازیں ہیں۔

اسلوبیات کے حوالے سے کام کرنے والوں میں روسی ہیئت پسندوں کے ساتھ ساتھ جرمن، فرانسیسی، برطانوی اور امریکی ماہرین لسانیات چارلس بیلی، رومن جیکب سن، لیوسپٹزر، مائیکل رفاٹر، سٹیفن المان، رچرڈ اوہمان جیسے ماہرین لسانیات اسلوبیات کے حوالے سے کام کر چکے ہیں۔

گوپی چند نارنگ اسلوبیاتی تنقید نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔انھوں نے جہاں اسلوبیات

کے حوالے سے قلم اٹھایا ہے اور حوالے سے کتابیں لکھی ہیں وہیں انھوں نے مختلف شعرا اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا اسلوبیاتی تجزیہ بھی کیا ہے۔

اردو میں اسلوبیات کے حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بہت سا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اسلوبیات کیا ہے؟ اس کا طریقہ کار اور اس کا میدان کتنا وسیع ہے اس حوالے سے اپنی ایک کتاب ادبی تنقید اور اسلوبیات میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

گوپی چند نارنگ اسلوبیات کو بنظر تحسین دیکھتے ہیں تو اس کا سبب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اسلوبیات تنقیدی آرا کی صحت یا عدم صحت کے لیے ٹھوس تجزیاتی بنیادیں فراہم کرتی ہے مزید یہ کہ بقول نارنگ دوسرے علوم میں سے کسی کا موضوع براہ راست ادب یا ادب کا وسیلۂ اظہار یعنی زبان نہیں ہے جب کہ اسلوبیات کا موضوع ہی زبان اور اس کا تخلیقی استعمال ہے۔(۲۵)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایک مشہور نقاد اور محقق ہیں، ساختیات، جدیدیت، اور اسلوبیات کے حوالے سے بھی انھوں نے کام کیا ہے۔ لسانیات کے عملی اور نظری شعبوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ اپنی تازہ کاری کی عادت کی وجہ سے اردو ادب کے مطالعہ کے لیے نئے نئے پیرائے تلاش کر کے لاتے ہیں۔ اسلوبیات stylistics اور ساختیات structurlism کے حوالے سے انھوں نے گراں قدر کام کیا ہے۔ اسلوبیات میر، اسلوبیات انیس اور اسلوبیات اقبال جیسے مقالات میں انھوں نے میر، انیس اور اقبال کا اسلوبیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کی تحریروں کے حوالے سے اہل قلم کے ہاں ردوقبول کے مختلف رویے نظر آتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ نے اسلوب میر میں میر تقی میر کی شاعری کا جو اسلوبیاتی جائزہ لیا ہے وہ صرفی بھی ہے نحوی بھی اور صوتیاتی بھی۔ انھوں نے میر کے اسلوبی مطالعے کی روشنی میں ان کے منفرد لہجے کی شناخت کی ہے۔ شعر میں اسلوبی و معنیاتی تنوع اور تخلیقیت لفظ ہی استعمال سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میر زبان محض بول چال کی زبان نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میر کا صرفی اور نحوی ڈھانچہ عام اردو کا ہے۔ لیکن لفظوں کے سُر الگ ہیں۔ متعدد اسلوبیاتی امتیازات کے باعث میر کا لہجہ ایسی شدید انفرادیت رکھتا ہے کہ میر کا شعر پڑھتے یا سنتے ہی فوراً محسوس ہوتا ہے کہ یہ لہجہ دوسروں سے الگ ہے۔ رفتہ رفتہ میر کی آواز پورے عہد پر چھا جاتی ہے۔''(۲۶)

میر کے ہاں بڑی بحروں میں چھوٹے چھوٹے لفظی ٹکڑے الگ الگ اکائیوں کی صورت
میں خوبصورتی پیدا کرتے ہیں۔میر زبان میں اپنی دھرتی اور پراکرتوں کی خوشبو شامل کر کے فطری زبان
کو شعری زبان بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ان کی شاعری میں عروضی اور غنائی آوازیں آپس میں
باہم گندھی ہوئی ہیں۔میر کا اسلوب سادگیِ بیان، فارسی آمیز لہجے کی امتزاجیت، ہندی الفاظ کی
شیرینی، زبان کا تازہ پن، الفاظ کا زیر و بم، نغمگی، غنائیت، سے مل کر بنا ہے۔

میر شاعر بھی زور کوئی تھا
دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھنگ کا

میر صناع ہے ملو اس سے
دیکھو باتیں تو کیا بناتا ہے

میر انیس نے مسدس کی ہیئت کو جس فنکارانہ انداز میں برتا ہے اس کی وجہ سے ان کے
ہاں فصاحت پیدا ہوئی ہے۔انھوں نے اردو مرثیے جمالیاتی حسن اور ایک نیا آہنگ عطا کیا ہے۔
اسلوبیات انیس میں گوپی چند نارنگ نے انیس کی شاعری کے اسلوبیاتی جائزے میں لکھا ہے:

''انیس نے جس طرح بند کے پہلے چار مصرعوں میں قصیدے کے زور بیان اور دبدبے
اور بیتوں میں غزل کی لطافت اور نرمی کو باہم مربوط کر کے مرثیے کو جو نیا اسلوبیاتی پیکر دیا،
وہ ان کے فن سے مخصوص ہے، اور یہ جز ولاینفک ہے اُس فصاحت کا جس کے قدیم مفہوم
کو انھوں نے وسعت دی، اور جس کا اثر بعد کی شاعری پر برابر محسوس ہوتا رہا۔''(۲۷)

کسی بھی موضوع پر کسی نئے مضمون اور نئی کتاب کے منظر عام پر آنے سے نئے مباحث کا
آغاز ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید کے حوالے سے مذکورہ کتاب کی وجہ سے
بھی اسلوبیاتی تنقید کے ضمن میں نئے مباحث کو راہ ملی۔سحر انصاری لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس کتاب کے پہلے مقالے ادبی تنقید اور اسلوبیات میں مکمل
وضاحت کر دی ہے کہ وہ اسلوبیات کو کیا سمجھتے ہیں کتنا سمجھتے ہیں نیز یہ کہ اسلوبیات میں
تجزیے کی گنجائش کتنی ہے اور اس کی حدود کیا ہیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس امر کی

وضاحت کردی ہے کہ وہ ادب کا مطالعہ کرتے وقت اسلوب اور معانی کا مطالعہ الگ الگ نہیں کرتے انھوں نے اسلوبیات کو ادبی تنقید میں ضم کر کے پیش کیا ہے اور اسے جامع اسلوبیات کا نام دیا ہے۔''(۲۸)

سر سید تحریک کا منشور اور مرکزی تصور قوم کو ابھارنے اس کی اصلاح کرنے اور زوال وانحطاط کے اسباب کو سامنے لا کر مستقبل کی بہتر تعمیر کرنا تھا۔ سر سید احمد خان اور حالی نے جس اسلوب کی بنیاد رکھی اس میں سادگی، خارجی واقعہ کا بیان، تصنّع اور تکلّف سے آزاد عبارت اور اثر آفرینی وغیرہ شامل تھیں اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر کے بھی حامل بھی تھے۔ مولانا آزاد ان کے ساتھ ساتھ ثقافتی رشتوں کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا محمد حسین آزاد کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حالی اور ان کے رفقا ادب اور سیاسی وسماجی حالات کے باہمی ربط کے قائل تھے اور ادب کے افہام وتفہیم کے سلسلے میں بھی سماجی مقاصد اور حالات کو تمام تر اہمیت دینے کے حق میں تھے لیکن مولانا آزاد ان مقاصد اور حالات کی نفی کیے بغیر ادب اور ثقافت کے ربط باہم کے داعی تھے اور ان کے زاویۂ نگاہ کی تعمیر ایک وسیع ثقافتی پس منظر کے مطالعے میں ہوئی تھی۔''(۲۹)

حالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شعریت کو ایک نیا مفہوم عطا کیا اس کی قلمرو کو وسعت دی۔ شعر کو سماجی اور اخلاقی تصورات کے تناظر میں دیکھا۔ اسلوبیات پر بات کرنے کے لیے ناقد کا لسانی حوالے سے مطالعہ ضروری ہے۔ اسلوب بننے کے مختلف مراحل اور تنقید کے حوالے سے بات کرتے ہوئے مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''ناقدِ شعر کے لیے دو قسم کی صلاحیتوں سے متّصف ہونا ضروری ہے ایک طرف اس کا زبان کی تشکیل اور اس کے شاعرانہ استعمال سے باخبر ہونا یعنی وہ علم زبان کی ان تمام سطحات کا علم رکھتا ہو جو صوتیات، فونیمیات اور صرف ونحو سے ہوتی ہوئی معنیات اور اسلوبیات پر ختم ہوتی ہیں۔۔۔ وہ الفاظ اور معنی کے باہمی رشتے کا علم رکھتا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر وہ انحرافات وانتخاباتِ لسانی سے واقف ہو جو شعری اظہار کے لیے شاعر وجود میں لاتا ہے اور جس سے اس کا مخصوص اسلوب بنتا ہے۔''(۳۰)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے خیال میں اقبال کی اسلوبیاتی اہمیت اور اسلوبیاتی فعلیت

دونوں کو مختلف اشعار میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ تخاطب کا انداز بھی شعر اقبال کی ایک اسلوبیاتی جہت ہے۔ اقبال کی اس خطاب کی خواہش کے بارے میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"یہ خواہش مقصود بالذات نہیں بلکہ ذریعہ ہے دوسرے معنیاتی مقاصد کو پانے کا یعنی عام انسانی بیدار اور تشکیل فکرِ اسلامیہ کا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اقبال زمینی اور آسمانی، جسمانی اور روحانی کئی سطحوں پر خطاب کرتے ہیں اور تخاطب کا انداز ان کی مرکزی اسلوبیاتی خصوصیت کے طور پر اُبھرتا ہے۔"(۳۱)

اقبال کی ابتدائی زندگی میں مناظر فطرت سے ہمکلامی کی خواہش بھی پائی جاتی ہے۔ وہ تخاطب کے ذریعے سوال اٹھاتے ہیں اور پھر ان کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا اسلوبیاتی جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اقبال کا غالب سے تقابل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غالب اور اقبال میں یہ خصوصیت مشترک ہے اقبال کے رموز وعلائم میں بڑی تعداد ایسے الفاظ کی ہے جن میں صفیری اور مسلسل آوازیں نمایاں طور پر استعمال ہوئی ہیں، یا پھر ایسی آوازیں آئی ہیں جو منھ کے اگلے حصوں سے ادا ہوتی ہیں:

شاہین، مشرق، شمع وشاعر، شعاع، روشنی، شفق، شعلہ، فقر، فرشتے، فرمان، فقیہہ، خودی وخدا، عقل وعشق، ارض وسما، ذوق وشوق، زمان ومکاں، سوز وساز، درد وداغ،۔۔۔ وغیرہ

اس خصوصیت کی توثیق ان لفظوں سے بھی ہوتی ہے جہاں اقبال کئی لفظوں کے معنی سیٹ مین ایک کا انتخاب کرتے ہیں، مثلاً وہ شہباز اور عقاب پر شاہین کو ترجیح دیتے ہیں یا جنت، بہشت اور فردوس میں فردوس کا زیادہ استعمال کرتے ہیں، یا شمس، خورشید اور آفتاب میں سے وہ زیادہ آفتاب کے حق میں ہیں۔ (اگرچہ اس انتخاب میں طویل مصوتوں اور غنائی مصوتوں کا بھی ہاتھ ہے)"(۳۲)

فیض احمد فیض ترقی پسند شاعر تھے۔ ان کے ہاں موضوعات دوسرے ترقی پسندوں کی طرح ہیں اور سوچ بھی ترقی پسند ہے مگر وہ دوسرے ترقی پسندوں کی نسبت زیادہ اہم اور ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ ان میں ایسی کون سی بات ہے جو کہ وہ دوسروں سے شاعری کے میدان میں سبقت لے گئے۔ اس کے بارے میں گوپی چند نارنگ ان کے اسلوبیاتی خصائص پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کسی بھی شاعر کا معنیاتی نظام کوئی مجرد وجود نہیں رکھتا۔ یہ اپنے اظہار کے لیے زبان کا محتاج ہوتا ہے۔۔ ہر بڑا شاعر اس معنی میں نئی زبان خلق کرتا ہے، کہ خواہ نئے لفظ بڑی تعداد میں ایجاد نہ کرے، اور تمام اظہاری سانچے کلاسیکی روایت سے مستعار لے تاہم اگر وہ ان کو ایک نئی لذت اور کیفیت سے سرشار کر دیتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں وہ ان میں نئی معنیاتی شان پیدا کر دیتا ہے تو اس کا اُسلوبیاتی امتیاز ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلوبیاتی امتیاز ثابت ہے تو معنیاتی امتیاز بھی لازم ہے کیونکہ اسلوب مجرد ہیئت نہیں۔''(۳۳)

فیض نے لفظیات تو پرانی ہی استعمال کی ہیں مگر ان کو معانی نئے دیے ہیں یعنی انھوں نے ایک نیا معنیاتی نظام ترتیب دیا ہے جو بڑی حد تک ان کا اپنا ہے۔ ان کی پرتاثیر امیجری، تازہ کار احساس، نیا استعاراتی نظام، اور نئے اظہاری پیرائے اور تجربے ان کے اسلوبیاتی جہان کی جان ہیں۔

گوپی چند نارنگ نے مختلف افسانہ نگاروں کے افسانوں کا اسلوبیاتی جائزہ لیا ہے وہ بیدی کے اسلوب کو استعاراتی اور کنایاتی قرار دیتے ہیں۔ وہ منٹو کے اسلوب کو اونچ نیچ سے پاک پریم چند کے ٹھیٹھ اسلوب کا ایک بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں۔ سریندر پرکاش کو ایک ایسا افسانہ نگار قرار دیتے ہیں جو اظہاری وسیلوں شعور اور تحت الشعور کی کیفیات کے ساتھ ملاتے ہوئے اپنے لفظی پیکر تراشتے ہیں۔

انتظار حسین نے اردو افسانے کو داستان کا اسلوب عطا کیا۔ انھوں نے پہلی بار اردو افسانے میں داستانی اسلوب اختیار کرتے ہوئے تاریخ اور حقائق کو افسانوی سانچے میں ڈھالا ہے اور تخلیق کو ایک نئی سطح عطا کی ہے۔ گوپی چند نارنگ انتظار حسین کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انتظار حسین کا تمثیلی اسلوب مکالماتی بُنت اور معاشرتی فضا سازی ایسی زبردست انفرادیت لیے ہوئے ہے کہ انھیں نہ کسی کا مقلّد کہا جا سکتا ہے نہ کسی سے متاثر۔''(۳۴)

فراق گورکھپوری اپنے دور کے ایک اہم شاعر ہیں جو اپنے عہد کی توانا ادبی تحریکوں سے بھی منسلک رہے اور جنھوں نے ادب کے حوالے سے کئی ادوار کو دیکھا ہی نہیں خود بھی اس کا جاندار حصہ رہے نہ صرف حصہ رہے بلکہ وہ اپنی الگ شناخت اور اسلوب بنانے میں بھی کامیاب ہوئے۔ مولا بخش اسلوبیات فراق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''فراق کا متن بنیادی طور پر اسلوبیاتی مطالعے کا متقاضی معلوم ہوتا ہے کیونکہ فراق کو لفظ اسلوب سے حد درجہ محبّت ہے۔ ان کی تنقیدیں، ان کے مکاتیب اور انٹرویو میں زبان

وبیان اور لسانی جمال پر ان کی انتہائی مفکّرانہ رائے اکثر پڑھنے کو ملتی ہیں۔۔۔فراق کا شعری نظام دھونی، صوت اور صوتی تکرار پر تشکیل پذیر ہوا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ فراق اس رمز سے واقف تھے کہ کائنات میں آوازوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اس لیے وہ صوتی تکرار کے لیے اکثر تجنیس (Alliteration) سے کام لیتے ہیں۔کبھی افعال کو مصرعوں میں دہراتے ہیں کبھی لفظ کو دہراتے ہیں۔"(۳۵)

کئی غزلوں میں انھوں نے ردیف کو دہرایا ہے۔اسلوبیات فراق کا یہی پہلو انھیں دوسرے ہمعصر شاعروں سے الگ پہچان عطا کرتا ہے۔کیونکہ انھوں نے جو تکرارِ لفظی والا طریقہ استعمال کیا اس سے کلام میں شدت اور غنائیت کا پیدا ہونا ضروری امر تھا۔فراق کا اسلوب اور زبان دانی اور شعریت سے واقفیت انھیں ایک صاحبِ اسلوب شاعر کے طور پر متعارف کراتے ہیں۔

اردو افسانے میں اسلوبیاتی رواتیوں کے حوالے سے سجاد حیدر یلدرم (رومانوی اسلوبیاتی روایت)، پریم چند (حقیقت نگاری کی روایت)، مرزا ادیب (عام فہم اور سادہ اسلوب)، احمد ندیم قاسمی (صداقت پسند اسلوب)، ممتاز مفتی (نفسیاتی حقیقت نگاری)، عصمت چغتائی (بے باک حقیقت نگاری)، منٹو (باساختہ اور بے تکلّف اسلوب)، بیدی (علامتی اور استعاراتی)، انتظار حسین (علامتی اور داستانوی)، انور سجاد (مکالماتی اسلوب) کے بارے میں بات کرتے ہوئے افسانے میں اسلوبیات کے وسیع امکانات کے تلاش میں ڈاکٹر محمد کیومرثی لکھتے ہیں:

"جدید افسانے میں جو اسلوبیاتی روایتیں پائی جاتی ہیں، عام طور پر افسانے اور فکشن کا اسلوب ان کا روادار نہیں ہوسکتا۔دراصل اسلوب اور انداز نگارش کے تمام حسن کو اس مواد سے الگ نہیں کیا جاسکتا جسے فنکارانہ نظم وضبط عطا کرنے کے لیے زبان کو متنوع اظہار کا سلیقہ مندانہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔جدید افسانہ تجریدیت کے ذریعہ اسلوبی حسن ونکھار پیدا کرنے کی کوشش میں گامزن ہے۔"(۳۶)

افسانے میں زبان وبیان کے حوالے سے ایک ملٹی کلر اسلوبیاتی روایت کو ترویج ملی۔ سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی اور عصمت چغتائی کے افسانوں سے اس اسلوبیاتی روایت کی متعدد صورتیں ہیں اور ہر ایک کی بنیاد علاقائی زبانیں اور عوامی بولیاں ہیں۔ ہر یک صورت میں شہری لہجہ نتھرا ستھرا ہے اور اختصار اُس کی نمایاں خوبی۔مثال کے طور پر پنجابی کی آمیزش کے ساتھ جس اسلوبیاتی روایت نے

منٹواور ممتاز مفتی کے افسانوں سے ترویج پائی، اسے بعد ازاں اشفاق احمد، منشایاد، ہرچرن چاؤلہ اور احمد داؤد نے برتا۔[۳۷] اردو افسانے کے اسالیب کے حوالے سے کئی جلوے رنگ بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی اور بلونت کے ہاں اردو افسانوں میں پنجابی کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کا امتزاج بھی نظر آتا ہے۔ رشید امجد کے ہاں افسانے میں علامت اور تجریدی اسلوبیاتی روایت بنتی نظر آتی ہے۔

"رشید امجد نے سادہ بیانیہ کی گردن مروڑ کر شعر اور نثر کی حد بندیاں توڑ دینے والا ایسا ردمک تشبیہاتی اور علامتی اسلوب وضع کیا جو ستر کے دہے میں حد درجہ مقبول ہوا۔ اور رشید امجد کے زیرِ اثر یہی اسلوب منشایاد، اعجاز راہی، احمد داؤد، اور حمید شہروردی کے ابتدائی افسانوں میں اپنی پہچان کرواتا ہے۔ البتہ ۱۹۸۰ء تک آتے آتے منشایاد اور احمد داؤد کے ہاں تشبیہہ کی جگہ علامت اور تجرید کی جگہ ٹھوس واقعیت نے لے لی لیکن پنجابی لب ولہجہ کے ساتھ۔"[۳۸]

اسلوبیات اور اسلوبیاتی تنقید کے حوالے سے بھی کئی سوالات اٹھتے رہے کہ یہ دونوں ایک نہیں ہیں بلکہ ان دونوں میں فرق ہے۔ جہاں تک اسلوبیات کا مطالعہ ہے تو اس کے بارے میں بہت سی باتیں ہو چکی ہیں۔ اسلوبیات کے حوالے سے ایک بات یہ بھی کی جاتی ہے کہ چونکہ یہ صرف سائنسی یا لسانی مطالعہ ہے تو یہ ایک خشک چیز ہے۔ اس میں دلچسپی کے عناصر نہیں ہیں اور ادب صرف لفظوں کا ڈھانچہ نہیں ہے۔ بلکہ ادب میں خیال بھی ہے، جذبہ بھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلوبیات کا دائرہ صرف صوتیات، معنیات، صرفیات تک محدود ہے جب کہ اسلوبیاتی تنقید کا دائرہ ذوقِ جمال اور طرزِ احساس کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ یعنی اسلوبیاتی تنقید صوتیات، صرفیات، الفاظ وتراکیب کی تشکیلیت، لفظی کشیدہ کاری، مانوسیت اور اجنبیت، آہنگ، فن پارے کی علمی شکوہ، جذبہ وخیال کی فراوانی، انفرادی اور اجتماعی تشخّص، لطیف نکات، رموز وکنایات سب کو زیرِ بحث لاتی ہے۔

اسلوبیاتی تنقید میں شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، مولا بخش کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اسلوبیات کا مطالعہ بہت سے مضامین میں کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اسلوبیات کے حوالے سے پہلے زیادہ کام نہیں ہوا مگر جب سے اردو میں لسانیات کو فروغ ملنا شروع ہوا تب سے اسلوبیات کو بھی سامنے رکھا جانے لگا۔

حوالہ جات

۱۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۸ء، ص ۱۶۳
۲۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، لاہور، مجلس ترقی ادب، س۔ن
۳۔ مظفرّ عباس، ڈاکٹر، اردو کی زندہ داستانیں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۵۱
۴۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ادب اور ادبی قدریں، لاہور، ادارۂ ادب وتنقید، ۱۹۸۳ء، ص ۴۷
۵۔ ممتاز حسین، نقدِ حرف، کراچی، اسلوب، ۱۹۸۵ء، ص ۱۷۴
۶۔ گیان چند، ڈاکٹر، عام لسانیات، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۸۹۶، ۸۹۷
۷۔ صدیق کلیم، فکرِ سخن، لاہور، مجلس ترقی ادب، س ن، ص ۲۶۳
۸۔ ریاض صدیقی، جدید اسلوبیات، مشمولہ، امکانات، گوجرانوالہ، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۰ء، ص ۲۸
۹۔ سحر انصاری ادبی تنقید اور اسلوبیات پر ایک نظر، مشمولہ، افکار کراچی، جولائی ۱۹۹۰ء، ص ۲۵
۱۰۔ صدیق کلیم، فکرِ سخن، ص ۲۶۷
۱۱۔ ایضاً، ص ۲۷۳
۱۲۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، ص ۲۷۹
۱۳۔ سہیل عباس بلوچ، اردو اسلوب کی تشکیلِ نو، مشمولہ معیار، انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۱، شمارہ ۲ جولائی دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۶
۱۴۔ ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے، مترجمہ: ڈاکٹر نصیر احمد خاں، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۸
۱۵۔ لسانیات کیا ہے، ص ۱۲۹، ۱۳۰
۱۶۔ ریاض صدیقی، جدید اسلوبیات، ص ۳۱
۱۷۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، ص ۲۶۴
۱۸۔ ریاض صدیقی، جدید اسلوبیات، ص ۳۳، ۳۴
۱۹۔ گوپی چند نارنگ، جدیدیت کے بعد، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۵۰۶

۲۰۔ ایضاً، ص۵۰۶، ۵۰۷

21- Stylistics, by paul simpson, routledge, London, 2004, page.2

۲۲۔ شارب ردولوی، آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء، ص۱۰۰

۲۳۔ گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص۱۷

۲۴۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، اردو زبان کی تاریخ علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص۴۰۶، ۴۰۷

۲۵۔ فضیل جعفری، گوپی چند نارنگ اہم نقاد، مشمولہ ترقی پسند، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص۳۶

۲۶۔ گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص۳۳

۲۷۔ ایضاً، ص۱۳۲

۲۸۔ سحر انصاری ادبی تنقید اور اسلوبیات پر ایک نظر، مشمولہ افکار، کراچی، جولائی ۱۹۹۰ء، ص۲۶

۲۹۔ وزیر آغا، آزاد کا اسلوبِ فکر مشمولہ ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین، مرتبہ سید سجاد نقوی، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۵ء، ص۸۹

۳۰۔ مسعود حسین خاں، اقبال کی دو طویل نظموں کی باز آفرینی، مشمولہ اقبال کا فن از گوپی چند نارنگ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص۴۴

۳۱۔ اسلوبیات اقبال از گوپی چند نارنگ، مشمولہ اقبال کا فن از گوپی چند نارنگ، ص۳۳۵

۳۲۔ اسلوبیات اقبال، اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام، مشمولہ ترقی پسند، جدیدیت، مابعد جدیدیت، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۵۶

۳۳۔ فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام، مشمولہ ترقی پسند، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص۱۶۳

۳۴۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، مشمولہ ترقی پسند، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص۴۵۷

۳۵۔ مولا بخش، اسلوبیات فراق، مشمولہ فراق گورکھپوری، شاعر نقاد اور دانشور مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ۲۳۲، ۲۳۳

۳۶۔ اردو میں افسانہ نگاروں کے اسالیب۔ ایک جائزہ، مشمولہ، الماس، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور سندھ، شمارہ ۱۱، ص۶۳

۳۷۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو افسانے کے اسالیب، مشمولہ، تخلیقی ادب، شمارہ ۸، نمل یونیورسٹی اسلام آباد، ص۳۸۴

۳۸۔ ایضاً، ص۳۸۵

زبان میں املا اور تلفّظ کی اہمیت

املا ایک سادہ سا لفظ ہے مگر اس کا تعلّق براہ راست زبان اور قواعد سے ہے۔ اگر کسی زبان
میں لکھی گئی کتب یا تحریروں میں الفاظ وتراکیب اور حروف کا املا درست نہ ہوگا تو اس سے زبان میں بگاڑ
پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ لفظ کن حروف سے مل کر بنا ہے۔ لفظ میں حروف کی ترتیب کو کیسے ہونا چاہئے یہ
سب املا سے متعلّق ہے۔ املا میں صحت اور اصلاح کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔ زندہ زبانوں میں
دوسری زبانوں سے الفاظ وتراکیب شامل ہوتے رہتے ہیں اور دوسری زبانوں سے لیے گئے ان الفاظ و
تراکیب کی املا کے حوالے سے مختلف مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح لکھنے والے دانستہ وغیر
دانستہ بعض اوقات الفاظ وتراکیب کی املا تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ اس تبدیلی کی وجہ سے املا میں
اصلاح کی گنجائش پیدا ہوتی رہتی ہے۔

املا کا تعلّق لکھنے سے ہے۔ کون سا لفظ کس طرح لکھا جائے۔ اور کون سے حروف استعمال
میں لائے جائیں۔ اسی کا نام املا ہے۔[1] بقول رشید حسن خاں رسم الخط کسی زبان کو لکھنے کی معیاری صورت
کا نام ہے اور رسم خط کے مطابق، صحت سے لکھنے، کا نام املا ہے۔[2] 'املا میں اصل اصول یہ ہے کہ آپ
لفظ کو اس طرح لکھیے جس طرح آپ بولتے ہیں۔''[3] رشید حسن خان املا کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''املا دراصل، لفظوں میں صحیح حرفوں کے استعمال کا نام ہے اور جو طریقہ ان حرفوں کے لکھنے

کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، وہ ''رسم خط'' کہلاتا ہے۔''اس بات کو اختصار کے ساتھ یوں بھی کہا گیا ہے کہ املا ''لفظوں کی صحیح تصویر کھینچنا'' ہے۔''(۴)

رسم الخط کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ رسم الخط زبان کو تحریری بنیادیں اور استناد فراہم کرتا ہے۔ رسم الخط ہے تو پھر املا کے وجود کا جواز ہوگا وگرنہ نہیں۔ رسم الخط اور املا اور رسم الخط میں تعلّق کو بیان کرتے ہوئے رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''املا اور رسم خط میں وہی نسبت ہے جو مثلاً پھول اور اس کے رنگ اور خوش بو میں ہوتی ہے۔ پھول نہ ہو تو نہ رنگ کا وجود متعیّن ہو پائے گا، نہ خوش بو کو ٹھکانا ملے گا۔''(۵)

تلفّظ کے لغوی معنی ''بات کہنا، لفظ کا منہ سے ادا کرنا اور لہجہ'' کے ہیں۔(۶) زبان بولنے، پڑھنے اور لکھنے میں تلفّظ کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس حوالے سے اعراب بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اعراب کی مدد سے ہم کسی بھی لفظ کے صحیح تلفّظ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اعراب حروف پر ڈالی گئی علامات کو کہا جاتا ہے۔ ان علامات میں زبر، زیر، پیش، جزم، تنوین،، تشدید، مد، ہمزہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کے بقول:

''زبان کے ہر لفظ کو بولنے کا طریقہ جسے تلفّظ کہتے ہیں اس کی گھڑت کے ساتھ ہی وضع ہوتا ہے، یہ ایک اجتماعی عمل ہے جو افراد معاشرہ کی باہمی رضامندی سے رواج پاتا ہے۔''(۷)

فردِ واحد تلفّظ کو نہیں بدل سکتا۔۔ بقول رشید حسن خان: لسانیات میں غلط کوئی چیز نہیں ہوتی مثلاً ایک لفظ کو تین طرح سے لکھا گیا ہے یا بولا گیا ہے تو کسی کو غلط نہیں کہیں گے۔ نہ تلفّظ کو نہ اس کی املا کو کیونکہ جو چیز استعمال میں آجاتی ہے وہ غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ ہاں علمی بحثوں میں ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان تین شکلوں میں مروج صورت یہ ہے۔(۸)

زبان ایک نظام کا نام ہے جس میں آوازیں اور حروف وعلامات بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ حروف والفاظ کے ذریعے ہم متکلّم آوازوں کو بعینہٖ محفوظ کر لیتے ہیں جیسا کہ وہ زبان سے ادا کی گئی ہوں۔ تلفّظ اور زبان ایک معاشرتی سرگرمی ہے جس کا تعلّق سماج کی بنیادی اکائیوں میں کیا جا سکتا ہے۔ لکھائی ہمیشہ تلفّظ کے تابع رہتی ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

''دلپی ہی کی طرح تلفّظ بھی ایک اجتماعی عمل ہے جو افراد معاشرہ کی عام رضامندی سے رواج پاتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی معاشرے کی آوازوں اور حروف میں مکمّل آہنگی ہوتی ہے۔ اسی

طرح وہاں کی زبان کا تلفّظ اور لپی بھی باہم دگر پیوست ہوتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ حروف
آوازوں کے لیے وضع ہوئے ہیں اس لیے تلفّظ کو لپی پر تقدم حاصل ہے۔"(۹)

زبان میں املا اور تلفّظ کی یکسانیت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ زبان کی فصاحت اور بلاغت کے لیے ضروری ہے کہ الفاظ کا تلفّظ، املا یعنی لکھائی کے مطابق ہونا چاہیے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ زبانوں میں املا اور تلفّظ میں کئی جگہ اختلاف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اختلاف اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ املا کے مسائل حوالے سے زبان میں الفاظ و حروف کو درست کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ ضروری بقول وارث سرہندی:

"اصولی طور پر یہ درست ہے کہ کسی زبان کے املا اور تلفّظ میں یکسانی ہونی چاہیے۔ مگر ایسا عموماً ہوتا نہیں ہے۔ ایک زبان پر کیا موقوف ہے، بہت سے معاملات میں انسان چاہتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ زبان کے معاملے میں بھی کچھ ایسی ہی صورت سامنے آتی ہے۔ انگریزی اور عربی کا شمار دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبانوں میں ہوتا ہے ان میں بھی املا اور تلفّظ کا توافق بہ تمام وکمال موجود نہیں ہے بلکہ مقابلتاً اردو میں املا اور تلفّظ میں زیادہ مطابقت ہائی جاتی ہے۔"(۱۰)

عربی کے چند الفاظ جیسے رحمٰن، اسحٰق، اسمٰعیل، زکوٰۃ، صلوٰۃ، یٰسین، میں الف لکھائی میں نہیں آتا مگر تلفّظ میں بولا جاتا ہے۔ اردو میں ان کو الف سے لکھنا زیادہ مناسب ہے۔ جیسے رحمان، اسحاق، اسماعیل، زکات، صلات، یاسین وغیرہ لکھنا چاہئے۔(۱۱) ہر زبان کی اپنی ساخت اور ضروریات ہوتی ہیں۔ انہی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے الفاظ کا املا طے کیا جاتا ہے۔

زبان میں الفاظ کی خواندگی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ بچے کو شروع ہی سے مختلف حروف کی پہچان کرائی جاتی ہے۔ بعد میں جن سے بچہ مختلف الفاظ بنانے کی مشق کرتا ہے۔

"حروفِ تہجّی کی تصویروں کی مکمّل بے عیب اور یقینی پہچان اور ان کا درست تلفّظ وہ پہلی سیڑھی ہے جس کو پڑھنے والا اگر خود بلا تردّد پڑھ نہ پائے تو اس کا اگلی سیڑھی کی جانب سفر کرنا یا اسے سفر کرا دینا ایک ایسا کار بے خیر ہے جس کا فائدہ تو مشکوک و موہوم ہے مگر نقصان بدیہی بلکہ از بس یقینی ہے۔"(۱۲)

مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ کے صحیح تلفّظ کے لیے اعراب کی مدد لی جاتی ہے۔ رومن

رسم الخط میں اعراب کی جگہ واولز کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندی رسم الخط میں ماترائیں اعراب کی جگہ استعمال ہوتی ہیں۔ اردو میں اعراب کے لیے حروف کے بجائے زیر زبر پیش کے مختصر نشانات لگائے جاتے ہیں۔ اس کی ضرورت بھی کچھ دنوں تک رہتی ہے بعد میں جب مشق زیادہ ہو جاتی ہے تو جملے کی ساخت اور مفہوم کے لحاظ سے ہر لفظ کے اعراب خود بخود ذہن میں ابھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔(۱۳)

ایک زبان کے الفاظ کا تلفّظ دوسری زبان میں آکر بدل جاتا ہے بلکہ املا تک بدل جاتا ہے۔ زیادہ تر زبانوں کے حروف ایسے ہیں جو دیگر زبانوں میں نہیں پائے جاتے۔ جبکہ کچھ حروف مشترک ہیں اسی وجہ سے ان حروف کے تلفّظ میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ بقول سہیل بخاری

"کسی کسی زبان میں ایسی مخصوص آوازیں بھی نکل آتی ہیں جو دوسرے علاقوں میں نہیں ملتیں مثلاً انگلستان میں ت، د، وغیرہ اور یونان و ایران میں ٹ، ڈ، ڑ کی آوازیں نہیں ہیں۔ عربی میں اے، او، پ، چ، ژ، ف، ش، و، ہ وغیرہ کی آوازیں عنقا ہیں۔"(۱۴)

اردو میں حروف صحیح کی تعداد ۳۵ ہے جن میں خالص ہندی آوازیں ٹ، ڈ، ڑ کی ہیں، خالص فارسی آواز 'ژ' کی ہے۔ خالص عربی آوازیں ذ، ض، ط، ظ، ث، ص، ع، ح، ء، کی ہیں جبکہ مشترک آوازوں میں ب، پ، ت، ج، چ، خ، د، ر، ز، س، ش، ف، غ، ک، ق، ل، م، ن، و، ہ، ی شامل ہیں۔ ان اصوات و حروف میں ز، خ، ف، غ عربی اور فارسی میں مشترک ہیں۔ پ، چ، گ ہندی اور فارسی میں اور ق عربی اور ترکی میں مشترک ہے۔ باقی حروف ان تمام زبانوں میں ہیں جن سے اردو نے استفادہ کیا۔(۱۵) ہائے مخلوط کے ساتھ اردو میں مزید جو ۱۵ حروف صحیح بنتے ہیں وہ یہ ہیں:

بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ، نھ۔

نھ سے بننے والے الفاظ جنھیں، انھیں، تمھیں، کو جنہیں اور انہیں اور تمہیں لکھنا غلط ہے۔ اسی طرح ان کے تلفّظ میں بھی فرق ہوگا۔ مھ سے تمھارا ہوگا۔ تمہارا لکھنا غلط ہوگا کیونکہ یہ تُم ہارا پڑھا جائے گا۔ اسی طرح لھ سے چولھا اور دلھا۔

بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کا تلفّظ تو بڑی حد تک یکساں ہے مگر معنی ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں۔ مثلاً طاق اور تاک، سیاہ اور سیاح، آری (کاٹنے والا اوزار) اور عاری؛ کل (آنے والا دن) اور کل (پرزہ)؛ علم اور الم، ہل اور حل، عرض اور ارض، جال اور جعل، نظر اور نذر، ثمر اور سمر (موسم گرما)، نقطہ اور نکتہ، لال اور لعل، عرض اور ارض، اسیر اور اثیر، نال اور نعل، نظیر اور نذیر، ثواب اور

قلم (پین)، قلم (کاٹنا)۔ اسی طرح اکثر اوقات کچھ الفاظ کا املا اور تلفّظ دونوں غلط لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ مثلاً پروا کی جگہ پرواہ غلط ہوگا۔

بعض الفاظ میں املا اور تلفّظ دونوں میں اختلاف ہوتا ہے مگر مغالطے کا امکان رہتا ہے۔ مثلاً اسرار اور اصرار، نکل اور نقل (جعلی)، نقل (کاپی)، سحر اور سحَر، علم اور عَلَم، جُون اور جون، اثر اور عصر، فقر اور فکر، شکر اور شکّر، سما اور سماں، قرب اور کرب، وزن اور وژن وغیرہ

اسی طرح چند الفاظ اور بھی ہیں جن کا تلفّظ اور املا میں مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بَیر اور بیر، بُعد، بعد اور باد، بوجھ: وزن اور بوجھ: سمجھ، بیل: گائے کا مذکر اور بیل: پھولوں کی بیل، خَلق: مخلوق اور خُلق: اخلاق، دَور: زمانہ، دُور: فاصلہ، صَرف: خرچ اور صِرف: فقط، گرد: چاروں طرف اور گرد: غبار، مُقّرر: تعین شدی اور مُقرِر: تقریر کرنے والا، مَنّت: عہد اور مِنت: خوشامد، مَیل: گندگی اور مِیل: ملنا۔

حروف اور آواز کا باہمی تعلق ہوتا ہے اور حروف کا تلفّظ بولنے والوں کے اشتراک سے غیر دانستہ و دانستہ طور پر رواج پاتا ہے۔ ہر علاقے کی بولی اور رسم الخط اپنے تلفّظ کی امانت داری کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ اگر تلفّظ اور حروف و الفاظ کا باہمی رشتہ کمزور پڑ جائے تو زبان کی نشوونما کا عمل رک جاتا ہے۔ تحریر صوتی روایت کے بغیر استناد کھو دیتی ہے تلفّظ کی درستی زبان کے فروغ اور ترویج کا باعث ہوتی ہے اس کے برعکس اگر تلفّظ میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو یہ صورتِ حال زبان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ بقول ڈاکٹر سہیل بخاری:

> ”تلفّظ کی تبدیلی ہماری یومیہ زندگی کا کتنا ہی معمولی واقعہ کیوں نہ سمجھا جائے دنیائے صوتیات میں اس کی اہمیت ایک جاں گسل اور ہوش ربا سانحے سے کم نہیں ہے۔“ (۱۶)

اسی طرح بہت سے الفاظ اپنے املا کے برخلاف مختلف انداز سے بھی بولے جاتے ہیں۔ ایسا صرف اردو زبان ہی میں نہیں ہے بلکہ اکثر زبانوں میں ایسا پایا جاتا ہے کہ لفظ میں کچھ حروف بولتے وقت تلفّظ میں نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اقتدار حسین لکھتے ہیں:

> ”تقریباً ہر زبان میں تحریر اور تقریر میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے۔ بعض الفاظ کو لکھتے ایک طرح سے ہیں اور اس کو بولتے دوسرے طریقے سے ہیں۔ یعنی بہت سے حروف ایسے ہیں جو کسی لفظ میں تحریر میں تو آتے ہیں لیکن تلفّظ میں نہیں آتے۔ مثلاً اردو میں ”بالفرض“ یا

''فی الحال'' ایسے الفاظ ہیں جن میں الف اور ی کا استعمال تلفّظ میں نہیں ہے۔''(۱۷)

فرانسیسی لفظ مادام انگریزی میں آکر میڈم ہوگیا ہے۔ ٹیلی گراف فارسی میں تلگراف اور عربی میں تلغراف ہوگیا۔ قدیم ہندیورپی کا آتم انگریزی میں ایٹم ہوگیا۔ عربی میں ٹ کو ط اور ڈ کو ذ سے لکھا جاتا ہے۔ مثلاً اٹلی (اطالیا)، ڈائیبیز (ذیابیطس)۔(۱۸)

پاکستان کو عربی میں الباکستان لکھا جاتا ہے کیونکہ عربی میں پ نہیں ہے۔ پ کی آواز کے متبادل ب کی آواز کو لیا جاتا ہے۔

فارسی الفاظ ذ سے لکھنا غلط ہے۔ جیسے شکرگزار درست ہوگا شکر گذار نہیں، اسی طرح پزیر پارسی لفظ ہے اور اس کا املا پزیر ہے۔ پذیر غلط ہوگا۔ طائے تازی خالص عربی حرف ہے اور توتا ہندی پرند۔ اس لیے توتا ط سے لکھنا غلط ہے۔ توتا ہندی سے آیا ہے۔ اصل لفظ تعزیہ اور مصالحہ ہیں۔ انھیں تازیہ اور مسالا یا مصالا لکھنا غلط ہے۔(۱۹) رشید حسن خاں کے بقول: دلچسپ صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ ''گزارش'' (بہ معنی عرض داشت) کو زال سے لکھا جانے لگا، یعنی: گذارش۔ اور گذشتہ کو ز سے لکھنے لگے، یعنی: گزشتہ جب کہ اِن کی صحیح صورت ''گزارش'' اور ''گذشتہ'' ہے۔ اس امتیاز کو واپس لانا بھی صحتِ املا میں شامل ہے۔(۲۰)

انگریزی کے ہاسپٹل کو ہسپتال لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح اکیڈمی کو اکادمی، ٹکنیک کو تکنیک، سٹیشن کو اسٹیشن، سکیم کو اسکیم، سپیشل کو اسپشل، سٹیٹ کو اسٹیٹ، سٹرینج کو اسٹرینج، سپیس کو اسپیس، سکوائر کو اسکوائر، سٹوری کو اسٹوری، سٹور کو اسٹور، سٹبلشمنٹ کو اسٹبلشمنٹ اور سکول کو اسکول لکھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اردو زبان میں ان الفاظ کا تلفّظ بھی تبدیل ہوجاتا ہے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں الفاظ کے تلفّظ کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں جانے کے بعد یوسف کو جوزف، میکائیل کو مائیکل، یعقوب کو جیکب اور سلیمان کو سالومن لکھا جاتا ہے۔

اسی طرح اردو میں آکر بہت سے انگریزی الفاظ کا تلفّظ اور املا تبدیل ہوگیا ہے۔ مثال کے طور پر اصل لفظ تو لیمٹرن (Lantern) ہے لیکن اردو میں لالٹین ہوگیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح صحیح تلفّظ ریکروٹ (Recruit) ہے لیکن اسے رنگروٹ بولا جاتا ہے۔(۲۱)

اسی طرح بہت سے الفاظ ایک زبان سے دوسری زبان میں آکر تبدیل ہوجاتے ہیں۔ ہر

زبان میں الفاظ کواپنانے کا عمل جاری رہتا ہے۔ ہر زبان میں دوسری زبان سے آنے والے الفاظ کو یا تو ہو بہو لے لیا جاتا ہے یا اس میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اسے اپنا لیا جاتا ہے۔ اس صورت میں تلفّظ کی تبدیلی سے گریز نہیں۔ بعض اوقات ایک ہی جیسی آوازوں والے حروف بھی تلفّظ کو متاثر کرتے ہیں۔ لفظ دوسری زبان میں جا کر اپنا پہلا اور اولین تلفّظ کھو دیتا ہے اور اس کا نیا تلفّظ رائج ہو جاتا ہے۔ بقول اعجاز راہی:

"اگر لفظ غیر فطری انداز میں جنم لیتا ہے یا اپنے جغرافیائی اور ثقافتی پس منظر میں تشکیل پانے کے بجائے دوسری زبانوں سے دخیل ہوتا ہے اور اس بات کا تقاجا کرتا ہے کہ اس کی صوت وصورت میں تبدیلی نہ کی جائے تو املا اور تلفّظ کا مسئلہ جنم لیتا ہے۔"(۲۲)

زبان میں تلفّظ کی بہت اہمیت ہوتی ہے، جن الفاظ کا تلفّظ کانوں کو برا لگتا ہے یا جن کو بولنے میں دشواری ہو اس تلفّظ کو آہستہ آہستہ متروک کر دیا جاتا ہے۔ بہت سے الفاظ کا متبادل یا مترادف الفاظ کا استعمال عمل میں آنے لگ جاتا ہے۔

کسی بھی معاشرے میں زبان بولنے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ زبان کو صرف اور صرف اظہارِ مدعا کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور اس کی تراش خراش، فصیح یا غیر فصیح ہونے کو اہمیت نہیں دیتے جبکہ دوسرا طبقہ وہ ہے جو زبان کی تراش خراش اور اس کے فصیح و بلیغ ہونے کو ضروری سمجھتا ہے۔ اسی طبقے کی بدولت زبان کے اصول وقواعد عمل میں آتے ہیں اور اس کے لیے فصیح الفاظ کا انتخاب کیا جاتا ہے دوسری زبانوں سے الفاظ لینے کے لیے اصول مرتب کیے جاتے ہیں، ان کے تلفّظ اور املا پر بات کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

"زبان میں فصیح وغیر فصیح اور بہتر و بدتر کی اصطلاحیں صرف ادیب ہی کام میں لاتے ہیں۔ عوام ثقل وتنافر کی کسوٹیوں پر زبان کی صفائی نہیں کیا کرتے بلکہ وہ زبان کو صرف اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ انھیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کوئی لفظ فصیح ہے یا گنوار۔"(۲۳)

مختلف حلقوں کی طرف سے یہ بات بھی سامنے آتی رہی کہ اردو میں مستعمل ایک ہی آواز رکھنے والے ایک سے زیادہ الفاظ کے بجائے کسی ایک لفظ پر اکتفا کر لیا جائے تو اس طرح اردو میں حروف تہجّی کی تعداد کو کم کیا جا سکتا ہے جس سے اردو زبان سیکھنے والوں کو بھی سہولت ہوگی۔ مگر یہ اس

لیے ناممکن ہے کہ بعض ہم آواز الفاظ جس کا تلفّظ ایک ہی ہے صرف حروف کے اختلاف سے الگ پہچان اور معنی رکھتے ہیں اور اسی اختلاف کے سبب ان کی تفہیم ہوتی ہے۔ مثلاً ارض اور عرض، صورت اور سورۃ، حل اور ہل، جالی اور جعلی وغیرہ۔ اگر ہم ا، ع؛ ز، ذ، ض، ظ؛ ہ، ھ، ح؛ ت، ط، ث، س، ص؛ ی، ے؛ میں سے صرف ایک ایک حرف کو اپنا لیں اور باقی کو چھوڑ دیں تو اس سے بہت سے مسائل پیدا ہوں گے جو نہ صرف معانی کی تفہیم و تشریح کو مجروح کریں گے بلکہ اس سے زبان کی فصاحت و بلاغت بھی متاثر ہوگی۔

عام زندگی میں بولے جانے والے مختلف الفاظ کے تلفّظ میں کہیں کہیں اختلاف نظر آتا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ غَلَط کو غلْط بولتے ہیں۔ اسی طرح مختلف الفاظ غلط معنوں میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً مشکور کو اکثر اوقات ممنون کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔

بعض الفاظ لکھنے میں ایک جیسے ہوتے ہیں مگر ان کا تلفّظ جملے کی ساخت کے حوالے سے مختلف ہوتا ہے جیسے ''کیا کیا خضر نے سکندر سے'' میں پہلا کیا پوچھنے کے معنوں میں اور دوسرا کیا کرنے کے معنوں میں۔ پہلا کیا اردو شاعری میں دو حرفی سمجھا جاتا ہے جبکہ دوسرا کیا جو کرنے کے معنوں میں ہے تین حرفی ہوتا ہے۔

بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کا تلفّظ ایک جیسا ہے یا ان میں صوتی آہنگ پایا جاتا ہے، ان الفاظ کو پڑھتے ہوئے عبارت اور لفظ کی املا کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

آک: پودا اور عاق: محروم کرنا جائیداد سے، ابد: ہمیشہ اور عبد: بندہ، اثاث: سامان اور اساس: بنیاد، احرام: حج کا لباس اور اہرام: مصر کے قدیم مقبرے، اقرب: رشتے دار اور عقرب: بچھو، امارت: امیری اور عمارت: بلڈنگ، برس: سال اور برص: پھلبہری، پارا: سیماب اور پارہ: حصہ، تابع: ماتحت اور طابع: چھاپنے والا، تیار: آمادہ اور طیار: اڑنے والا، ثواب: نیکی کا بدلہ اور صواب: ٹھیک ہونا، ثور: بیل اور صور: آواز، حامی: حمایتی اور ہامی: ہمت والا، حَرَج: رکاوٹ اور ہرج: نقصان، حزم: احتیاط اور ہضم: پچنا، حلال: جائز اور ہلال: پہلی کا چاند، دفعہ: شمار اور دفع: دور، زن: عورت اور ظن: گمان، سبحہ: تسبیح والا اور صبح: سویرا، سرف: فضول خرچی اور صرف: خرچ، سفر: راہ چلنا اور صفر: قمری مہینہ، حال: حالت اور ہال: بڑا کمرہ، ذو: دو اور ضو: روشنی، مامور: مقرر اور معمور: بھرا ہوا، متاسف: افسوس کرنے والا اور متّصف: وصف والا، نالا: بڑی ندی اور نالہ: فریاد، نذر: پیش کش اور نظر: نگاہ،

نسب: نسل اور نصب: گاڑنا، قلب: دل اور کلب: کتا اور کلب: انگریزی کا لفظ، کلی: پھول اور قلعی: ملمّع، چونا، مثل: کہاوت اور مسل: مسلنا، مربع: چوکور اور مربہ: پھل کا مربہ، مشاعرہ: شاعروں کی محفل اور مشاہرہ: تنخواہ، مشق: پریکٹس اور مشک: پانی کے لیے چمڑے کا تھیلا، مقدر: تقدیر اور مکدر: خراب، مقرر: تقریر کرنے والا اور مکرر: دوبارہ، نقطہ، صفر، ہندسہ اور نکتہ: باریک بات۔

عام لوگوں کی بول چال میں شاید تلفّظ کی ذرا سی تبدیلی سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا مگر شاعری میں تلفّظ کی ذرا سی ردوبدل سے بحر اور وزن میں تبدیلی واقع آجاتی ہے۔ اسی لیے شاعری میں لفظوں کے تلفّظ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً ''مَرَض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''

اگر ''مَرْض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' ہو تو مصرع وزن اور بحر میں نہیں رہے گا۔ کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جن کا اردو شاعری میں مختلف تلفّظ کے ساتھ استعمال رائج ہے۔ مثلاً گلستان کو، گُلِستان اور گُلسَتان (گُلْ + سَتان) استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو شاعری میں طَرَح اور طَرْح دونوں تلفّظ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

شاعری اور الفاظ کے تلفّظ کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ شاعری کے اوزان تلفّظ کی مدد سے وضع کیے جاتے ہیں۔ اگر کسی لفظ کا تلفّظ صحیح معلوم نہ ہو تو اس کا وزن اور بحر بھی متاثر ہوگی۔ شاعری میں وزن کا دارومدار لفظوں میں متحرک اور ساکن حروف کی ترتیب پر ہوتا ہے۔ یہی متحرک اور ساکن حروف بحر میں ارکان کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''اردو عروض لفظ میں حرکت اور سکون کے وقوع پر مبنی ہے۔ زبر زیر اور پیش کو ملا کر حرکت کہتے ہیں۔ عروض میں زبر زیر پیش کی معنویت یکساں ہے ان کے فرق کو نظر انداز کر کے سب کو حرکت کے تحت لیتے ہیں۔ حرکت وسکون کے اجتماع سے ذیل کے ساکن الآخر اجزا ترتیب پاتے ہیں۔''(۲۴)

عروضیوں کے نزدیک ارکانِ بحر تین ہیں:

۱۔ سبب: دو حرفی کلمہ ہے۔ اگر پہلا متحرک اور دوسرا ساکن ہے جیسے ہم، تم تو سبب خفیف ہے اور اگر دونوں متحرک ہین تو سبب ثقیل ہے جیسے دل

۲۔ وتد: سہ حرفی کلمے کو کہتے ہیں پہلا اور دوسرا حرف متحرک اور تیسرا ساکن ہو تو وتد مجموع ہوگا جیسے قلم، اگر پہلا حرف متحرک اور دوسرے دو ساکن ہوں تو وتد مفروق ہوگا جیسے صبر، درد۔

۳۔فاصلہ: چار حرفی کلمے کو کہتے ہیں پہلے تین متحرک ہوں آخری ساکن فاصلہ صغریٰ ہوگا جیسے طلبی۔اگر چار حروف متحرک ہوں اور پانچواں ساکن تو فاصلہ کبریٰ ہوگا۔(۲۵)

عربی میں عربی، طلبی، علوی بولا جاتا ہے۔مگر اردو میں فاصلہ کم ہی بولا جاتا ہے عوام سہولت کی خاطر اس کے دوسرے متحرک حرف کو ساکن کر لیتے ہیں۔سبب متوسط میں پہلا حرف متحرک اور دوسرے دو ساکن ہوتے ہیں جیسے صبر، کار، جان وغیرہ جبکہ سبب وتد کثرت میں دو حرف متحرک اور بعد کے دو ساکن ہوتے ہیں جیسے نہاد، خیال، سپرد، بزرگ وغیرہ۔(۲۶)

اسی طرح ضرورت شعری کی مطابق کہیں میری، میرے، میرا اور کہیں اس کے بجائے مری، مرے، مرا استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح مجھ کو، تجھ کو، ہم کو، ان کو جن کو' کے بجائے بعض جگہ ضرورت شعری کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے، تجھے، ہمیں، انھیں اور جنھیں استعمال کیا جاتا ہے۔یوں شاعری میں وزن اور بحر کی ضروریات اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان الفاظ کا املا بھی بدل جاتا ہے اور املا کے ساتھ ساتھ تلفّظ بھی۔اسی طرح جب ہم انگریزی کے الفاظ سکول، سٹیشن، سکرین، سٹیتھیسکوپ کو اردو میں استعمال کرتے ہیں تو الف کا اضافہ کر کے اسکول، اسٹیشن، اسکرین، اسٹیتھسکوپ وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔مگر بعض جگہ شعری ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے انگریزی کا تلفّظ بھی اپنا لیا جاتا ہے۔

تلفّظ عام زندگی میں ہو یا شاعری میں اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔زبان میں ترقی اور فروغ کے عمل میں املا اور تلفّظ بھی اساسی کردار کے حامل ہوتے ہیں۔پڑھے لکھے لوگ جب کسی شخص کو غلط تلفّظ بولتے ہوئے سنتے ہیں تو وہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں۔انسان کے اخلاق اور مزاج میں زبان کی شائستگی اور سلاست بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مہذب معاشروں میں زبان کے لکھنے اور بولنے کی صحت کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ منصف خان صحاب، نگارستان، لاہور، دارالتذکیر، ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۶

۲۔ رشید حسن خاں، اردو املا، لاہور مجلس ترقی ادب، ص ۱۲

۳۔ اردو زبان میں تحقیق کی اہمیت اور موجودہ صورت حال مشمولہ لسانی مذاکرات، مرتبہ شیما مجید، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء۔ ص ۳۲۱

۴۔ رشید حسن خاں، اردو املا، لاہور مجلس ترقی ادب، ص ۲۱

۵۔ رشید حسن خاں، اردو کیسے لکھیں (صحیح املا)، رابعہ بک ہاؤس لاہور، ص ۸

۶۔ نورالحسن نیر، مولوی، نوراللغات، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۲۰

۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۱

۸۔ اردو زبان میں تحقیق کی اہمیت اور موجودہ صورت حال مشمولہ لسانی مذاکرات، ص ۳۲۰، ۳۲۱

۹۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، لسانی مقالات، حصہ سوم، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء، ص ۸۵

۱۰۔ وارث سرہندی، زبان و بیان (لسانی مقالات)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء، ص ۳۱

۱۱۔ رشید حسن خاں، اردو کیسے لکھیں، ص ۲۳

۱۲۔ مجال، خواجہ غلام ربانی، اردو خواندگی سیکھنے کی منازل، مشمولہ ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۷

۱۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو املا اور رسم الخط (اصول و مسائل)، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۸۲، ۸۳

۱۴۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، لسانی مقالات، حصہ سوم، ص ۸۶

۱۵۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد اول، حصہ اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۸

۱۶۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، لسانی مقالات، حصہ سوم، ص ۸۷

۱۷۔ اقتدار حسین، ڈاکٹر، اردو صرف ونحو، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲

۱۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، لسانی مقالات، حصہ سوم، ص ۸۷، ۸۸

۱۹۔ محمد محمود رضوی مخمور آبادی، سید، اردو زبان اور اسالیب، جلد اول، کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، س ن، ص ۲۶۶ تا ۲۶۸

۲۰۔ رشید حسن خاں، اردو املا، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۱۵، ۱۶

۲۱۔ نجیبہ عارف، معیاری اردو قاعدہ، مشمولہ اخبار اردو اسلام آباد، مئی ۲۰۱۰ء، ص ۱۱

۲۲۔ اعجاز راہی (مرتب)، حرف آغاز مشمولہ روداد سیمینار املا و رموز اوقاف کے مسائل، اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۴

۲۳۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، لسانی مقالات، حصہ سوم، ص ۷۱

۲۴۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، اردو کا اپنا عروض، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۷

۲۵۔ منصف خان صحاب، نگارستان، ص ۱۸۱، ۱۸۲

۲۶۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، اردو کا اپنا عروض، ص ۱۸

اُردو کے لیے رومن رسم الخط

اردو زبان برصغیر کی ایک مقبول عام اور ہر دلعزیز زبان ہے جو مختلف زبانوں کے اختلاط سے صدیوں کی لسانی عمل انگیزی کے بعد معرضِ وجود میں آئی ہے۔ یہ زبان عربی اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد اس کے لیے تیسرا رسم الخط یعنی رومن رسم الخط بھی استعمال کیا جانے لگا۔

رومن رسم الخط کو برصغیر میں یورپی تاجر لے کر آئے۔ شروع میں تاجروں نے رومن رسم الخط کو اسمائے معرفہ کے لیے استعمال کیا۔ پھر عیسائی مبلّغوں نے برصغیر میں اس خط کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ جب یہاں فرانسیسیوں اور انگریزوں کی آمد اور معاملات کا دائرہ کار بڑھ گیا تو رومن حروف بھی متعارف ہوتے چلے گئے۔ رومن رسم الخط کے بارے میں ڈاکٹر طارق عزیز لکھتے ہیں:

''دیسی عیسائیوں کے لیے عہد نامۂ قدیم و عہد نامۂ جدید کے مختلف حصے مقامی زبانوں اور فارسی زبان میں بخط رومن چھپتے اور تقسیم ہوتے رہے، یہاں تک کہ انگریزی تسلّط نے اس خط کو اپنی فوجوں میں رائج کرنے کے لیے فوجی قواعد گھوڑوں کے علاج اور صحت عامہ کے بعض رسالوں میں استعمال کیا۔''(۱)

فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) کے حوالے سے جان بورتھوک گلکرسٹ کی اردو زبان کے

لیے کی جانے والی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جان گلکرسٹ ہی تھا جس نے اُردو زبان کے لیے سب سے پہلے رومن رسم الخط استعمال کیا۔ گلکرسٹ نے اپنی کتاب English and Hindoostani Dictionary میں رومن خط استعمال کیا۔ یہ ڈکشنری ۱۷۸۶ء میں پہلی بار شائع ہوئی جسے ہندوستان کے قائم مقام گورنر جنرل سر جان میک فرسن کے نام پر معنون کیا گیا تھا۔ اردو زبان اور اس کے اصلی تلفّظ کو رومن رسم الخط میں لکھنے کا کام سر ولیم گریرسن نے سرانجام دیا۔[۲] اردو میں یہ ایک باضابطہ کوشش تھی کہ جب مختلف اردو کے الفاظ اور آوازوں کے لیے رومن میں الفاظ وضع یا مقرر کیے گئے۔ گیریریسن نے اپنی کتاب ہندوستان کا لسانیاتی سروے (Linguistic Survey of India) میں ہندستانی زبان کے صحیح تلفّظ کو رومن حروف میں ظاہر کیا ہے۔

۱۹۱۲ء میں ایتھنز میں ''مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس'' اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ''انٹرنیشنل فونیٹک ایسوسی ایشن برائے ہندوستانی'' نے بھی ہندوستانی (اردو) کے لیے رومن حروف بنانے کے اصول وضع کیے۔ ۱۹۳۹ء میں سجاد مرزا نے رومن رسم الخط کے لیے نئی سکیم پیش کی۔ ۱۹۴۷ء میں سجاد مرزا پھر ایک کمیٹی میں شامل رہے جس نے رومن رسم الخط کے بارے میں تجاویز پیش کیں۔ ۱۹۵۰ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے ایک کمیٹی بنائی جس میں ڈاکٹر جعفر حسن، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر یزدانی، پروفیسر حبیب الرحمٰن، جناب سجاد مرزا، پروفیسر ہارون شروانی شامل رہے۔ ۱۹۶۱ء میں پاکستان میں شان الحق حقی نے اردو ترقیاتی بورڈ کے ملاحظے اور منظوری کے لیے ''رومن اردو کے اصول املا'' کے لیے ایک رپورٹ تیار کی جو بعد میں رسالہ اردو نامہ اپریل ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔[۳] ان سکیموں میں رومن میں اردو حروفِ تہجّی، ہم صوت الفاظ کے لیے علامتیں، علاماتِ علت، حروف صحیح، تشدید، اعراب وحروفِ علت، عین اور ہمزہ، نون اور نون غنہ وغیرہ کے حوالے سے مباحث کا جائزہ لیا گیا۔

۱۹۴۷ء میں جب تقسیم ہند عمل میں آئی تو مملکتِ خداداد پاکستان کے بانی اور دوسرے رہنماؤں نے بار بار اس بات کا عہد اور اعادہ کیا کہ پاکستان کی قومی وسرکاری اور دفتری زبان اردو ہوگی۔ مگر شومئی قسمت آج تک پاکستان میں اردو زبان کو بطور دفتر اور سرکاری زبان کے رائج نہیں کیا جا سکا۔

پاکستان بننے کے فوری بعد کچھ لوگوں نے یہ تجویز بھی دی کہ اردو زبان کے لیے عربی کے

بجائے رومن رسم الخط کو اختیار کیا جائے۔ایسے لوگوں کے پیچھے یہ سوچ بھی کام کر رہی تھی کہ مشرقی اور پاکستانی زبان اور تہذیب مغربی تہذیب وثقافت اور زبان سے کم اہمیت کی حامل ہے۔انگریزی اور مغربی تہذیب کو پسند کرنے والا طبقہ اپنی زبان اور کلچر کو کم تر سمجھتے ہوئے مغربی تہذیب کی پیروی اور اندھا دھند تقلید میں اپنے ملکی اور علاقائی مفاد کو فراموش کر بیٹھا۔لہٰذا یہ طبقہ چاہتا تھا کہ براہ راست اگر انگریزی زبان کے نفاذ میں کوئی رکاوٹ ہے تو اسے رومن رسم الخط نافذ کر کے آہستہ آہستہ پاکستانی قوم کو اپنے ماضی کے تہذیبی، ثقافتی اور ادبی ورثے سے محروم کر دیا جائے،اس طرح انگریزی زبان اور مغربی کلچر کی راہ ہموار ہو جائے گی۔اس طوفانِ بلا خیز کو روکنے اور اس کے آگے بند باندھنے کے لیے بہت سی اردو دوست تنظیمیں اور لوگ میدان میں اتر پڑے اور بروقت آگے بڑھ کر اس سیلِ بلا کا راستہ روک دیا گیا۔لیکن راستہ رکنے کے باوجود آج بھی پاکستان میں دفتروں اور اداروں میں انگریزی اور رومن رسم الخط کا رواج عام ہے۔

اگر کوئی طبقہ کسی بھی وجہ سے رومن رسم الخط کا نفاذ چاہتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ رومن رسم الخط استعمال کرنے میں بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کا احتمال بھی موجود ہے۔رومن میں بہت سے الفاظ کا تلفظ گڈ مڈ ہو کر رہ جاتا ہے۔جیسے ف کی آواز کے لیے Figure میں Elephant، F میں Ph، Enough میں Gh استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح ش کے لیے Ass میں ss، Station میں Tion، Shine میں Sh استعمال ہوتا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم مختلف الفاظ لکھتے ہوئے صحیح تلفظ کے لیے ایسا کونسا لسانی فارمولا استعمال کریں گے جس سے یہ مسئلہ حل ہو جائے۔اسی طرح کے اور بھی بہت سے لسانی مسائل ہیں جن پر گزشتہ دو سو سال سے بات بھی ہو رہی ہے اور کام بھی ہو رہا ہے مگر اپنی تمام تر ضرورت واہمیت کے باوجود رومن رسم الخط ہمارے لسانی مسائل کا آخری حل نہیں ہے۔کیونکہ زبان کا رسم الخط بدلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

زبان اور رسم الخط ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔جیسے جسم اور کھال۔رسم الخط کوئی زبان کا لباس نہیں کہ جسے جب چاہا بدل لیا۔اردو زبان کے لیے رومن رسم الخط میں لکھنے کے حوالے سے بحث کا سلسلہ بہت پرانا ہے اور ہر دور میں اہلِ فکر اور دانش ور طبقے نے اس پر قلم اُٹھایا ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''پروفیسر احتشام حسین نے ایک زمانے میں ''زبان اور رسم الخط کے باطنی تعلق پر بحث چھیڑی

تھی اور اس دعوت میں اوروں کو بھی دعوت فکر و نظر دی تھی، چنانچہ ڈاکٹر شوکت سبزواری، علامہ نیاز فتح پوری، پروفیسر مسعود حسن رضوی، اور راقم الحروف (فرمان فتح پوری) کے مضامین اس بحث کے سلسلے میں ۱۹۵۱ء میں نگار لکھنؤ سے شائع ہوئے تھے، ان مضامین میں اس خیال کو گمراہ کن بتایا گیا تھا کہ کسی زبان کو کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں پوری صحت کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔''(۴)

یہ حقیقت ہے کہ کسی زبان کے حروف و الفاظ کو کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں اس طرح نہیں لکھا جا سکتا کہ الفاظ و معانی کا انتشار پیدا نہ ہو۔ اگر ایسا ہو سکتا ہو پوری دنیا کے ماہرِ لسانیات دنیا میں بولی اور لکھے جانے والے ہزاروں زبانوں کو چھوڑ کر کسی ایک رسم الخط کو اختیار کرنے کی ضرورت کی طرف ضرور متوجہ ہوتے۔ اردو کے لیے رومن رسم الخط کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''رومن رسم الخط اپنے ناقص صوتیات کے سبب اردو الفاظ کے تلفّظ کی ضمانت و کفالت نہیں کر سکتا۔ ہر لفظ اس طرح مسخ ہوگا کہ اس کا صحیح پڑھنا مشکل ہو جائے گا۔۔۔ اردو کیا خود انگریزی الفاظ کا تلفّظ رومن رسم الخط کی پیچیدگی کے سبب، صحت کے ساتھ ادا نہیں کیا جا سکتا، نتیجہ یہ ہے کہ ہر مستند لغت میں ہر لفظ کے ساتھ اس کا تلفّظ قوسین کے اندر لکھ دیا جاتا ہے۔''(۵)

۱۹۳۳ء میں جب جواہر لال نہرو کی بہن کرشنا کی شادی ہوئی تو نہرو نے کارڈ لاطینی رسم الخط میں لکھ کر بھیجا۔ اس تناظر میں جواہر لال نہرو رسم الخط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شادی کے سلسلہ میں نیوتہ کا جو مختصر سا خط ہم لوگوں نے بھیجا وہ ہندوستانی زبان اور لاطینی رسم الخط میں لکھا گیا تھا، یہ ایک جدت تھی اس لیے کہ نیوتے ہمیشہ یا تو ناگری رسم الخط میں لکھے جاتے ہیں اور علاوہ فوجی یا عیسائی مشنری حلقوں کے کسی جگہ لاطینی رسم الخط میں ہندوستانی زبان لکھنے کا بالکل رواج ہی نہیں۔ میں نے تجربہ کے طور پر لاطینی رسم الخط اختیار کیا تھا، محض یہ دیکھنے کے لیے کہ مختلف لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس نیوتے کے متعلق موافق اور مخالف دونوں طرح کی رائیں معلوم ہوئیں لیکن زیادہ لوگ مخالف ہی تھے۔ بہت تھوڑے لوگ بلائے گئے تھے، اگر اور زیادہ لوگوں کو نیوتہ بھیجا جاتا تو مخالفت بھی اور زیادہ ہوتی۔ گاندھی جی نے بھی میری اس جدت کو ناپسند کیا۔''(۶)

زبان کے حوالے سے رسم الخط کی اہمیت سے انکارنہیں کیا جاسکتا ہے۔رسم الخط جتنا زیادہ عمدہ اور فصیح ہوگا اتنی ہی زبان میں ترقی کے امکانات روشن ہوں گے۔اور اگر رسم الخط بدل دیا جائے تو اس سے کئی لسانی مغالطے اور مشکلات پیش آئیں گی۔

''رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہوجاتی ہے اور قدیم ادب ایک اجنبی زبان کا ادب بن کررہ جاتا ہے جو مردہ ہوچکی ہے۔۔۔زبردستی اس قسم کی تبدیلی کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی زبان کو بے رحمی سے ذبح کرنا چاہتے ہیں۔''(۷)

رومن رسم الخط کو اردو بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد اس لیے استعمال کرتی ہے جس کے پیچھے یہ حقیقت کارفرما ہے کہ کمپیوٹر کی غالب زبان (Predominant Language) انگریزی ہے اور یہی انٹرنیٹ کی زبان ہے جو کہ رومن رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

پاکستان میں اس زبان کے لیے زیادہ تر جو رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے وہ عربی رسم الخط ہے،مگر ضرورت کے تحت تقریباً ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں اس کے لیے رومن رسم الخط بھی استعمال کرتا ہے۔مختلف قسم کے فارم بھرنے کے لیے،انٹرنیٹ اور موبائل فون سے میسج بھیجنے کے لیے تقریباً ہر وہ شخص رومن رسم الخط استعمال کرتا ہے جو کہ موبائل فون یا انٹرنیٹ کو استعمال کرتا ہے مگر اس سے اردو زبان کو کوئی نقصان لاحق نہیں ہوا۔کیونکہ یہ رسم الخط صرف ایک ضرورت پوری کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور آج کل اس کی جگہ کسی حد تک عربی رسم الخط رواج بھی سامنے آرہا ہے،لیکن اگر ہم اردو کا عربی رسم الخط چھوڑ کر رومن رسم الخط کو اختیار کرتے ہیں تو رومن رسم الخط کی صورت میں ہماری نئی نسل ایک بالکل نئی زبان سے روشناس ہوگی،جس کا کوئی علمی وادبی اور تہذیبی وثقافتی سرمایہ نہیں ہوگا۔یوں وہ نئی نسل علم وادب کے اس سرمائے سے محروم رہے گی جو کہ اردو زبان میں موجود ہے۔

اس کا سب سے بہتر حل یہی ہے کہ نئی نسل کو اردو زبان سے آگاہی اور اردو کے حروفِ تہجّی، خطِ نسخ، خطِ نستعلیق سے روشناس کرایا جائے تا کہ وہ اپنی روایات، رسوم ورواج،اور تہذیب وثقافت اور ادب سے اپنا رشتہ برقرار رکھ سکیں۔برطانیہ اور دوسرے ممالک میں میں مقیم اردو کمیونٹی اس قسم کے سیمینار اور مشاعروں اور ادبی تقاریب کا انعقاد عمل میں لائے جس سے وہاں نئی نسل میں اپنے ادیبوں اور لکھنے والوں سے متعارف ہونے کا موقع مل سکے۔

اگر اردو زبان نہیں ہوگی تو ہمارے پاس اعلیٰ درجے کے ادبی فن پارے ختم ہو جائیں گے۔
اردو نہ صرف ہمارے لیے علم و ادب اور تدریس کا ذریعہ ہے بلکہ یہ ہماری معاشرت، رہن سہن، رویوں، مزاجوں، اقتصادی و معاشرتی ضرورتوں تک کو پورا کرتی نظر آتی ہے۔ اگر ہم خود کو اردو زبان کو منہا کر کے دیکھیں تو ہم ایک ایسے خلا میں معلّق ہو جائیں گے جہاں ہمارے لیے کوئی سائبان نہ ہوگا اور ہم ایک کٹی پتنگ کی طرح بے وزن و دربدر ہو جائیں گے۔

جہاں تک برطانیہ اور دوسرے ممالک میں رہنے والے اردو بولنے والے لوگوں کی نئی نسل کے لیے زبان کا مسئلہ ہے تو میرے خیال میں رومن رسم الخط اختیار کرنا اس کا واحد حل نہیں ہے بلکہ اس کا حل اردو کے حروف اور قواعد سے روشناسی ہے۔ جن لوگوں کے بچے اردو بولنا جانتے ہیں وہ ذرا سی محنت سے اردو رسم الخط سے روشناس ہو سکتے ہیں اس طرح وہ نہ صرف اپنے قدیم بلکہ ہم عصر اردو کے وسیع علمی و ادبی ذخائر سے بھی صحیح معنوں میں مستفید ہو سکیں گے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ طارق عزیز، ڈاکٹر، اردو رسم الخط اور ٹائپ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۳۱

۲۔ ہارون خان شیروانی، پروفیسر، اردو رسم خط اور طباعت، اسلامک پبلی کیشنز حیدر آباد (دکن)، ۱۹۵۷، ص ۱۷

۳۔ طارق عزیز، ڈاکٹر، اردو رسم الخط اور ٹائپ، ص ۳۴، ۵۰

۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو زبان و ادب، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۶۳

۵۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۶۔ جواہر لال نہرو، میری کہانی (خود نوشت سوانح)، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۵۴۶

۷۔ ایضاً

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

ڈاکٹر مسعود حسین خاں لسانیات میں پی ایچ ڈی تھے۔ پی ایچ ڈی مقالے کے ابتدائی ابواب ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' کے نام سے ۱۹۴۸ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئے۔ اس کتاب کا پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں اردو مرکز لاہور سے شائع ہوا۔

اس کتاب میں مصنّف نے اردو کے وطن کے بارے میں بحث کی ہے۔ اور اس کے پس منظر میں ہند آریائی زبان کے عہد قدیم، عہد وسطیٰ اور تیسرے عہد اور پھر ہند آریائی کے جدید عہد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اردو کے جنم بھومی کے حوالے سے کھڑی بولی کے بارے میں تحقیق پیش کی جو کہ ۸۰۰ء سے ۱۳۰۰ء تک کے مواد پر مشتمل ہے۔ ان تمام دلائل اور حقائق کو دیکھتے ہوئے انھوں نے آزاد کے لسانی نظریے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی اور حافظ محمود شیرانی کے نظریے کا پنجابی اور دکنی زبانوں کے حوالے سے جائزہ لیا۔ ان تمام مباحث کو سمیٹتے ہوئے انھوں نے آخر میں دکنی اور ہریانی، دکنی اور میواتی دکنی اور کھڑی بولی کے بارے میں لکھا۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''ہندوستان میں آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ'' میں انھوں نے آریاؤں کے وطن اور ان کی برصغیر میں آمد پر لسانی حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے اس باب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہند آریائی زبان کا عہد قدیم (۱۵۰۰

ق م-۵۰۰ ق م)، عہد وسطی (۵۰۰ ق م-۶۰۰ء) اور تیسرا عہد (۶۰۰-۱۰۰۰ء) کے عنوانات سے ہے۔
مسعود حسین خاں کتاب کے شروع میں سنسکرت زبان پر قلم اٹھاتے ہوئے اس کے خواص کی زبان بننے اور عوام میں اس کا رواج کم ہونے کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کے زوال کا سب سے بڑا سبب وہ مذہبی انقلاب تھا جو مہاویر سوامی اور مہاتما بدھ کی کوششوں سے ہندوستان میں نمودار ہوا۔ دونوں نے اپنے اپنے دھرموں کا پرچار اپنے یہاں کی مقامی بولیوں میں کیا، عوام نے اس کا استقبال کیا۔ اس طرح مذہب کا سہارا لے کر صوبائی بولیاں چمک اٹھیں، اور سنسکرت سے ٹکر لینے لگیں۔ ردعمل کے طور پر ویدک مذہب کے علمبردار اپنی زبان کی حفاظت اور زیادہ سختی سے کرنے لگے۔ سنسکرت رفتہ رفتہ ایک فرقہ کی زبان بن کر رہ گئی۔''(۱)

ڈاکٹر مسعود حسین خان اس بات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ آریوں کی ابتدا ہی سے سنسکرت دو دھاروں میں بدل گئی تھی۔ ایک ادبی سنسکرت اور دوسری ویدک سنسکرت۔ ادبی سنسکرت محدود ہوتی گئی جب کہ ویدوں کی زبان آج تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور موجودہ بہت سی زبانوں کا تعلق اسی دھارے سے ملتا ہے۔ سنسکرت کے ساتھ دوسری بہت سی زبانیں بھی پھوٹیں جنھوں نے ویدک زبان سے استفادہ کیا اور یہی زبانیں پراکرت کہلانے لگیں۔ بقول ڈاکٹر مسعود حسین خاں: ''یہ بات واضح ہوگئی کہ شروع ہی سے عوام کی زبان ایک مخلوط زبان تھی۔''(۲)

اس باب میں انھوں نے رگ وید کو غیر مصنوعی اور سادہ زبان قرار دیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے لسانی نظریہ کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مقدمہ تاریخ زبان اردو میں اردو کے برج بھاشا پنجاب، دکن اور سندھ سے تعلق کو مسترد کر دیا انھوں نے مختلف زبانوں اور بولیوں کے تقابلی مطالعے کے بعد اردو کا تعلق ہریانی کے ساتھ جوڑا۔''(۳)

اُردو کے حوالے سے ان کا موقف یہ رہا کہ اردو شروع میں کسی ایک زبان سے فیض یاب نہیں ہوئی نہ اس کا ماخذ ایک زبان رہا، اور یہ بولیاں دہلی کے گردونواح میں بولی جانے والی بولیاں تھیں۔ مگر بعد میں اُردو کھڑی بولی کی ایک شکل میں ابھری۔ ایوب صابر لکھتے ہیں:

''ان کے نزدیک اردو کا اصل سرچشمہ نواح دہلی کی بولیاں ہیں۔''(۴)

مسعود حسین خاں کے مطابق دہلی کے نزدیک علاقوں میں کھڑی، میواتی اور ہریانی زبانیں بولی جاتی تھیں اور ابتدا میں انھیں زبانوں نے اردو پر اثرات مرتب کیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نواح دہلی کی زبانوں کی قدامت مسلم ہے۔۔اس لیے اردو کی ابتدا کے سلسلے میں مزید تحقیق انھی بولیوں کے بارے میں ہونی چاہیئے نہ کہ پنجابی پر جو کہ بذات خود درمیانی اور ملواں زبان ہے۔''(۵)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ہریانی، میواتی، کھڑی اور برج کی زبانوں کو اردو کے ماخذ کے حوالے سے اہم قرار دیا ہے۔ان چاروں زبانوں کے اثرات اور پھر ان اثرات کے زائل ہونے کی بات کر کے وہ کھڑی بولی کو اردو کا ماخذ قرار دیتے ہیں:

''پنجاب سے لے کر بنگال تک ادبی حیثیت سے صرف ایک زبان استعمال میں لائی جاتی ہے۔اس زبان کی بنیاد اس بولی پر ہے جو میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی ہے یعنی کھڑی بولی۔''(۶)

دوسرے باب میں وہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں اور مغربی ہندی کی بولیوں کے حوالے سے اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں۔اور بتاتے ہیں کہ آریا ہندوستان میں دو گروہوں میں اور مختلف وقت میں آئے۔اس باب میں انھوں نے گریرسن کی تقسیم زبان کا نقشہ دیا ہے۔جنوبی اور مشرقی ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں بھی گروہ بندی پیش کی ہے۔گریرسن کے حوالے سے انھوں نے مغربی ہند کی پانچ زبانوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔کھڑی بولی یا ہندوستانی، ۲۔ہریانی، جاٹو یا بانگڑو

۳۔برج بھاشا، ۴۔قنوجی،

۵۔بندیلی

تیسرا باب اردو زبان کے ارتقا کے حوالے سے ان کی تحقیق پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے کھڑی بولی کو اردو کی جنم بھومی قرار دیا۔وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''شاہجہان ہی کے زمانے میں نئی دہلی میں وہاں کی پرانی زبان نئے سرے سے زندہ ہوتی ہے جو عہد عالمگیری میں برج بھاشا کے قدم ادبی حلقوں سے اکھاڑ دیتی ہے۔''(۷)

وہ اس دور کے شاعر پنڈت چندر بھان برہمن (۱۵۷۴ء۔۱۶۶۲ء) کی غزل کو اردو کی پہلی

غزل قرار دیا۔ جسے کیفیہ مین دتاتریہ کیفی نے بغیر کسی تحقیق کے پہلی غزل قرار دیا ہے۔

خدا جانے یہ کس شہر اندر ھمن کو لا کے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے (۸)

چوتھے باب میں برج بھاشا، پنجابی اور دکنی کے حوالے سے تحقیق پیش کی ہے کہ اُردو اُن زبانوں سے نکلی ہے یا نہیں۔ برج اور اردو کے درمیان قواعد کے اختلافات کے بارے میں لکھا ہے

''اُردو اور برج کے مذکورہ بالا اختلاف کے باوجود سکندر لودھی کے زمانے سے لے کر شاہجہان کے عہد (۱۶۴۷ء) تک اردو کے ارتقا میں اس کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔''(۹)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے پنجابی، دکنی، ہریانی زبانوں کے مختلف افعال کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ حافظ محمود شیرانی نے دکنی کی خصوصیات کی مماثلت پنجابی زبان کے ساتھ کی ہے۔ جبکہ ڈاکٹر مسعود حسین خان دکنی اور دہلی اور اس کے گردونواح میں بولے جانے بولیوں دکنی زبان کا ماخذ ہیں۔ آخری باب میں لکھتے ہیں:

''قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست ہریانی کے زیر اثر ہوئی ہے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں۔''(۱۰)

کتاب کے آخر میں مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''نواح دہلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں اور ''حضرت دہلی'' اس کا صحیح مولد و منشا۔''(۱۱)

۱۹۶۶ء میں ان کی ایک اور تصنیف ''شعر و زبان'' حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی۔ اس میں اردو صوتیات کا خاکہ ان کا ایک ایسا مضمون ہے جو لسانی حوالے سے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو میں صوتیات پر یہ پہلا مضمون ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں اصوات کا مطالعہ سائنسی تناظر میں کرنے پر زور دیا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا اردو کے لسانیاتی ادب میں اہم مقام ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مضامین اردو لسانیات میں اس موضوع کی آبرو ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ''اردو صوتیات کا خاکہ'' کی ابتدا میں ایک حقیقت کو معترضانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ اردو میں عربی فارسی اثرات اسلوبیات سے ہوتے ہوئے تشکیلی صوتیات، صرف ونحو بلکہ صوتیات

تک نفوذ کر گئے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ کیا ہونا چاہئے کیا نہیں ہونا چاہئے یہ بات لسانیات کی تعلیم سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اردو کے ہم صوت حروف کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کہا ہے کہ یہ مردہ لاشیں ہیں۔ ڈاکٹر جین نے یہ اضافہ کیا کہ انھیں سپردِ خاک کر دیا جائے۔ سحر صاحب نے ہم صوت الفاظ کے بارے میں یہ تجویز دی کہ املا کا اختلاف معنی کے اختلاف کو واضح کرتا ہے، حرف سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اردو کے سارے ذخیرے کو ترمیم شدہ املا میں لکھنا اور پھر سمجھنا بہت مشکل ہوگا۔ (۱۲)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے شاگرد مرزا خلیل بیگ نے ان کے کچھ مضامین کو اکٹھا کر کے ''نذرِ مسعود'' کے نام سے شائع کیا۔ ان مضامین میں بھی لسانی حوالے سے قلم اٹھایا گیا ہے۔ لسانیات اور اسلوبیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا پسندیدہ موضوع رہا اور اس حوالے سے انھوں نے کئی مضامین رقم کیے اور کئی مباحث کو چھیڑا۔

قدیم اردو نے شروع میں زبان دہلوی اور دہلی کے ارد گرد بولی جانے والی بولیوں کے اختلاط سے نمو پائی۔ اس وقت دہلی میں اور اس کے نواح میں کھڑی بولی، برج بھاشا، میواتی اور ہریانی (جاٹو۔ بانگڑو) بولی جاتی تھیں۔ مسعود حسین خاں گریرسن لنگوسٹک سروے آف انڈیا، جلد نہم، ہندوستانی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بجنور کی کھڑی بولی، دوآبہ کے اضلاع کی کھڑی اور رام پور اور مراد آباد کی اُردو نما کھڑی کے درمیان کی کڑی ہے۔ مثلاً انفی کوز آواز (ن ط) جو اردو میں کبھی رائج نہ ہو سکی اور میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع کی خصوصیت ہے۔ بجنور تک سنائی دیتی ہے۔''(۱۳)

اُردو زبان کا اگر تاریخی لسانیات کے حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اپنے آغاز سے لے کر آج تک اُردو زبان پر کئی زبانوں نے اپنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اردو پر عربی فارسی اثرات کی بات کرتے ہوئے مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''اس پر عربی فارسی لسانی اثرات محض اتفاق نہیں جیسا کہ بنگالی اور مرہٹی یا ہندی میں پائے جاتے ہیں بلکہ ان کی نوعیت بنیادی اور ترکیبی ہے۔ جن سے قطع نظر اردو زبان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عربی فارسی عناصر نے اس زبان کو اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ انیسویں صدی کے تمام محققین نے اس بولی کو پہچاننے میں لغزش کی ہے جو کہ اس کی تہہ

میں موجود ہے اور جس کے ذریعے اس کا رشتہ قدیم ہند آریائی تک پہنچتا ہے۔"(۱۴)

"مقدمہ تاریخ زبان اردو" برصغیر میں زبانوں کے ارتقا اور بالخصوص اُردو زبان کے ارتقا اور اس کی نشوونما کے مختلف مدارج کے حوالے سے ایک اہم لسانی کتاب ہے۔

مسعود حسین خاں کے کچھ مقالات کو مرزا خلیل احمد بیگ نے مرتب کر کے شائع کرایا۔ "اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ" کے نام سے یہ کتاب انگریزی میں ۱۹۵۴ء اور ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی جب کہ اردو ترجمے میں ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں لفظ، صوت رکن الفاظ کی صوتیاتی اور تجز ساخت، الفیت، معکوسیت، مصوتے، مصمتے۔ مربوطیے کی عروضیات: (الف) مصوتی تسلسل، (ب) وسط مصوتی تداخل، (ج) تشدید، (د) ہائیت، (ہ) مسموعیت اور غیر مسموعیت پر تحقیقی اور لسانی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔(۱۵)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا لسانیات اور صوتیات کے حوالے سے کام قابل قدر ہے اور خاص طور پر اُس کی اُردو زبان مین پیش کش کی وجہ اُردو زبان کا لسانی حوالے سے دامن وسیع ہوا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو، لاہور، اردو مرکز، پہلا ایڈیشن، ۱۹۶۶ء، ص ۱۸

۲۔ ص ۱۹

۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۱

۴۔ ایوب صابر، پروفیسر، اردو کی ابتدا کے بارے میں محققین کے نظریات، ایبٹ آباد، سرحد اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء، ص ۹۶

۵۔ مسعود حسین خاں، ڈاکٹر، دیباچہ، مقدمہ تاریخ زبان اردو، ۱۹۶۶ء

۶۔ مسعود حسین خاں، ڈاکٹر، مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص ۳۵

۷۔ ایضاً۔ ص ۱۲۵

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۱۲۔ رشید قریشی، ڈاکٹر ابو محمد سحر، اخبار اردو اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۸

۱۳۔ مسعود حسین خاں: دکنی یا اردوئے قدیم، مشمولہ اردو زبان کی تاریخ از مرزا خلیل احمد بیگ، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۴

۱۴۔ مسعود حسیں خاں: اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کا مسئلہ مشمولہ اردو زبان کی تاریخ، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ، ص ۸۴

۱۵۔ مسعود حسین خاں، اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ، شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۶ء

ڈاکٹر محی الدین قادری زور

اردو میں جدید لسانیات کا آغاز کرنے والوں میں اولیت ڈاکٹر محی الدین قادری زور کو حاصل ہے۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔جامعہ عثمانیہ سے تعلیم حاصل کی اور وہیں ان کو ملازمت مل گئی جہاں وہ صدر شعبہ اردو کے طور پر کام کرتے رہے۔جامعہ کشمیر میں صدر شعبۂ اُردو کے طور پر کام کیا اور وہیں ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔

۱۹۳۱ء میں تحقیق وتنقید کے فروغ کے لیے ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد رکھی۔انھوں نے بے شمار کتابیں تصنیف وتالیف کیں جن میں کلیاتِ محمد قلی قطب شا،حیاتِ محمد قلی قطب شاہ،اردو شہ پارے، تذکرۂ گلزار ابراہیم، دیوان حاتم زادہ، ارشاد نامہ، ابراہیم نامہ، روحِ تنقید، روحِ غالب، تنقیدی مقامات،ادبی تاثرات،اردو کے اسالیب بیان،تین شاعر،ہندوستانی لسانیات،سرگزشتِ حاتم[1]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے یورپ میں قیام کے دوران جدید اصول لسانیات سے واقفیت حاصل کی اور آریائی زبانوں ،اور تقابلی لسانیات اور اردو کی ساخت پر تحقیقات کے لیے ''اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز'' لندن میں پروفیسر آر،اِل،ٹرنر کے آریائی لسانیات پر لیکچر سنے اور بحث میں حصہ لیا۔اس کے علاوہ اردو زبان کی ساخت اور ارتقا کے حوالے سے بھی استفادہ کیا۔

پروفیسر آر،اِل،ٹرنر اور ڈاکٹر گراہم بیلی کی رہنمائی میں انھوں نے تحقیقی ولسانی مقالہ لکھا

جس کا ایک حصہ ''ہندوستانی صوتیات'' میں شائع ہوا اور پھر وہ دوبارہ اصلاح اور ترمیم کے بعد ''ہندوستانی لسانیات'' میں شائع کیا گیا۔

صدر شعبہ صوتیات پروفیسر لائڈ جیمس کے لیکچروں میں شامل رہے اور ان کی مدد سے انگریزی صوتیات کی تعلیم کے لیے یونیورسٹی کالج لندن کے شعبہ صوتیات میں بھی رہنمائی حاصل رہی۔

پیرس میں قیام کے دوران انھیں سوربون یونیورسٹی کے ادارۂ صوتیات میں مدموزیل دیرانگی وجہ سے تجرباتی صوتیات سے واقفیت حاصل ہوئی۔ اس حوالے سے انھیں پروفیسر شرامک (پروفیسر صوتیات، کالج دے فرانس) سے بھی رہنمائی ملی۔ پیرس میں ''قومی مدرسۂ السنہ مشرقیہ'' میں ڈاکٹر جیولس بلوک (رکن ادارۂ تحقیقات عالیہ، پیرس یونیورسٹی) کے جپسی زبانوں کے حوالے سے لیکچروں سے بھی انھوں نے استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ پیرس میں انھوں نے پروفیسر واندرئیس، پروفیسر بن وے نست، پروفیسر مسی یوں اور پروفیسر سِلون لیوی سے بھی رہنمائی اور مشورے لیے۔

یورپ سے واپسی پر انھوں نے لسانیات کے حوالے سے یہ کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' مکمل کی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس کتاب میں ہندی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ہندی اُردو کی اُس جدید ترین شاخ کا نام ہے جو فورٹ ولیم کالج کے قیام (انیسویں صدی کے آغاز) کے بعد ناگری رسم الخط میں لکھی جانے لگی ہے اور جس پر فارسی اور عربی کی جگہ برج بھاشا اور سنسکرت کا اثر زیادہ ہے۔ برج بھاشا وہ زبان ہے جو مسلمانوں کی فتح دہلی کے وقت سرزمین برج میں شعروشاعری کے لیے مستعمل ہے اور جس کی تقلید روز بروز ہندی کو اُردو سے جدا کرتی جارہی ہے۔''(۲)

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ حصہ اول میں لسانیات، زبان، فطری ارتقا، ارادی تشکیل، دنیا کی زبانیں، ہند آریائی ارتقا، جدید ہند آریائی زبانیں، ہند کی غیر آریائی زبانیں جیسے موضوعات شامل ہیں۔ جبکہ دوسرے حصے میں ہندوستانی کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بولیوں اور ہندی اُردو جھگڑا پر سیر حاصل بات کی گئی ہے۔

وہ اپنی کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' میں تاریخی لسانیات اور اردو زبان کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ لفظ اپنی پیدائش کے لحاظ سے انسان کا ایک خود اختیاری یا

روایتی اشارہ ہے جس سے واقف ہوتے ہی کسی شخص کے ذہن میں وہی خیال یا خیالات رونما ہو جاتے ہیں جن کو وہ شخص عادتاً یا اشارتاً اس لفظ کے سننے کے بعد اپنے ذہن میں پیدا کرتا رہتا ہے۔"(۳)

لفظوں کی یہ لسانی خصوصیات میں شامل ہے کہ وہ موقع محل کی مناسبت سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں صوتی اعتبار سے بھی اور معنوی اعتبار سے بھی۔ لفظوں کے اس بدلاؤ میں خیالات کی تبدیلی بھی اس میں اہم کردار کی حامل ہے۔ ڈاکٹر زور لفظوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"الفاظ میں اس امر کا رجحان ہر وقت موجود رہتا ہے کہ وہ معاشرتی، فنی، عادتی شخصی اور قومی غرض ہر نئی فضا میں ایک نیا مفہوم واضح کریں۔ ایک ہی قسم کا معیار زندگی رکھنے والے کے یہاں ایک معنی دیتا ہے اور دوسرے کے یہاں دوسرے۔۔۔ اتارنا پر غور کیجئے:
چربہ اُتارنا، کپڑے اُتارنا، نقل اتارنا، تصویر اتارنا، دیوار اُتارنا، سواریاں اُتارنا، قبر میں اُتارنا، بوجھ اُتارنا، چُھدا اُتارنا، رجسٹر میں نشان اُتارنا۔"(۴)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس کتاب کے دوسرے حصے میں ہند یورپی خاندان کی زندہ زبانوں کو آٹھ شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ ہندایرانی یا آریائی، ۲۔ ارمنی، ۳۔ بلقان سلانی، ۴۔ البانوی،
۵۔ ہیلینی، ۶۔ اتالوی، ۷۔ کیلٹک، ۸۔ ٹیوٹونی

ٹیوٹونی میں جرمن اور انگریزی زبانیں شامل ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ حسن اختر ملک، تاریخ ادب اردو، لاہور یونورسٹی بک ڈپو، ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۳۱

۲۔ تمہید، ہندوستانی لسانیات، ص ۱۰،۱۱

۳۔ محی الدین قادری زور، سید، ڈاکٹر، ہندوستانی لسانیات، لاہور، مکتبہ معین الادب ۱۹۵۰ء،، ص ۳۰

۴۔ ایضاً

ڈاکٹر شوکت سبزواری

ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو میں ابتدائی ماہرین لسانیات میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اردو میں لسانیات کے حوالے سے قابلِ قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔انھوں نے کئی حوالے سے اردو میں لسانیات کا دامن وسیع کیا ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۹۰۸ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء میں کراچی میں اُن کا انتقال ہوا۔انھوں نے لسانیات اور خاص طور پر اردو لسانیات کے حوالے سے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ان کا مقالہ ''اردو زبان کا ارتقا'' ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔۱۹۶۰ء میں ان کی دوسری کتاب ''داستان زبان اردو شائع ہوئی اور ۱۹۶۶ء میں تیسری کتاب ''اردو لسانیات'' سامنے آئی۔ان کی ایک اور کتاب ''لسانی مسائل'' بھی لسانیات کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔

ان کے نزدیک اردو اور پالی دونوں زبانوں کا ایک ہی ماخذ ہے۔ان کے خیال میں اردو کھڑی یا ویدک بولیوں سے تعلق رکھتی ہے۔اپنی کتاب ''اردو زبان کا ارتقا'' میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر شوکت سبزاواری کے بقول پالی ادبی زبان تھی جبکہ ہندوستانی عوام کی زبان، پالی تو ایک مقام پر جا کر رک گئی مگر ہندوستانی عوامی زبان ہونے کی وجہ سے آگے بڑھتی رہی۔ اور اس کی تراش خراش ہوتی رہی۔''(۱)

وہ بھی اردو کے ارتقا اور مولد کے حوالے سے دہلی کے ارد گرد بولے جانے والی زبانوں کو اہمیت دیتے ہیں اور اس میں کھڑی بولی کا کردار مرکزی ہے۔

''اردو کھڑی بولی سے ترقی پا کر بنی جس کی بابت عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ دہلی اور میرٹھ کی نواح میں بولی جاتی تھی۔''(۲)

اردو کو دہلی اور مضافات دہلی کی زبان کی زبان قرار دینے والوں میں شوکت سبزواری تنہا نہیں بلکہ اس حوالے سے رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، شیام سندر داس، حامد حسن قادری، ڈاکٹر گیان چند سب گھوم پھر کر اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ اردو دہلی اور اس کے نواح میں بولے جانے والی زبانوں سے تعلّق رکھتی ہے۔

ان کے خیال میں آریا جب اس سرزمین پر آئے تو وہ ہند آریائی زبان بولتے تھے جو کچھ عرصہ بعد سنسکرت (شستہ) کہلانے لگی۔ جب سنسکرت میں صرفی اور صوتی تغیّر پیدا ہوا تو پھر یہ پراکرت کا روپ اختیار کر گئی اور پالی نے جنم لیا۔ پالی سے شورسینی، ماگدھی، مہاراشٹری اردنا گدھی پیدا ہوئیں۔ ہر پراکرت اپنی جگہ اپ بھرنش کے روپ میں سامنے آئی اور اردو بھی انھیں اپ بھرنش زبانوں سے پیدا ہوئی۔ انھوں نے پالی کو مغربی ہندی کی مورث اعلیٰ کہا۔ اور اسی مغربی ہندی سے اردو نے جنم لیا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کو ایک مخلوط زبان قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں شمالی ہندوستان کی تمام بولیوں کے علاوہ عربی فارسی، ترکی تیلگو زبان کے الفاظ بھی ہیں۔''(۳)

ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو زبان کے ارتقا کے بارے میں بات کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اردو میں عربی، ترکی، فارسی، تیلگو، پُرتگالی، انگریزی، گجراتی اور فرانسیسی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں جو کہ الگ الگ لسانی خاندانوں سے تعلّق رکھتی ہیں۔ فارسی ہند ایرانی، ترکی تورانی قبیلے سے اور تیلگو دراوڑی خاندان سے تعلّق رکھتی ہیں اسی طرح انگریزی، فرانسیسی لاطینی زبانیں ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے زبانوں کی بانٹ یوں کی ہے:

(ا) پیشاچی یا دردی زمرہ۔ کشمیری۔ کوہستانی (پشتو وغیرہ) لہندا۔ سندھی

(ب) شورسینی زمرہ۔ مغربی ہندی۔ راجستھانی۔ پنجابی۔ گجراتی۔ پہاڑی۔

(ج) ماگدھی زمرہ۔ بنا گلی۔ آسامی۔ بہاری۔ اڑیا۔ مرہٹی۔ (۴)

اس پر گریرسن کی چھاپ دکھائی دیتی ہے، جتنے بھی ماہرین لسانیات نے زبانوں کے کاندان بنائے ہیں وہ سبھی کسی نہ کسی حد تک گریرسن کے بنائے گئے زبانوں کے گروہوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس مقالے میں اردو کے حوالے سے لسانیات کے کئی دروازے کھولے، کئی لوگوں نے ان کے نظریات وخیالات سے استفادہ کیا۔ان کی دوسری تصنیف ''داستان زبان اردو'' دسمبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی جسے ترقی اردو بورڈ نے کراچی سے شائع کیا۔۱۹۶۶ء میں ان کی کتاب ''اردو لسانیات شائع ہوئی اس میں زبان کے ارتقا، ابتدا، زبان اور زبان کی اقسام، لسانیات اور لسانیات کی شاخوں پر بات کی گئی ہے۔ان کے خیال میں لسانیات اور تاریخ کا گہرا تعلق ہے۔اس کتاب میں انھوں نے گزشتہ کتاب کے موضوع کو دہرایا بھی ہے۔کہیں کہیں تکرار بھی نظر آتی ہے۔مگر یہ تکرار ارتقا کے عمل سے بھی ہم آہنگ ہے۔

اردو لسانیات میں زبان کی اقسام اور لسانیات کی شاخوں پر بحث کی گئی ہے۔لسانیات اور رسم الخط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''لسانیات کا رسم تحریر سے بھی قریبی تعلق ہے اس لیے ''اردو لسانیات'' میں اردو کی بعض اصوات کے پہلو بہ پہلو ان کی اشکال وعلامات بھی زیر بحث آتی ہیں۔''(۵)

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنے نظریے کے حق میں تاریخ کے حوالے دے کر کئی دلائل پیش کیے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں اردو، دہلی اور اس کے نواحی علاقے میرٹھ میں بولی جارہی تھی۔محمد غوری کے انتقال کے بعد ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک دہلی کے تخت پر بیٹھا۔میرا خیال ہے اس سے پہلے اردو ابھر کر برج، قنوجی، بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز حاصل کر کے پختہ اور آزاد بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔اس امتیاز کے بعد اردو کو اہلِ علم نے کھڑی بولی کے نام سے یاد کیا۔اس کی ہمسر بولیاں پڑی کہلائیں۔''(۶)

ڈاکٹر شوکت سبزواری شورسینی سے اردو کا نکاس نہیں مانتے وہ اس کی جگہ اردو کو پالی کی بیٹی قرار دیتے ہیں۔پر یہ بات بھی ٹھیک نہیں ہے۔(۷)

زبانیں ہمیشہ دوسری زبانوں سے استفادہ کرتی رہتی ہیں۔کوئی زبان ایسی نہیں کہ جس

کے بارے میں کہا جا سکے اس نے کبھی کسی زبان سے استفادہ نہیں کیا۔ الفاظ اور تراکیب دوسری زبانوں سے مستعار نہیں لیے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

''اُردو نے جو الفاظ عربی سے مستعار لیے ان میں سے بیش تر متشابہ الصوت حروف اور متحد المخارج آوازوں کی ترکیب سے بنے ہیں۔ اہل اردو عموماً بولتے وقت ان آوازوں میں فرق نہیں کرتے اس لئے سننے والوں کو اسرار، 'اصرار'، یا 'علیم' 'الیم' وغیرہ یکساں الفاظ کے سمجھنے اور ان کے معانی تک رسائی حاصل کرنے میں خاصی قدت پیش آتی ہے۔ جو کبھی کبھی سیاق وسباق کی رہنمائی کے باوجود اشتباہ کا باعث بن جاتی ہے۔ یہ دقت سننے کی حد تک ہے۔''(۸)

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے جہان زبان اور اس کے ارتقا کے حوالے سے تحقیق ہے وہیں انھوں نے لسانیات پر بھی روشنی دالی ہے کہ زبان کے فروغ، ارتقا اور ترقی مین علمِ زبان کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔ وہ لسانیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''لسانیات زبان کی تنقید ہے اور اگر تنقید تخلیق ہے تو لسانیات کو بھی تخلیق کی ایک صنف قرار دینا ہوگا۔ مشہور ماہر لسانیات میکس مولر نے گرامر اور لسانیات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں ''کیا'' اور کیوں کا فرق ہے۔ گرامر کیا ہے اور لسانیات ''کیوں''۔''(۹)

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نام اُن ماہرینِ لسانیات میں شامل ہے جنھوں نے اُردو میں لسانیات کے مباحث کو راہ دی اور اُردو میں لسانیات کے حوالے سے گراں قدر کام کیا۔

حوالہ جات

۱۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو زبان کا ارتقا، ڈھاکہ، پاک کتاب گھر، ۱۹۵۶ء، ص ۸۷
۲۔ داستان زبان اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۰ء، ص ۹۷
۳۔ شوکت سبزواری، اردو زبان کا ارتقا، ص ۹۱
۴۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کا روپ، لاہور، آزاد بک ڈپو، ۱۹۷۱ء، ص ۴۳
۵۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، کراچی انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۶ء، ص ۸
۶۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، ص ۲۸
۷۔ اُردو کا روپ، ص ۵۶
۸۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ص ۴۲
۹۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، لسانی مسائل، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۲ء، ص ۱۴

ڈاکٹر گیان چند جین

گیان چند جین ۱۹۲۳ء میں یوپی ضلع بجنور کے شہر سیوہارہ میں پیدا ہوئے۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۷ء میں شاعری سے کیا وہ غافل تخلّص کرتے تھے۔ وہ جین حمیدیہ کالج بھوپال کے شعبہ اردو سے منسلک رہے اس کے علاوہ جموں، الہ آباد اور حیدر آباد دکن کی مختلف جامعات میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔اردو ادب کی تاریخیں، تحقیق کا فن ان کی مقبول کتابیں ہیں۔

۱۹۵۶ء میں جب وہ حمیدیہ کالج بھوپال میں تھے تو وہاں انھوں نے ایم اے اردو کا پروگرام شروع کیا۔ یہاں جو نصاب اپنایا گیا اس میں لسانیات کا ایک پیپر بھی تھا۔ ہندی میں چونکہ لسانیات کا نساب پہلے سے رائج تھا، انھوں نے وہاں سے لسانیات پڑھی اور خاص طور پر بھولا ناتھ تیواڑی کی بھاشا وگیان انھیں زیادہ بہتر لگی، انھوں نے ارادہ کرلیا کہ اردو میں وہ جلد لسانیات کی کتاب کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔انھوں نے مختلف کتابیں پڑھیں مگر تشفّی نہ ہوئی۔۱۹۶۱ء میں ساگر میں منعقدہ سمر اسکولِ لسانیات میں حاضری دی۔اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں اسکولِ لسانیات میں سبق پڑھا۔لسانیات کے مباحث کے حوالے سے اساتذہ سے تبادلہ خیال کیا۔اور ۱۹۶۱ء، یا ۱۹۶۲ء میں عام لسانیات کی کتاب لکھنے کا آغاز کردیا۔ چند ابواب ہی لکھے تھے

گیا۔ مختلف لوگوں کو مختلف کتابیں لکھنے کے لیے دی گئیں۔ ''عام لسانیات'' لکھنے کی ذمہ داری خود گیان چند نے لے لی۔ وہ اپنی اس کتاب کو تصنیف نہیں بلکہ تالیف قرار دیتے ہیں کہ انھوں نے مختلف کتابیں پڑھیں اور یہ کتاب لکھ دی۔ اس کتاب میں انھیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پروفیسر اردو جامعہ ملیہ اور ڈاکٹر پرجاپتی پرساد ریڈر انگریزی جموں یونیورسٹی کا تعاون بھی حاصل رہا۔ ڈاکٹر جگدیو سندھ، ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ڈاکٹر مسعود حسین خان نے بھی اس کتاب کے سلسلے میں اُن سے مکمّل تعاون کیا۔ (۱)

یہ کتاب چوبیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب کی ترتیب درج ذیل ہے: ان چوبیس ابواب میں درج ذیل موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

زبان، علم زبان کی شاخیں، صوتیات، فونیمیات، صرف ونحو، معنیات، تقابلی اور تاریخی طریقے، صوتی قوانین، علم اللغات اور لفظ اصلیات، لسانی جغرافیہ، لسانیات کی شاخیں، ترسیمیات، زبانوں کی نوعیاتی گروہ بندی، زبانوں کی خاندانی گروہ بندی، علمِ زبان کے مطالعے کی تاریخ۔

عام لسانیات کے علاوہ اردو کی نثری داستانیں، تحقیق کا فن، ان کے مشہور کتابیں ہیں۔

عام لسانیات اُن کا لسانیات کے حوالے سے ایک مبسوط کام ہے اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب معلوماتی بھی ہے اور لسانی اہمیت کی حامل بھی۔ ایک عرصہ سے اردو زبان میں لسانیاتی مباحث اور لسانیات کے بارے میں مواد کی کمی کو محسوس کیا جارہا تھا جسے اس کتاب کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کتاب انھوں نے اسی مقصد کے تحت لکھی ہے کہ اُردو کا دامن بھی لسانیاتی مواد کے حوالے سے خالی نہ رہے۔

''عام لسانیات'' ڈاکٹر گیان چند کا ایک اہم کام ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ وہ لسانی کتاب ہے جس میں انھوں نے زبان اور لسانیات کے حوالے سے معلومات، تعریفات اور مختلف حقائق بیان کیے ہیں۔

''ایک بھاشا دو لکھاوٹ'' ان کی متنازعہ کتاب ہے۔ جسے تعصّب کی حامل کتاب قرار دیا جاتا ہے۔ انھوں نے ۱۸/اگست ۲۰۰۷ء کو امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر پورٹی ویل میں وفات پائی جہاں وہ تقریباً دس سال سے مقیم تھے۔ (۲) ایک بھاشا دو لکھاوٹ میں گیان چند نے لکھا تھا:

''دراصل اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں۔'' اردو ادب اور ہندی ادب دو

آزاد ادب ہیں لیکن اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں ہیں۔" دخیل الفاظ سے زبان کو تعین نہیں ہوتا۔ رسم الخط کا فرق بھی اسی طرح ایک زبان کے دو حصے نہیں کر سکتا۔"(۳)

گیان چند کی یہ کتاب "ایک بھاشا دو لکھاوٹ" سترہ ابواب پر مشتمل ہے۔ گیان چند کی اس کتاب میں اردو، مسلمانوں اور اسلامی تہذیب وثقافت سے متعلق نفرت بھرا لہجہ جھلکتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی سازش کے تحت یہ کتاب لکھی گئی ہو۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی دو بھاشا ایک لکھاوٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اردو تحقیق کا ایک بڑا نام گیان چند ہے۔ پروفیسر گیان چند ساری زندگی اردو کی کمائی کھاتے رہے۔ لیکچرر، ریڈر، اور پروفیسر کے عہدہ پر پہنچے۔ کئی یونیورسٹیوں میں صدر شعبہ اردو رہے۔"(۴)

اسے اردو طبقے نے بالکل پسند نہیں کیا، اور اسے من گھڑت قرار دے کر اسے اردو دشمنی کا شاخصانہ قرار دیا گیا ہے۔

"تین سو سے زیادہ صفحے کی اس کتاب میں گیان چند نے جھوٹ کا من گھڑت پلندہ بکھیرا ہے۔"(۵)

اس کتاب کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"اس کتاب کا طرز بیان اور طریق کار غیر علمی اور مناظرانہ ہے۔"(۶)

مرزا خلیل احمد بیگ نے ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب کے جواب میں "ایک بھاشا جو مسترد کر دی گئی" تحریر کی۔ اس کتاب میں انھوں نے گیان چند کے اعتراضات اور الزامات کا جواب دیا ہے۔ یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ گیان چند کی ایک اور کتاب شخصیات ومشاہدات: ۲۰۰۰ء میں، فضلی سنز کراچی سے شائع ہوئی۔

اس کتاب میں دو حصے بنائے گئے ہیں۔ شخصیات کے حصے میں مالک رام، سید مسعود حسن رضوی ادیب، فراق، سید اعجاز حسین، کرشن چندر، آل احمد سرور، احتشام حسین، اپندر ناتھ اشک، عبید عرب، سیماب اکبر آبادی، رام لعل، پرکاش مونس، حکیم پدم سین، کالی داس گپتا رضا، عقیل صاحب شامل ہیں۔ مشاہدات میں مختلف مضامین دیے گئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عرض مصنف، از گیان چند، مشمولہ، عام لسانیات، دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳ء، دوسرا ایڈیشن، ص ۱۲۔۱۴

۲۔ اخبار اردو اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۷ء، ص ۸۵

۳۔ بحوالہ ڈاکٹر سید تقی عابدی، اردو رسم الخط، اخبار اردو، جون ۲۰۰۹ء، ص ۲۵

۴۔ ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' گیان چند جین کی اردو سے غداری، اخبار اردو اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۴

۵۔ ایضاً ص ۲۵

۶۔ ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب، اخبار اردو جون ۲۰۰۶ء، ص ۴۴

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور اسلوبیات

انسان اور معاشرے کا گہرا تعلق ہے۔ انسان زبان، بول چال اور گفتگو کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ زبان جس انداز میں انسانی فکر کو پیش کرتی ہے اس کا تعلق اسلوب سے ہے۔ جب ہم اسلوب کو زبان کے ساتھ ساتھ علم زبان سے منسلک کر دیتے ہیں تو ایسا مطالعہ اسلوبیاتی مطالعہ کہلاتا ہے۔ شخصیت کو جتنا بھی چھپایا جائے، بول چال اور انداز گفتگو اسے سامنے لے آتی ہے۔ لب ولہجہ اور الفاظ کا استعمال اسلوب کی تشکیل میں بنیادی کردار کا حامل ہوتا ہے۔ اسلوبیاتی مطالعہ کے حوالے سے بیلی اور رومن جیکب سن کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ جنھوں نے فنکار کی اسلوبی خصوصیات اور اس کے اظہار کے ذریعوں کے مطالعے کی بنیاد رکھی۔

اردو زبان میں اسلوبیاتی مطالعوں کے حوالے سے گوپی چند نارنگ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ گوپی چند نارنگ یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو بلوچستان کے ایک مقام دُکّی میں پیدا ہوئے۔ ان کا کام متنوع نوعیت کا ہے۔ ابتدائی کام میں اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو، اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی سے ان کا سفر شروع ہوا۔ جو آگے بڑھتے بڑھتے ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، جدیدیت کے بعد، اقبال کا فن، ادبی تنقید اور اسلوبیات، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، امیر خسرو کا ہندوی کا کلام تک جا پہنچا۔

ڈاکٹر گوپی چند کا نام اردو زبان وادب میں خاصا مقبول و معروف ہے۔ انھوں نے اردو کے قدیم اور جدید ادبی خزانوں کے حوالے سے خاصا ضخیم کام کیا ہے۔ لسانیات ہو یا اسلوبیات، ساختیات ہو یا پس ساختیات، جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت، شعریات ہو یا ثقافت وسماجیات، املا کے مسائل ہوں یا لغات کے، تاریخیت ہو یا نو تاریخیت، تعلیم و تدریس ہو یا صوتیات و معنیات، ادب ہو یا اصناف سخن غرضیکہ انھوں نے ہر حوالے سے مبسوط کام کیا ہے۔

''گوپی چند نارنگ کی تصانیف علمی و ادبی کاموں میں بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔''(۱) اردو میں ان کا کام خاصا وسعت پذیر ہے، ان کی کتاب ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' میں مغربی فکر کے حوالے سے مواد دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو ساختیات، پس ساختیات، اسلوبیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور جدیدیت کے بعد جیسے مباحث دے کر اردو زبان کے کینوس کو وسیع کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جدید و قدیم ادبی روایت پر گہری نظر رکھنے والے نقاد اور دانشور ہیں۔ انھوں نے ادب کا تجزیہ روایتی تجزیوں سے ہٹ کر نئے عصری حالات اور ثقافتی اشارات اور اسلوبیات کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تنقید کا انداز پہلے سے رائج ادبی تنقید سے ذرا مختلف ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''وہ قدیم وجدید اور مغرب و مشرق، دونوں کی ادبی روایات اور ان کی نظریاتی و ثقافتی اساس سے آشنا ہیں اور یہ اسی آشنائی کا کرشمہ ہے کہ ان کی ادبی تحریریں اپنے اندر ایک ایسا جہانِ معنی رکھتی ہیں جو ادب کے عام و خاص قاری، دونوں کے لیے یکساں جاذب نظر و دامن کش ہے۔''(۲)

گوپی چند نارنگ نے نئی ادبی صورت حال کا ثقافتی پس منظر میں جو تجزیہ لیا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ نارنگ نے ادب کو ثقافتی پس منظر میں جس طرح پیش کیا ہے اس سے صورت حال واضح ہوتی نظر آتی ہے کہ ثقافت کس طرح ادب کو متاثر کرتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے اپنا کوئی نظریہ پیش نہیں کیا بلکہ لسانی اسلوبیاتی اور ساختیاتی اور پس ساختیاتی نظریات کو اردو میں تعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

''نارنگ نظریہ ساز تو نہیں لیکن ان کا ذخیرۂ علم بہت وسیع اور تنقیدی بصیرت بہت گہری

ہے۔"(۳)

گوپی چند نارنگ کے ہاں اصطلاحات تو پیچیدہ ہیں مگر ان کا سلوب سادہ اور قدرے واضح ہے۔انتظار حسین ان کے اسلوب پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ جو سوچتے ہیں صاف صاف اپنی روشن نثر کے ذریعے پڑھنے والے کے دل میں اتار دیتے ہیں۔"(۴)

بعض مضامین میں گوپی چند نارنگ صوتیات، لسانیات اور اسلوبیات کی بھول بھلیوں میں الجھ گئے ہیں، بعض مضامین میں انھوں نے سماجیات اور ثقافت کو اہمیت دی ہے۔شاعری پر تنقید کرتے ہوئے وہ لفظیات، معنیات، ساختیات، تراکیب، استعارات اور علامتوں سے مدد حاصل کرتے نظر آتے ہیں۔سحر انصاری گوپی چند کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ ادب کا مطالعہ کرتے وقت اسلوب اور معانی کا مطالعہ الگ الگ نہیں کرتے انھوں نے اسلوبیات کو ادبی تنقید میں ضم کر کے پیش کیا ہے اور اسے جامع اسلوبیات کا نام دیا ہے۔"(۵)

گوپی چند نارنگ نے فکشن کے حوالے سے قلم اٹھایا تو اس بارے میں کئی مضامین لکھ دیے۔انھوں نے سعادت حسن منٹو، بیدی، بلونت سنگھ، انتظار حسین، بلراج مینرا، سریندر پرکاش جیسے افسانہ نگاروں کے فن کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔وہ اپنے تنقیدی مضامین میں مفہوم کے امکانات کو وسیع کرنے کے فن سے واقف ہیں۔وہ فن پارے کے تخلیقی عمل کو تجزیے میں سامنے رکھتے ہیں۔ پروفیسر صادق لکھتے ہیں:

"گوپی چند نارنگ بنیادی طور پر فکشن ہی کے نقاد ہیں مگر بعد ازاں لسانیات کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔لسانیات سے ایک ربط خاص ہونے کے باوجود انھوں نے فکشن کی تنقید سے منہ نہیں موڑا۔"(۶)

جدید اور مابعد جدید رویوں نے ان کے ذہن کو کشادہ بنادیا ہے۔ ان کی نظر تمام ادبی صورتِ حال پر ہے۔ان کی تنقیدی بصیرت وسعت پذیر ہے۔سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے تنقیدی فیصلوں میں تعصّب کے بجائے غیر جانبداری سے کام لیتے ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"آپ ادب کا مطالعہ غیر مشروط ذہن سے کرتے ہیں۔ادب سے یہ تقاضا نہیں کرتے کہ

وہ آپ ہی کے معتقدات اور تصورات کی ترجمانی کرے۔"(۷)

لسانیات اور اسلوبیات اپنی جگہ اپنی جگہ زبان کے اہم شعبے ہیں۔لسانیات کا علم ہمیں نہ صرف لفظیات، معنیات اور ان کی مختلف پرتوں سے آگاہ کرتا ہے بلکہ یہ صوتیات کے حوالے سے بھی معلومات فراہم کرتا ہے۔کسی بھی فن پارے کو پرکھنے کے لیے میں الفاظ وتراکیب ، استعارات وتشبیہات، علامات و رموز اور لسانی اشارات کا جاننا ضروری ہے۔مگر لسانی و اسلوبیاتی تجزیہ فن پارے کو صرف ایک پہلو ہی سے سامنے لاتا ہے۔ فضیل جعفری لکھتے ہیں:

"میں لسانیات اور اسلوبیات کی افادیت سے یکسر انکار نہیں کرتا میں صرف یہ کہتا ہوں کہ ان چیزوں سے ادب کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے کا کام لینا چاہیے لیکن ادب کو ان کے کٹھرے میں بند کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر نارنگ نے اسلوبیاتی طرز تنقید کی زبردست نظریاتی مدافعت کرنے کے باوجود اس طریقِ کار کو اپنے چند مضامین تک ہی محدود رکھا ہے۔"(۸)

گوپی چند نارنگ نے افسانے کی تنقید میں دوسرے بہت سے ناقدین کی طرح شاعری کے پیمانوں کی مدد سے تجزیہ نہیں کیا بلکہ افسانے کو افسانے ہی کے پیمانے پر پرکھا ہے۔ پروفیسر صادق لکھتے ہیں:

"ان کے خیال کے مطابق افسانے کا نہ تو کوئی ایک اسلوب ہے اور نہ کوئی ایک تکنیک، ہر کہانی اپنی تکنیک آپ لے کر وجود میں آتی ہے۔کہانی کار کو نہ تو کردار سے کد ہونی چاہیے اور نہ حقیقت کے عام یا خاص مفہوم سے۔"(۹)

گوپی چند نارنگ نے اردو میں جس طرح نئی تھیوری اور فلسفے کو روشناس کرایا ہے، اس سے اردو کے لفظی اور ادبی ذخیرے میں اضافہ ہوا ہے۔

پروفیسر صادق کے خیال میں جدیدیت کی تحریک کو پروان چڑھانے میں اور اسے استحکام بخشنے میں نارنگ صاحب کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔(۱۰)

ان کی تحریر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جب کسی علمی و ادبی شخصیت یا فن پارے پر گفتگو کرتے ہیں تو تجزیاتی اسلوب کو پیش نظر رکھتے ہیں۔اس انداز نظر کے سبب سارے محاسن برجستگی اور بے ساختگی کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔(۱۱) اس حوالے سے انھوں نے میر، انیس، اقبال،

بیدی، منٹو کے فن کا جس طرح انھوں نے اسلوبیاتی تجزیہ پیش کیا ہے اس سے ان کے اسلوبی خصائص کا پتہ چلتا ہے۔ شبنم عشائی لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ نارنگ صاحب کی نظریاتی اور عملی تنقید نے نہ صرف اردو ادب بلکہ The fhilosofhy of Literature کے وہ سربستہ راز منکشف کیے ہیں جن کی وجہ سے اردو ادب کو ایک نئی توانائی ملی ہے۔''(۱۲)

گوپی چند نارنگ وہبی صلاحیتوں کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ ''اکتسابیات'' کے قائل ہیں۔(۱۳)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ استعاراتی اور کنایاتی اسلوبِ نگارش کو پسند کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی فن پارے کا اسلوبیاتی تجزیہ کرتے وقت اس فن پارے کو ہم عصر تہذیب اور ثقافت واساطیر کے حوالے سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے تجزیاتی ذہن کو دیکھتے ہوئے ہم ان کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنی تنقید میں تجزیاتی مطالعوں کو رواج دیا ہے اور اس میں اسلوب، استعارات، تلمیحات، علامات، مکالمات، کے ساتھ ساتھ مخصوص صورتِ حال کو بھی مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ان کی تنقید وتشریح میں معنویت کی کئی پرتیں کھلتی نظر آتی ہیں۔ کئی تنقیدی تحریروں میں انھوں نے عمرانی، سماجی اور انسانی مسائل کو بھی نشان زد کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حمید اللہ بھٹ، ڈاکٹر، پیش لفظ مشمولہ، ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات از گوپی چند نارنگ، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، بار سوم ۲۰۰۴ء، ص ۷

۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر نارنگ اپنی پہلی تصنیف کی روشنی میں فرمان فتح پوری، ڈاکٹر نارنگ اپنی پہلی تصنیف کی روشنی میں، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص ۲۰

۳۔ فضیل جعفری، گوپی چند نارنگ ایک اہم نقاد، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدت، ص ۳۵

۴۔ انتظار حسین، کیا مابعد جدیدیت بائیں بازو کے ساتھ ہے، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص ۲۸

۵۔ سحر انصاری ادبی تنقید اور اسلوبیات پر ایک نظر، مشمولہ افکار، کراچی، جولائی ۱۹۹۰ء، ص ۲۶

۶۔ صادق، پروفیسر، افسانے کی تنقید اور گوپی چند نارنگ، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص ۵۵

۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ میرا رقیب میرا دوست، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص ۳۳، ۳۴

۸۔ فضیل جعفری، گوپی چند نارنگ اہم نقاد، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدت، ص ۳۸

۹۔ صادق، پروفیسر، افسانے کی تنقید اور گوپی چند نارنگ، ص ۵۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۱۔ محمد ایوب واقف، علوم وفنون کا نادر خزینہ: گوپی چند نارنگ، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص ۷۳

۱۲۔ شبنم عشائی، گوپی چند نارنگ اور اطلاقی تنقید، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدت، ص ۸۶

۱۳۔ یوسف ناظم، ذکر گوپی چند نارنگ کا (خاکہ) مشمولہ افکار کراچی، نومبر ۱۹۹۶ء، ص ۳۵)

ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے اور ۲۰۱۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی پہچان، تنقید، تحقیق، شاعری، انشائیہ نگار اور ادبی صحافی کے طور پر ہے۔ انھوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' کے عنوان سے لکھا۔ ان کی تنقیدی تخلیقات میں اردو شاعری کا مزاج، تخلیقی عمل، تنقید اور احتساب، تنقید اور مجلسی تنقید، نئے تناظر، تنقید اور جدید اردو تنقید جیسی کتابیں شامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں لسانی حوالے بھی پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے ۷۰ کی دہائی میں ساختیات پر قلم اٹھایا اور مختلف لسانی مسائل پر بات کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا ہمارے عہد کے وہ نقاد ہیں جنھوں نے اردو تنقید اور لسانی موضوعات کو وسعت، گہرائی اور گیرائی بخشی ہے۔

''پچاس سال کی ادبی زندگی کو اسطرح متحرک رکھنا کہ ہر قدم پہلے قدم سے آگے کا قدم نظر آئے صرف نابغہ (Genius) حضرات کے ہاں ممکن ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا بلاشبہ ہمارے عہد کے نابغہ ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر وزیر آغا نے جہاں ادب پر تنقید کی اور تنقیدی نظریے قائم کرنے کی کوشش کی وہاں انھوں نے لسانی معاملات کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔ اس حوالے سے بھی ان کا کام لسانیات کے قارئین کے لیے ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت سے ان کے علمی و لسانی سرمائے میں موجود ہے۔

انھوں نے لکھتے وقت بطورِ خاص اپنے اسلوب میں قاری کو مدِنظر رکھا ہے۔اسی لیے انھوں نے آسان فہم انداز میں لسانی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی ہے اور وہ سامنے کی مثالوں سے قاری کے ذہن تک رسائی کے ہنر سے واقف ہیں۔ان کے اسلوب میں زبان و بیان کی نہ صرف چاشنی موجود ہے بلکہ شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک اہم تصنیف جس نے انھیں شہرت دلائی اور جس نے ان کے نظریات کو اہلِ فکر تک پہنچایا وہ ''اردو شاعری کا مزاج'' ہے۔ان کی یہ کتاب مئی ۱۹۶۵ء میں سامنے آئی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' کو ڈاکٹر انور سدید نے ارضی ثقافتی تحریک کی بوطیقا قرار دیا ہے۔[۲]

ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی کے مقدمۂ شعروشاعری کے بعد یہ اردو تنقید میں ایک اہم موڑ ہے۔اب سے پہلے اردو شاعری کو اصلاحی، رومانوی، قومی و سیاسی اور نفسیاتی حوالوں سے دیکھا اور جانچا جاتا رہا مگر ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کتاب میں اردو شاعری کا ثقافتی اور سماجی حوالوں سے جائزہ لیا۔اس حوالے پہلے انھوں نے برصغیر کی مختلف تہذیبوں، ان کے ارتقا اور کشمکش کا جائزہ لیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اس میں دراوڑی تہذیب سے اپنی بات کا آغاز کیا۔دراوڑی تہذیب کے جائزہ کے بعد آریائی تہذیب عجمی تہذیب، اسلامی تہذیب اور انگریزی تہذیب کی بات کی۔ انھوں نے ہندوستانی اور انگریزی تہذیب کے تصادم کا ذکر کرتے ہوئے انھیں تہذیبوں کی آمیزش میں اردو نظم کے خدوخال تلاش کیے۔انھوں نے اردو تنقید کو ہوا میں معلّق رہنے کے بجائے اس کو تخیلاتی فضا سے نکال کر اس کی جڑوں کو دھرتی کے ساتھ جوڑا اور اسے دھرتی کے لمس سے آشنا کیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اُردو اور یہاں کی بولیوں کا تعلّق آریائی کے بجائے دراوڑی زبانوں اور افریشیائی تہذیب اور موہنجوداڑو، ہڑپہ کی تہذیبوں کے ساتھ جوڑا ہے۔ان کے خیال میں آریاؤں کی آمد سے قبل سارا افریشیا ارضی تہذیبوں کا گہوارہ تھا جس میں فرد زمین سے وابستہ تھا اور زبان بھی رسم الخط سے وابستہ ہو چکی تھی۔اشوک کے کتبوں کا رسم الخط برہمی کے ساتھ ساتھ کھروشٹی میں بھی ملتا ہے جو کہ آرامی رسم الخط سے ماخوذ ہے اور کی جہت بھی دائیں سے بائیں جانب کو ہے۔[۳] اس وقت کی تمام لپیاں دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی تھیں۔آریاؤں کی آمد کے بعد یہ جہت الٹی اور اس نے بائیں سے دائیں جانب والی جہت کو اپنایا۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایک نظریہ ساز قلم کار کی صورت میں سامنے آئے۔ انھوں نے تنقید میں تخلیقیت کو اہمیت دی اور نئے علو کا مطالعہ کر کے تنقید کو وسعت بخشی۔ محمد رفیع لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر وزیر آغا کو کثیر علوم سے شناسائی ہے۔ جن میں تاریخ ادبیات، تہذیب وثقافت، عصری رجحانات، اصنافِ ادب، سماجیات، لسانیات اور اقتصادیات وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔''(۴)

وہ مختلف علوم کے امتزاج سے امتزاجی تنقید کو بروئے کار لانے والے وہ نقاد ہیں جنھوں نے نئے تنقیدی منطقوں کو دریافت کیا۔ ان کے ہاں تنقید میں بیک وقت زبان، ادب، لسانیات، مذہب، سائنس اور زندگی کے مختلف رنگ اور ان رنگوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے جدید رویوں پر بھی بات کی ہے انھوں نے ساختیات اور ساختیاتی تنقید پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ وہ ساختیات کے تین دھاروں کی بات کرتے ہیں پہلے روسی ہیئت پسندوں کی تحریک کے زیر اثر، دوسرا انگلستان میں نئی تنقید کے زیرِ اثر اور تیسرا وہ جو امریکہ میں مقبول ہونے والی نئی تنقید کے حوالے سے عمل میں آیا۔(۵)

ساختیات ایک ایسا موضع اور ایک ایسی تھیوری ہے جسے مغرب میں فروغ حاصل ہوا اور اس کی جڑیں ساسر کے نظام نشانات پر رکھی گئیں۔ پہلے ہر تھیوری میں کسی نہ کسی ضابطے کو متعیّن کرنے یا کوئی نظام وضع کرنے پر زور دیا جاتا تھا مگر جدید تھیوری میں اس کی نفی کی گئی۔ اسے زبان کی ساخت کی وہ آگہی قرار دیا گیا جو متن کو معنی کے جبر سے آزاد کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''ساختیاتی تنقید اور اس کے بعد ساخت شکن تنقید، جو ان دنوں مغربی ادبیات میں موضوعِ بحث ہے، طبیعات کی متوازی پیش رفت سے متاثر ہوئی ہے، بالخصوص کوانٹم طبیعات نے ساختیات اور دیگر تنقیدی مکاتب کے لیے بنیادی نظریات مہیا کیے ہیں۔''(۶)

ڈاکٹر وزیر آغا نے ساختیات کو مزید وسیع منظرنامے میں پیش کیا۔ دیگر علوم کے ساتھ ساختیات کا تعلّق اور رابطے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ساختیات کا یہ نظریہ محض طبیعات تک محدود نہیں رہا۔ نفسیات، لسانیات، فلسفہ، علم الحیات، علم الانسان اور دیگر علوم میں بھی اسے خاصی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً لسانیات کے ضمن میں سوسیو (Saussure) نے کہا کہ عام گفتگو (یعنی parole) کے پسِ پشت زبان (یعنی

langue) بطور ایک سسٹم یا گرائمر موجود رہتی ہے۔ جس کے مطابق ہم گفتگو کرتے ہیں"۔(۷)

ڈاکٹر وزیر آغا ساختیے کو واحد نہیں مانتے بلکہ اسے دوئی کا حامل قرار دیتے ہیں۔ یہ دوئی آگے جا کر دریدا کے ہاں ردتشکیل کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ اس دوئی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ایک کی کوئی ساخت نہیں ہوتی لیکن جب ایک دو میں تقسیم ہوتا ہے اور دونوں حصے ایک دوسرے کے روبرو آجاتے ہیں تو ایک ایسا رشتہ ابھر آتا ہے جس سے لاتعداد نئے رشتے پھوٹ پڑتے ہیں۔ مثلاً جب ایک آئینے کے مقابل دوسرا آئینہ رکھ دیا جائے تو عکسوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جنم لے گا۔ اسی طرح ایک کے اندر دوئی کے جنم اور پھر اس کے دائرہ در دائرہ پھیلاؤ سے رشتوں کی ایک پوری دنیا آباد ہو جاتی ہے جسے ہم ساختیہ کا پیٹرن کہتے ہیں۔"(۸)

رولاں بارتھ کا نام ساختیات اور پس ساختیاتی فکر کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے رولاں بارتھ کے فکری نظام کے عنوان سے رولاں بارتھ کے ادب کے بارے میں خیالات کا احاطہ کیا ہے۔ وہ رولاں بارتھ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"دراصل رولاں بارت ایک نہایت خلاق شخصیت تھا۔ وہ جب کسی مسئلے پر اپنا نقطہ نظر پیش کر دیتا جس کے لیے وہ نئی اصطلاحات رائج کرنے کی کوشش کرتا۔"(۹)

ڈاکٹر وزیر آغا نے اس مقالے میں رولاں بارتھ کی لکھت (text) کے حوالے سے تقسیم پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے دو اقسام میں تقسیم کیا، ایک readly اور دوسری کو اُس نے writerly کا نام دیا۔ وہ مصنّف کے بارے میں شروع ہی سے کام کرتا رہا۔ ۱۹۶۰ء میں رولاں بارتھ نے دو قسم کے لکھاریوں کا ذکر کیا ایک کم درجے کا لکھاری اور دوسرا اعلیٰ درجے کا لکھاری مگر ۱۹۷۰ء تک پہنچتے پہنچتے ایک وقت آیا کہ وہ مصنّف کے وجود تک سے منکر ہو گیا۔ رولاں بارت کا ساختیات کا یہ تصور نطشے اور ہائیڈگر کے ساخت کے "مرکز آشنا" نظریے کی ضد تو تھا ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ کوانٹم طبیعات کے نظریے سے بھی متاثر تھا۔ اس میں ڈاکٹر وزیر آغا نے رولاں بارتھ کے ٹیکسٹ، کوڈ، سٹرکچر، ٹیکسٹ میں تغیّرات پر روشنی ڈالتے ہوئے رولاں بارتھ کے لکھت کے نظام کے حوالے سے وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"رولاں بارت کا فکری نظام ایک تثلیث پر استوار ہے۔ یہ تثلیث۔۔۔ "لکھاری، لکھت اور قاری" سے مرتب ہوئی ہے۔"(۱۰)

ڈاکٹر وزیر آغا نے اس مضمون میں مشکل اصطلاحات کے بجائے عام اور سادہ الفاظ میں رولاں بات کے نظریات کو پیش کیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون ''عصمت چغتائی کے نسوانی کردار'' میں عصمت چغتائی کے کرداروں کا ساختیات کے حوالے سے جائزہ لیا ہے۔

''عصمت کے ہاں باغی عورت کے پروٹو ٹائپ کا مختلف کرداروں میں ظہور پہلی ہی قرت میں محسوس ہونے لگتا ہے۔''(۱۱)

ہیرو کے حوالے سے ساختیاتی فکر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دراصل ساختیات نے اس ہیرو نما کردار کو قبول نہیں کیا جو مقرر اور متعیّن صفات کا نمائندہ ہے۔ اس کے مطابق فرد رشتوں کی ایک ایسی اکائی ہے جو بحرانی صورت حال میں اندر سے خالی ہو جاتی ہے یعنی اس کے اندر ایک ایسی space ابھر آتی ہے جس میں واقعات اور قوتیں جمع ہونے لگتی ہیں اور ایک طرح کی مہابھارت کا آغاز ہو جاتا ہے۔''(۱۲)

ڈاکٹر وزیر آغا کا تنقیدی اور لسانی کام کئی جہتوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنی کتابوں اور مضامین میں جس طرح لسانیات کو متعارف کرایا ہے ان کا یہ کام بنیادی نوعیت کا ہے۔ جو اردو تنقید اور لسانیات میں کام کرنے والوں کو مزید آگے بڑھنے اور نئی نئی دریافتوں کی طرف گامزن ہونے میں مد ثابت ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ سجاد نقوی، سید، مرتب، ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۵ء، ص ۵

۲۔ اُردو ادب کی تحریکیں، ص ۵۶۳

۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۷

۴۔ محمد رفیع از ہر، تنقیدات وزیر آغا کی تحقیقی جہات، مشمولہ دریافت اسلام آباد، شمارہ ۹ نمل یونیورسٹی اسلام آباد، ص ۵۳۲

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، لکھت لکھتی ہے لکھاری نہیں، مشمولہ ''معنی اور تناظر'' (مقالات)، سرگودھا، مکتبہ نردبان، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴۲

۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ساختیاتی فکر میں پراسراریت کے عناصر، مشمولہ ''معنی اور تناظر'' (مقالات)، سرگودھا، مکتبہ نردبان، ۱۹۹۸ء، ص ۳۰

۷۔ ساختیات اور سائنس از وزیر آغا، مشمولہ تنقیدی مضامین، مرتبہ سجاد نقوی، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۳۶

۸۔ ایضاً، ص ۲۳۷

۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، رولاں باتھ کا فکری نظام، ساختیات ایک تعارف۔ منتخب اردو مقالات، مرتبہ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، اسلام آباد، پورب اکادمی، ص ۹۴

۱۰۔ رولاں بارت کا فکری نظام، ص ۹۹

۱۱۔ وزیر آغا، عصمت چغتائی کے نسوانی کردار، مشمولہ، ساختیات ایک تعارف۔ مرتبہ، ص ۱۴۱

۱۲۔ ایضاً

فہیم اعظمی

فہیم اعظمی کا اصل نام سید باقر رضوی تھا۔ پیار سے انھیں گھر والے اور قریبی دوست دلارے میاں کہتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں چماوان، ضلع اعظم گڑھ، یوپی انڈیا میں پیدا ہوئے۔ تعلیم، اعظم گڑھ، الٰہ آباد، لاہور، کراچی میں حاصل کی۔ پاکستانی فضائیہ میں ملازمت کی۔ ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب میں مقیم رہے۔ ممتاز اردو نقاد اور استاد سجاد باقر رضوی (۱۹۹۵ء میں انتقال ہوا) ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ ناول نگار ہونے کے علاوہ اردو میں انھوں نے نئے ادبی اور فکری مباحث کو چھیڑا۔ ادبی جریدہ ''صریر'' کے مدیر بھی رہے۔ ان کا انتقال ۱۴ جنوری ۲۰۰۴ء میں کراچی میں انچولی فیڈرل بی ایریا میں ہوا۔

ان کی تصانیف میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں:

بہت دیر ہو چکی (ناول)

ڈسٹی نیشن مین ہول (ناول)

آرتمس کے پھول (کہانیاں)

شوقِ مفصّل (شاعری)

رائدین جدیدیت (شخصیات، نظریہ اور تنقید)

ڈاکٹر فہیم اعظمی نے ''صریر'' کراچی کے صفحات کو ساختیات کے لیے ہر وقت کشادہ رکھا۔ انھوں نے خود بھی ساختیات کے حوالے سے کئی گرانقدر مضامین تحریر کیے۔

''ساختیات، قرات، تنقید اور کوڈز'' کے عنوان سے ایک مضمون میں ڈاکٹر فہیم اعظمی نے زبان کی ساخت، معنی کی تکثیریت، ادب پارے کا قاری یا نقاد سے رشتہ، علامتی کوڈ، عمل اور رد عمل کا کوڈ، ثقافتی یا حوالہ جاتی کوڈ اور رولاں بارتھ کے نظام قرأت پر تفصیلی بات کی ہے۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی اس مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں:

''ساختیاتی مفکّرین کا خیال تھا کہ زبان خصوصاً ادبی زبان اتنی سادہ اور معصوم صفت نہیں ہوتی کہ اس کی ایک ہی جہت ہو اور اس کا ایک ہی مفہوم ہو۔ ہوسکتا ہے کہ لکھتے وقت مصنّف کا ارادہ ایک ہی معنی اور مطلب کو اپنے قارئین تک پہنچانا ہو لیکن جب کوئی ادب پارہ قاری تک پہنچتا ہے اور وہ اسے تنقیدی نگاہ سے پڑھنا چاہتا ہے تو اس میں بہت سے ایسے پہلو نظر آتے ہیں جن سے وہ مختلف معنی اخذ کر سکتا ہے، خصوصاً اس لیے عمومی طور پر مصنّف اور قاری میں کوئی روایتی ابلاغ کا رشتہ نہیں ہوتا بلکہ قاری ایک ایسا ادب پارہ پڑھتا ہے جس میں مصنّف بالکل غیر حاضر ہوتا ہے۔''(۱)

یہی مضمون ساختیات، قرات، تنقید اور کوڈز کے نام سے رسالہ (صریر کراچی، اگست ۱۹۹۶ء میں بھی شائع ہوا۔

اس مضمون میں فہیم اعظمی نے نشانیات کے اصولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ساختیات کو مختلف کوڈز کے حوالے سے بیان کیا ہے، اس حوالے سے تشریحی کوڈ، علامتی کوڈ، عمل اور رد عمل کا کوڈ، ثقافتی یا حوالہ جاتی کوڈ کی تشریح بھی کی ہے۔

فہیم اعظمی ''براؤننگ دی ڈاگ (اقبال فریدی) کا ساختیاتی مطالعہ'' میں بڑے خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ کتا جو وفاداری کے معنوں میں اور گھر کی حفاظت اور مالک کی رکھوالی کے لیے مشہور ہے، اس افسانے کے تناظر میں لفظ کتا کے بارے میں ان کے جملوں پر غور کیجیے:

''ان صفات کے باوجود لفظ کتا تو تضحیک کے طور پر خوشامدی اور بے حیا انسانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے میں کوڈز اور کنونشن کے تحت جو اخلاقیات مرتب ہوتی ہیں مثلاً وفاداری اور محبّت کے الفاظ، جب انسانوں کے لیے استعمال کیے

جاتے ہیں تو اس کے معنی ڈی کنسٹرکٹ ہو جاتے ہیں ۔۔۔ جب انسانوں کو کتا کہا جاتا ہے تو یہ مفروضہ ہوتا ہے کہ ایسے انسان میں خودداری یا انانیت جیسی کوئی چیز نہیں ہے، یا وہ کسی مادی یا روحانی مفاد کے تحت انسانوں کی وفاداری کے بجائے کتوں کی وفاداری کی صفت اپنا رہے ہیں۔‘‘(۲)

کہانی میں فہیم اعظمی نے سمبل، استعاروں، مجاز مرسل کا ذکر کر کے اس کی زبان کو معمولی بیانیہ سے ہٹ کر شعری زبان قرار دیا ہے۔ افسانے کے تفہیم کی کثیر المعنویت کا سراغ لگایا ہے جو کہ پس ساختیات کا خاص نقطہ ہے۔

ساختیات کے حوالے سے ڈاکٹر فہیم اعظمی کے درج ذیل مضامین شائع ہوئے:

ساختیاتی فکر کی ابتدا	صریر کراچی اکتوبر ۱۹۹۱ء
لسانیات اور ساختیاتی لسانیات	صریر کراچی دسمبر ۱۹۹۱ء
ساختیات اور جمالیات	صریر کراچی فروری ۱۹۹۲ء
ساختیات فہمی اور ساختیاتی تنقید	صریر کراچی جون، جولائی ۱۹۹۲ء
وزیر آغا کی غزل کا ساختیاتی مطالعہ	صریر کراچی ستمبر ۱۹۹۳ء
ساختیاتی تنقید: اقبال فریدی کا افسانہ ’’براؤننگ دی ڈاگ‘‘	صریر کراچی، جون جولائی ۱۹۹۴ء
قاری پر انحصار کتنا،	صریر کراچی اپریل ۱۹۹۵ء
ساختیات اور پس ساختیات، تحلیلی نفسیاتی تنقید،	صریر کراچی، مئی ۱۹۹۵ء

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ فہیم اعظمی: ساختیات، قرات، تنقید اور کوڈز، مشمولہ ساختیات ایک تعارف، مرتبہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر، اسلام آباد، پورب اکادمی، ص۱۰۳

۲۔ ایضاً، ص۱۶۰

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

ڈاکٹر محمد علی صدیقی انیسویں صدی میں اردو ادب اور تنقید کے حوالے سے ایک اہم نام ہے۔ وہ ۷ مارچ ۱۹۳۸ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ۲۰۱۲ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے جہاں تنقید کے مختلف زاویوں کو اجالا وہاں انھوں نے اُردو میں ابتدائی طور پر لسانی مباحث اور خاص کر ساختیات کو بھی روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

توازن، نشانات، مضامین، اشاریے، تلاش اقبال، سرسید احمد خان اور جدت پسندی، جہات، غالب اور آج کا شعور، جوش ملیح آبادی۔ ایک مطالعہ، کروشے کی سرگزشت اُن کی وہ کتابیں ہیں جن سے ان کے تنقیدی اور لسانی افکار کا سراغ ملتا ہے۔ وہ افکار کراچی کے مہمان مدیر کے طور پر فکر انگیز اداریے لکھتے رہے۔

وہ بنیادی طور پر ایک ترقی پسند نقاد کے طور پر ابھرے۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے ''توازن کی جہات'' کے عنوان سے ۲۰۰۷ء میں ان کے منتخب مضامین پر مشتمل ایک کتاب بھی ترتیب دی۔

اپنی کتاب ''نشانات'' میں ستر کی دہائی سے متعلّق وہ لسانی تشکیلات کے حوالے سے موجودہ دور کے فلسفہ کو ''تحلیلی'' فلسفہء لسان ہے قرار دیتے ہیں۔

وہ ''لسانی مباحث۔ انیسویں صدی تک'' کے عنوان سے لسانیات کو ایک نئے رخ سے

دیکھتے ہیں اور اسے سامراجی دور کا وہ حربہ قرار دیتے ہیں جس کے ذریعے نو آبادیاتی دور ایک عرصہ تک ہم پہ مسلّط رہا۔ اور یہ سب ان سامراجی قوتوں نے لسانیات کے بل بوتے پر کیا۔

''ایک امریکی ماہرِ سماجیات ونیس پیکارڈ کے نظریہ کے مطابق کسی ملک کی ثقافت ابلاغی انجینئرنگ (communication engineering کے) ذریعے چند برسوں میں تبدیل کی جاسکتی ہے۔ بالکل اسی طرح کسی زبان کے لسانی ڈھانچے سے اس زبان کے بولنے والوں کی ثقافتی گرامر اخذ کی جاسکتی ہے۔''(۱)

وہ جدید لسانی کردار کو سیاسی اور سماجی کردار کے حوالے سے پرکھتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں سے زبان، اس کے کردار، لسانیات اور اس کے مختلف فنکشنز کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان حقیقت یہ ہے کہ زبان ہر دور اور ہر زمانے میں خیالات اور محسوسات کے اظہار کا وسیلہ رہی ہے۔ اسے نشانات (sign) کا ایک سسٹم تسلیم کیا جائے یا اسماء اور افعال کے ساتھ ایک نحوی رشتہ کو ورتباط بخشنے کی سائنس ہر حالت مین زبان انسانی رویہ کی ایک جھلک ہے۔

''لسانیات، تنقید اور وٹ گن اسٹائن'' کے عنوان سے انھوں نے فریج کی تصنیف (۱۸۷۹ء) سے لے کر، سر ولیم جونس، میکس میولر، ڈبلیو دی کوائن، ڈونلڈ ڈیوڈسن مائیکل ڈسٹ اور وٹ گن اسٹائن کے اشاراتی (علامتی) نظام زبان کو موضوع بحث بنایا ہے۔

۱۹۷۶ء میں شائع ہونے والے اپنے مضمون ''اسٹرکچرل ازم اور لسانیات'' میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے ڈی ساسر کے علم نشانات سے لے کر ساختیات کی فکری جہتوں کا احاطہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اسٹرکچرل ازم لسانیات کے بانیوں میں ایڈمنڈ ہسرل اپنی مظہریات کے لیے، روڈولف کارنیپ اپنی منطق کے لیے اور آخری دور کے وٹ گن اسٹائن مثالی زبان کے بارے مین اپنے فلسفۂ لسان کے لیے اور کرداریت (Behaviourist) مکتبۂ خیال کی نفسیات کے چند علماء اپنے تار و پود کے لیے اہم کارگذاروں میں شمار ہوتے ہیں۔''(۲)

انھوں نے نوام چومسکی اور مروّجہ زبان کے علاوہ شاعری کی زبان پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی جدید تھیوریوں کے بارے میں اور خاص طور پر ساختیات اور پس ساختیات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''آخر ہم کب تک نئی زبان کے لایعنی مباحث کے گورکھ دھندوں میں الجھے رہیں

گے؟ یہ سوالات ہمارے پیش نظر رہنے چاہئیں ۔لطف تو یہ ہے کہ ہم جونہی لسانی تشکیلات کے گرداب سے نکلے، ساختیات اور پسِ ساختیات کے گرداب میں پھنس گئے۔"(۳)

وہ ان نظریات کو مسترد نظریات اور مباحث قرار دیتے ہوئے تیسری دنیا میں لنڈے بازاروں کے پرانے کپڑوں کے ساتھ آجانے والے وہ نظریات قرار دیتے ہیں جو کہ مسترد کر دیے گئے ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، نشانات، کراچی، ادارۂ عصرنو، مارچ ۱۹۸۱ء، ص ۹۰

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۳۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، جہات، کراچی، ارتقا مطبوعات، ۲۰۰۴، ص ۲۶

کتابیات

کتب

آل احمد سرور، پروفیسر، مجموعہ تنقیدات، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، س ن

احتشام حسین (مترجم) ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، از جان بیمز، لکھنؤ، ۱۹۳۷ء،

احتشام حسین، آغا سہیل، اردو لسانیات کا مختصر جائزہ، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز

احسان الحق، ڈاکٹر، اردو عربی کے لسانی رشتے، کراچی، قرطاس، ۲۰۰۵ء

احمد دہلوی، سید، علم اللسان، دفتر فرہنگ آصفیہ، ۱۸۹۵ء

اشفاق حسین، شیشوں کا مسیحا ___ فیض نئی دہلی، شاہد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱

اعجاز راہی (مرتب)، روداد سیمینار املا و رموز اوقاف کے مسائل، اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

انفضال حسین، قاضی، میر کی شعری لسانیات، دہلی، عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۵ء

اقتدار حسین، ڈاکٹر، اردو صرف و نحو، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۹۸ء

الٰہی بخش اختر اعوان، ڈاکٹر، کشاف اصطلاحاتِ لسانیات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء

انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۸ء

انیس ناگی، شعری لسانیات، لاہور، کتابیات، ۱۹۶۹ء

انیس ناگی، تنقید شعر، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

ایوب صابر، پروفیسر، اردو کی ابتدا کے بارے میں محققین کے نظریات، ایبٹ آباد، سرحد اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳

پریشان خٹک (مرتب)، لسانی رابطہ، اردو سندھی پشتو پنجابی اور بلوچی کے مشترک الفاظ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغۃ العربیہ (دار الہلال مصر

جواہر لال نہرو، میری کہانی (خودنوشت سوانح)، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۲ء

چرنجی لال، منشی،، رسالہ ''ہندوستانی فلولوجی''، طبع اول پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۸۸۶ء

سن اختر ملک، تاریخ ادب اردو، لاہور یونورسٹی بک ڈپو، ۱۹۷۹ء
لیل احمد بیگ مرزا، ڈاکٹر، (مرتب ومترجم) اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ از مسعود حسین خاں، علی گڑھ، شعبہ لسانیات مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۶ء
لیل احمد بیگ، اردو زبان کی تاریخ، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء
لیل صدیقی، زبان کیا ہے، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۸۹ء
یال بخاری، سید، ہمارے لسانی مسائل، لاہور، بساط ادب، ۱۹۸۷ء
امد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، مغرب سے نثری تراجم، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۸ء
یوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے، مترجمہ: ڈاکٹر نصیر احمد خاں، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۸ء
والفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد اول، حصہ اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء
والفقار، غلام حسین ڈاکٹر، پنجاب تحقیق کی روشنی میں، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء
رشید اختر ندوی، ارض پاکستان کی تاریخ، اسلام آباد
رشید حسن خاں، اُردو املا، لاہور، مجلس ترقی ادب
رشید حسن خاں، اردو کیسے لکھیں (صحیح املا)، لاہور، رابعہ بک ہاؤس
روبینہ ترین، ڈاکٹر، ملتان میں لسانی تشکیلات کا عمل اور دوسرے مضامین، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۴
زور، محمد قادری، سید، ارباب نثر اردو، حیدر آباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۲۷ء
زور، محی الدین قادری، سید ڈاکٹر، ہندوستانی لسانیات، لاہور، مکتبہ معین الادب ۱۹۵۰ء، طبع ثانی
سجاد نقوی (مرتب)، تنقیدی مضامین، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۵ء
سدھیشور ورما، آریائی زبانیں، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۶۰ء، باردوم
سر فرانسس ڈریو، The Jammu and Kashmir Territories، ایڈورڈ سٹیفورڈ لندن
سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
سلیمان ندوی، سید، نقوش سلیمانی، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۲۹ء
سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کا روپ، لاہور، آزاد بک ڈپو، ۱۹۷۱ء
سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی کہانی، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۵ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، لسانی مقالات، حصہ سوم، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی زبان، کراچی، فضلی سنز، ۱۹۹۷ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، لاہور، فضلی سنز، ۱۹۹۸ء

سہیل وحید، صحافتی زبان، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۸ء

شارب ردولوی، آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء

شان الحق حقی، نکتہ راز، کراچی، عصری کتب، ۱۹۷۲ء

شبیر حسن اختر، ملتان اردو کی جنم بھومی، ملتان، بزمِ ثقافت، ۲۰۰۵ء

شجاع ناموس، ڈاکٹر، گلگت اور شنا زبان، بہاولپور، اردو اکادمی، ۱۹۷۱ء

شرف الدین اصلاحی، اردو سندھی کے لسانی روابط، لاہور، نیشنل بک فاؤنڈیشن، باردوم، ۱۹۷۶ء

شکیل الرحمٰن، زبان اور کلچر، سرینگر کشمیر، شاہین بکسٹال، ۱۹۵۸ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو زبان کا ارتقا، ڈھاکہ، پاک کتاب گھر، ۱۹۵۶ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر، داستان زبان اردو، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۰ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر، لسانی مسائل، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۲ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، کراچی انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۶ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء

شیرانی، حافظ محمود، پنجاب میں اردو، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۲ء

شیما مجید (مرتب)، لسانی مذاکرات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء

صدیق کلیم، فکرِ سخن، لاہور، مجلس ترقی ادب، س ن

صفوان محمد چوہان، حافظ ڈاکٹر، اردو کے نئے، اہم اور بنیادی الفاظ، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۱۱ء

طارق عزیز، ڈاکٹر، اردو رسم الخط اور ٹائپ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۷ء

طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۸ء

عابد علی عابدؔ، سید، البدیع، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۵ء

عبادت بریلوی (مرتب)، خطبات عبدالحق،، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۶۴ء
عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ادب اور ادبی قدریں، لاہور، ادارۂ ادب وتنقید،۱۹۸۳ء
عبدالحق، مولوی، قواعد اردو، لاہور، سیوننھ سکائی پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء
عبدالرحمٰن براہوی، ڈاکٹر، براہوی زبان وادب کی مختصر تاریخ، لاہور، مرکزی اردو بورڈ،۱۹۸۲ء
علی اقبال، روشنی کم تپش زیادہ، کراچی، رائل بک کمپنی،۲۰۱۱ء،
علی جلال پوری، خردنامہ جلال پوری، لاہور، تخلیقات،۲۰۰۶ء
عین الحق فریدکوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور، اورئینٹ ریسرچ سنٹر طبع سوم ۱۹۸۸ء
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر (مرتب) اردو املا اور قواعد (مسائل ومباحث) اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۰
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو املا اور رسم الخط (اصول ومسائل)، لاہور، الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو زبان وادب، الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء
فہمیدہ بیگم، شعور زبان، نئی دہلی، موتی باغ،۱۹۹۰ء
قمر جمیل، جدید ادب کی سرحدیں، جلد دوم، کراچی، مکتبہ دریافت،۲۰۰۰ء
قیوم ملک، اردو میں عربی الفاظ کا تلفّظ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۹۵ء
کیفی، برجموہن دتاتریہ، منشورات، لاہور، مکتبہ معین الادب،۱۹۵۰
کیفی، پنڈت برجموہن دتاتریہ، کیفیہ
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو، دہلی، یونین پرنٹنگ پریس،۱۹۶۱ء
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ادبی تنقید اور اسلوبیات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ساختیات اور پس ساختیات اور مشرقی شعریات، دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو، بار سوم،۲۰۰۴ء
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، جدیدیت کے بعد، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، فراق گورکھپوری، شاعر نقاد اور دانشور، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اقبال کا فن، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء

گیان چند، عام لسانیات، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۳ء
گیان چند جین، ڈاکٹر، اردو کا اپنا عروض، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۱ء
محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، لسانیات زبان اور رسم الخط، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۲ء بار دوم
محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، حافظ محمود شیرانی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۱
محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، نشانات، کراچی، ادارۂ عصر نو، مارچ ۱۹۸۱ء
محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، جہات، کراچی، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء
محمد قاسم نوری، (مرتب) ہندوستانی زبان، لاہور، درد اکادمی، دوسری بار، ۱۹۶۹ء
محمد محمود رضوی مخمور آبادی، سید، اردو زبان اور اسالیب، جلد اول، کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
محمد مدنی عباسی، پشتو زبان و ادب کی تاریخ، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۹ء
محمد یوسف بخاری، ڈاکٹر سید، کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ، لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۸۲ء
محی الدین حسن، دلی کی بیگماتی زبان، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۲۰۱۲ء
مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو، لاہور، اردو مرکز، پہلا ایڈیشن، ۱۹۶۶ء
مسکین علی حجازی، صحافتی زبان، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء
مظفّر عباس، ڈاکٹر، اردو کی زندہ داستانیں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء
ممتاز حسین، نقدِ حرف، کراچی، اسلوب، ۱۹۸۵ء
منصف خان سحاب، نگارستان، لاہور، مکتبہ جمال، ۲۰۱۰ء
مہدی حسین ناصری، مخزن الفوائد، الہ آباد، مشن پریس، ۱۹۲۲ء
مہر عبدالحق، ڈاکٹر، ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلّق، بہاولپور، اردو اکیڈمی، ۱۹۶۷ء
ناصر عباس نیر، ڈاکٹر (مرتب)، ساختیات ایک تعارف۔ منتخب اردو مقالات، اسلام آباد، پورب اکادمی
نبی بخش خاں بلوچ، ڈاکٹر، سندھی بولی جی مختصر تاریخ، حیدر آباد سندھ، ۱۹۶۲ء
نوری، محمد فخر الحق، ڈاکٹر، مطالعۂ راشد (چند نئے زاویے) فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء
وارث سرہندی، زبان و بیان (لسانی مقالات)۔ اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء
وحیدہ نسیم، اردو زبان اور عورت، کراچی، غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۹۴ء
وزیر آغا، نئے تناظر، لاہور، آئنہ ادب، ۱۹۸۱ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور جدید اردو تنقید، کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۹ء
وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۳ء
وزیر آغا، ڈاکٹر، معنی اور تناظر (مقالات)، سرگودھا، مکتبہ نردبان، ۱۹۹۸ء

انگریزی کتب

C. L. Barber, The Story of Language, Cosmo Publications, New Dehli, 2007,
Charles F. Hockett., A course in modern Linguistics, the Macmillon company, New York 1967.
David E Cooper, Philosophy and the nature of the Language, Longmans Group Ltd. London, 1973.
Edwer sapir, Language, Harcourt Brace & Co, New york 1921,
James M Anderson, Strutural Aspects of Language change, Low Brydone Ltd. Thetford, New York, 1973.
John Lyons, Language and Linguistics, Cambridge University Press, Cambridge, 1981.
Jones, Daniel, The Phoneme ,W Heffar & sons Ltd. Cambridge England, 1967.
paul simpson,stylistics, routledge, London, 2004
Stephan Ullmann,The Principles of Semantics, Basil Black Well(Oxford, second edition),1957,
S.K. Chatterji, Indo-Aryan and Hindy,

لغات

اردو لغت تاریخی اصول پر جلد اول، کراچی، ترقی اردو بورڈ
شمس الرحمٰن فاروقی، لغات روزمرہ، کراچی، آج، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۹
منصف خان سحاب، نگارستان، لاہور، مکتبہ جمال، ۲۰۱۰ء

رسائل

اخبار اردو، اسلام آباد، ماہنامہ، اکتوبر ۲۰۰۰ء، دسمبر ۲۰۰۲ء، ستمبر ۲۰۰۳ء، جون ۲۰۰۶ء، ستمبر ۲۰۰۶ء، جولائی ۲۰۰۷ء، اکتوبر ۲۰۰۷ء، جون ۲۰۰۹ء، جون ۲۰۱۰ء، مئی ۲۰۱۰ء، ۲۰۱۴ء
ادب عالیہ، انٹرنیشنل، سہ ماہی، جنوری فروری مارچ ۲۰۰۵ء جلد ۵، شمارہ ۱

اردوئے معلیٰ، دہلی، لسانیات نمبر

اردو نامہ، سہ ماہی، مجلس زبان دفتری حکومت پنجاب لاہور، اپریل ۲۰۱۰ء، تا ستمبر ۲۰۱۰ء

افکار کراچی، شمارہ جولائی ۱۹۹۰ء، شمارہ نومبر ۱۹۹۶ء

الماس، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور سندھ، شمارہ ۱۱، شمارہ ۱۵

امکانات، گوجرانوالہ، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۰ء

ایوان اردو، دہلی، انڈیا، فروری ۱۹۹۶ء

تحقیق، سندھ یونیورسٹی جام شورو، شمارہ ۱۶، ۲۰۰۸ء

تخلیقی ادب، شمارہ ۸، نمل یونیورسٹی اسلام آباد

تمثال، سہ ماہی، کراچی، (مدیر سحر انصاری) جلد ۱، شمارہ ۱، ۲، ۳، ۱۹۹۲ء

جرنل آف ریسرچ، شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، شمارہ ۱۸، دسمبر ۲۰۱۰ء

دریافت اسلام آباد، شمارہ ۹، نمل یونیورسٹی اسلام آباد

صحیفہ، لاہور، اپریل ۱۹۶۳ء، شمارہ ۲۳

نقش، کراچی، شمارہ ۹، ۱۹۶۱ء

نگار کراچی، جولائی ۱۹۵۳ء شمارہ: جنوری فروری ۱۹۸۵ء، معلومات نمبر

معیار، انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۱، شمارہ ۲ جولائی دسمبر ۲۰۰۰ء، شمارہ ۶، جولائی، دسمبر ۲۰۱۱ء

نوادر، لاہور، گیارہواں شمارہ، ستمبر ۲۰۰۴ء تا مارچ ۲۰۰۵ء، رشمارہ ۱۳ تا ۱۵، ۲۰۰۵ء

ڈائجسٹ

روحانی ڈائجسٹ، دسمبر ۲۰۰۶ء

مثال پبلشرز کی دیگر مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
مطالعۂ راشد (چند نئے زاویے)	ڈاکٹر فخرالحق نوری	500
ن م راشد کی نظموں کے انگریزی تراجم	ڈاکٹر فخرالحق نوری	700
مکاتیب بنام راشد (چودہ مشاہیر کے ن م راشد کو لکھے گئے نواسی خطوط)	ڈاکٹر فخرالحق نوری	600
وردِ خاک کا نغمہ خواں (ن۔م راشد)	عنبرین منیر	280
تفہیمی تنقید	ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ	300
تحریر اساس تنقید	قاضی افضال حسین (انڈیا)	300
لسانی مطالعے	پروفیسر غازی علم الدین	460
کرشن چندر کے ناول (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)	آنسہ احمد سعید	550
مابعد جدیدیت (فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں)	ڈاکٹر اقبال آفاقی	550
راشد۔ میراجی۔ فیض (نایاب ہیں ہم)	محمد حمید شاہد	700
تنقید اور تاریخیت	اسلم سراج الدین	350
منیر نیازی ـــــ شخص اور شاعر	ڈاکٹر سمیرا اعجاز	700
وزیر آغا کی نظم نگاری	ڈاکٹر محسن عباس	600
اُردو افسانے میں جادوئی حقیقت نگاری	عبدالعزیز ملک	500
گوہرِ ادب [اصنافِ نظم و نثر کا مفصل جائزہ]	صدف نقوی	500
اُردو افسانے میں خیر و شر کا تصوّر	ڈاکٹر راحیلہ بشیر	700
اُردو افسانے کے نظری مباحث	نسیم عباس احمر	350
صورتِ معنیٰ، معنیٔ صورت (مجید امجد کی سوانح اور نظموں کے تنقیدی مطالعے)	ترتیب و تہذیب: جنید امجد	400
مجید امجد شناسی بحوالہ مجلّہ اوراق	ترتیب و تہذیب: ڈاکٹر سیّد عامر سہیل	400

ڈاکٹر اشرف کمال اُردو کے ممتاز شاعر، محقق اور نقاد ہیں۔ انھیں لسانیات سے بھی فطری دلچسپی ہے جس کا مظہر ان کی موجودہ کتاب ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اُردو کے جواں سال سکالر لسانیات اور لسانیات اساس تنقید سے بدکتے ہیں اور کوہِ گراں سمجھ کر اس کے خلاف شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کبھی اسے اذکار رفتہ کہہ کر اور کبھی مشکل قرار دے کر۔ ڈاکٹر اشرف کمال نے اپنی اس کتاب میں نہ صرف اس اسطورہ کو توڑا ہے بلکہ انھوں نے اپنے پیچھے آنے والے سکالرز کو یہ راہ بھی سجھائی ہے کہ بظاہر غیر مانوس نظر آنے والے مباحث پر آسانی کے ساتھ گفتگو کرنا ممکن ہے۔

اس کتاب کے ذریعے ہمارے تنقیدی محاورے میں ایک نیا پن پیدا ہوگا اور نئے مباحث بند اذہان کو کھولنے کی کوشش کریں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر قاضی عابد
ڈائریکٹر سرائیکی ایریا سٹڈی سنٹر
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

دیگر تصانیف

۱۔ پھول راستے (شعری مجموعہ) امتیاز فیاض پریس لاہور ۱۹۹۲ء

۲۔ دھوپ کا شہر (شعری مجموعہ) مکتبہ ابلاغ، لاہور ۱۹۹۵ء

۳۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کی مطبوعات۔ توضیحی کتابیات، ۲۰۰۶ء
انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

۴۔ تجھے دیکھا ہے جب سے (شعری مجموعہ) دعا پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۷ء

۵۔ اردو ادب کے عصری رجحانات کے فروغ میں مجلّہ "افکار" کراچی کا کردار، ۲۰۰۸ء
انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

۶۔ لسانیات، زبان اور رسم الخط، مثال پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۰۹ء، ۲۰۱۲ء

۷۔ کوئی تیرے جیسا نہیں، (شعری مجموعہ)، مثال پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۱۰ء

۸۔ اشاریہ اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۱۰ء

۹۔ حافظ محمود شیرانی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۱۱ء

۱۰۔ پنجابی زبان۔ گورمکھی رسم الخط اور بنیادی معلومات، ۲۰۱۱ء
شعبہ اردو: جی سی یونیورسٹی فیصل آباد
(بہ اشتراک اخلاق حیدر آبادی، وقار اصغر پیرزادہ)

۱۱۔ خوابوں سے بھری آنکھیں (شعری مجموعہ)، شمع بک سٹال، فیصل آباد ۲۰۱۴ء

۱۲۔ اشاریہ اور فن اشاریہ سازی، ادارۂ یادگار غالب مارچ ۲۰۱۵ء

۱۳۔ تاریخ اصناف نظم ونثر، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۱۵ء

۱۴۔ لسانیات اور زبان کی تشکیل، مثال پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۱۵ء

misaalpb@gmail.com
Ph:+92-41-2643841, Cell:0300-6668284

ISBN: 978-969-581-249-5